سوانح
حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ
عہد حاضر کی مشہور دینی شخصیت اور عارف باللہ
حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے حالاتِ زندگی
معرفت وسلوک کا ایمان افروز اور دل آویز تذکرہ
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
مجلس نشریاتِ اسلام
۱۔کے۔۳۔ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱
کراچی ۷۴۶۰۰

فہرست مضامین

مقدمہ

★ ——— مولانا محمد منظور نعمانی

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے کشکول "تفہیمات آلہیہ" کی پہلی ہی تفہیم میں ہے:۔

"انبیاء علیہم السلام جن چیزوں کی اہمیت اور خصوصیت سے دعوت دیتے ہیں وہ بنیادی طور پر تین ہی چیزیں ہیں۔

ایک مبدأ و معاد وغیرہ سے متعلق عقائد کی تصحیح ـــ اس شعبہ کو علماء عقائد و اصول نے سنبھال لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو مشکور فرمائے اور جزائے خیر دے۔

دوسرے عبادات و معاملات اور معاشرت وغیرہ انسانی اعمال کی صحیح صورتوں کی تعلیم اور حلال و حرام کا بیان ـــ اس شعبہ کی کفالت فقہائے اُمت نے اپنے ذمہ لی ہے اور اس میں انھوں نے امت کی پوری رہنمائی اور رہبری کی ہے۔

تیسرے اخلاص و احسان (یعنی ہر عمل خالص لوجہ اللہ اور اس دھیان کے ساتھ کرنا کہ میرا مالک مجھے اور میرے عمل کو دیکھ رہا ہے ــــــ اور یہ تیسری چیز دین و شریعت کے مقاصد میں سب سے زیادہ دقیق اور عمیق ہے اور پورے نظام دینی میں اس کی حیثیت وہ ہے جو جسم میں روح کی، اور الفاظ کے مقابلہ میں معنی کی ــــــ اور اس شعبہ کی ذمہ داری صوفیائے کرام رضوان اللہ علیہم نے لے لی ہے وہ خود راہ یاب ہیں اور دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں، خود سیراب ہیں اور دوسروں کو سیراب کرتے ہیں، وہ بڑے بانصیب اور انتہائی سعادت مند ہیں۔"

(تفہیمات آلہیہ صـ۱۲-۱۳ ملخصاً)

اللہ تعالےٰ نے اپنے جن بندوں کو دینی فہم اور کتاب و سنت کے علم کا کوئی حصّہ عطا فرمایا ہے وہ یقیناً محسوس کریں گے کہ چند سطروں کی اس مختصر سی عبارت میں شاہ صاحبؒ نے انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور ان کے لائے ہوئے نظام دینی کا نہایت جامع خلاصہ پیش کر دیا ہے اور آخر میں تصوف اور صوفیاء کے بارے میں جو فرمایا ہے اس سے تصوف کی حقیقت و غایت اور صوفیاء کرام کا کام و مقام پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ تصوف ــــــ جیسا کہ شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہے ــــــ دین و شریعت کی روح اور اس کا جوہر ہے اور صوفیائے کرام ہی اس دولت کے حامل و امین ہیں اور جس طرح جسم کبھی روح سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، اسی طرح امت مسلمہ اپنے دینی وجود میں کبھی تصوف اور صوفیائے ربانی سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

امت کو جس طرح ہر دور میں ان علماء اور فقہاء کی ضرورت ہے جو فاسد عقائد اور گمراہانہ خیالات سے امت کی حفاظت کرتے ہوئے عقائد حقہ کی تعلیم دیتے رہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں عبادات

معاملات، معاشرت وغیرہ کے متعلق اللہ و رسول کے احکام امت کو بتاتے اور حلال و حرام کے بارے میں انکی رہنمائی کرتے رہیں اسی طرح امت کی یہ بھی ایک دائمی ضرورت ہے کہ اس میں ایسے اصحابِ ارشاد ربانیین پیدا ہوتے رہیں جن کی فکر و توجہ کا خاص نشانہ اور موضوع قلوب کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ ربط و تعلق ہو جس کو کتاب و سنت کی زبان میں اخلاص و احسان کہا جاتا ہے ـــــ

اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کا جو تکوینی انتظام فرمایا ہے اس میں کتاب و سنت کی علمی و کتابی حفاظت کے ساتھ امت میں ایسے علماء، فقہاء، اور صوفیائے ربانیین کا مسلسل وجود بھی شامل ہے اور امت کی گذشتہ ساڑھے تیرہ سو سال کی دینی تاریخ کی شکل میں وہ ہمارے سامنے موجود بھی ہے اور یہ محفوظ تاریخ بھی اس خداوندی انتظام کے سلسلہ کی ایک مستقل کڑی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور اس کی صفت رحمت و ربوبیت نے جب ہمارے اس دور میں بھی (جو بلاشبہ الحاد و مادیت اور خدا فراموشی کا دَور ہے) دین کو زندہ و محفوظ رکھنے کا فیصلہ فرمایا تو اس کے حامل و محافظ بھی پیدا فرمائے۔ آج کے بحرِ ظلمات میں علماءِ حق اور صوفیاءِ ربانیین کا وجود ـــــ خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو ـــــ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت کے اسی فیصلہ کا نتیجہ ہے اور یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ جب تک دین کو اس دنیا میں زندہ باقی رکھنا چاہے گا اس کے خاص حاملین و محافظین بھی پیدا ہوتے رہیں گے۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے ہمارے اس دور کے ایک صاحبِ ارشاد ربانی شیخ مرشدنا حضرت شاہ عبد القادر رائپوری قدس سرہ کا تذکرہ ہے، حضرتؒ کے حالات اور سوانح تو انشاء اللہ آپ اصل کتاب میں پڑھیں گے، یہ ناچیز جس کو مقدمہ لکھنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے، اصل کتاب سے پہلے حضرت کی شخصیت کے اجمالی تعارف کیلئے اپنے

چند تجربات اور احساسات و تأثرات حضرتؒ کے بارہ میں عرض کردینا مناسب سمجھتا ہے امید ہے کہ جو ناظرین صاحب سوانح قدس سرہ کی شخصیت سے پہلے سے واقف نہیں ہیں، وہ راقم سطور کے یہ احساسات پڑھ کر کتاب کی اہمیت کو زیادہ محسوس کریں گے، پھر انشاء اللہ کتاب کا مطالعہ ان کے لئے زیادہ فائدہ مند ہوگا۔

سب سے پہلے وہی تجربہ اور واقعہ ذکر کرتا ہوں جو خود میری زندگی میں موڑ کا سبب بنا اور جس کے نتیجہ میں حضرتؒ سے اور اس سلسلہ سے وابستگی نصیب ہوئی۔

اس عاجز کی زندگی میں ایک مختصر سا عرصہ ایسا بھی گزرا ہے جب دل میں تصوف اور اہل تصوف کے بارہ میں کچھ اسی قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے جو ہمارے اس زمانہ کے بہت سے لکھے پڑھوں میں پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ فضل رہا کہ اس سلسلہ کے جن اکابر اور صاحب ارشاد مشائخ سے میں واقف تھا (اپنے خیال میں ان کو ایک علمی اور اجتہادی غلطی میں مبتلا سمجھنے کے باوجود) دل سے ان کا ادب کرتا تھا اور ان کو اپنے جیسوں سے ہزاروں درجہ بہتر اللہ کا مخلص و مقبول بندہ جانتا تھا ـــــ اپنے اسی حال اور اسی دور میں ۱۹۴۲ء میں، میں سخت بیمار پڑا، پھر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور صحت ہو گئی، لیکن اس بیماری کا پیدا کیا ہوا غیر معمولی ضعف بہت دنوں تک باقی رہا، میرے معالجین نے مجھے مشورہ دیا کہ کچھ دن میں کسی ایسی جگہ قیام کروں جہاں کی آب و ہوا بھی صحت بخش ہو اور مجھے زیادہ سے زیادہ آرام اور سکون مل سکتا ہو ـــــ میں دو تین سال پہلے (۱۹۳۹ء میں) رائے پور کی خانقاہ ایک دفعہ دیکھ چکا تھا (اس حاضری کا ذکر انشاء اللہ آگے آئے گا) مجھے یہ جگہ سکون اور آب و ہوا کے لحاظ سے بہت پسند آئی تھی، اس وقت صرف ایک دن اور دو رات قیام رہا تھا اور اگرچہ خانقاہی مشاغل سے اپنی طبیعت کو

اس وقت بھی کوئی خاص مناسبت نہیں تھی، لیکن صاحب خانقاہ (قدس سرہٗ) کی عنایت و شفقت اور مزاجی و فکری مناسبت نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔۔۔ معالجین کے مشورہ کے مطابق جب میں نے کہیں جانے کے بارہ میں سوچا تو رائے پور کی خانقاہ ہی کا فیصلہ کیا اور چلا گیا، وہاں پہنچ کر مخصوص خانقاہی مشاغل دیکھ دیکھ کے دل میں اعتراضات اور سوالات ابھرنے شروع ہوئے، پہلے ان کو دبا کر خاموش رہنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور موقع پا کر حضرت ممدوح کی خدمت میں عرض کر دیا، یقین تھا کہ حضرت میرے سوالات، و اشکالات کا جواب دیکر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش ضرور فرمائیں گے، (مجھے یہ بات اس وقت بھی معلوم تھی کہ حضرت صرف صاحب خانقاہ درویش اور عارف ہی نہیں ہیں بلکہ عالم فاضل بھی ہیں اور ایک مدت تک درس تدریس کا مشغلہ بھی رہا ہے) لیکن حضرت نے ایک لفظ بھی اس سلسلہ میں نہیں فرمایا بلکہ اس کے برعکس اعتراف وانکسار اور پسپائی وخود شکنی کا ایسا رویہ اختیار فرمایا کہ اگر اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہو تو میں اس جاہلانہ زعم میں مبتلا ہو سکتا تھا کہ حضرت بھی میرے اشکالات کا جواب نہ دے سکے۔۔۔ میں نے دو تین نشستوں میں دو دفعہ حضرتؒ کے سامنے اپنے اشکالات عرض کئے اور حضرتؒ نے دونوں دفعہ یہی رویہ اختیار فرمایا اور جواب اور دفاع میں ایک لفظ بھی نہیں فرمایا، میرے لئے حضرت کا یہ رویہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ میں اس کی وجہ سوچنے پر مجبور ہو گیا جب میں نے اس بارہ میں غور کیا اور خود اپنے باطن کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ میری اس گفتگو کا محرک مخلصانہ طلب نہیں ہے بلکہ میری حیثیت ایک "مدعی" اور "معترض" کی ہے اور یہ حضرت کی بلند مقامی ہے کہ بجائے یہ فرمانے کے کہ معترضوں اور مدعیوں کو جواب دینا ہمارا طریقہ نہیں ہے "خود شکنی اور پسپائی کا طریقہ اختیار فرمائے ہیں۔۔۔ اس کے بعد حق کے ایک طالب اور جویا کی حیثیت سے میں نے خود بھی

.....اشکالات پر غور کرنا شروع کیا اور اپنی نیت درست کر کے حضرتؒ سے پھر ایک صحبت میں عرض کیا۔ اس دفعہ حضرتؒ نے وہ رویہ اختیار نہیں فرمایا بلکہ تصوف کے مقصد اور مشاغل و وسائل اذکار و اشغال وغیرہ کا تجزیہ فرما کر ایسی محققانہ تقریر فرمائی جس سے اپنے اشکالات و سوالات کی غلطی کی بنیاد خود مجھ پر منکشف ہو گئی اور معلوم ہوا کہ سارے اشکالات ہی نافہمی اور کم عقلی سے پیدا ہو رہے تھے ــــــ اب جس کا جی چاہے اس کو حضرت کی حکمت اور فن اصلاح کا کمال سمجھے اور جس کا جی چاہے باطنی تصرف سے اسکی توجیہ کرے ــــ بہر حال وہی دن میری زندگی کے موڑ کا دن تھا ــــ جزاک اللہ کہ چشم باز کردی۔

۱۹۴۲ء کی اس حاضری کے بعد قریباً بیس سال تک حضرت کی خدمت میں حاضری نصیب ہوتی رہی۔ ہم نے جو باتیں خاص طور پر حضرت میں محسوس کیں اور جن سے ہم زیادہ تر متأثر ہوئے ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ حضرت کی زندگی میں ہم نے تصوف کے مقصد اور اس کے مغز کو دیکھا حضرت کے ہاں ساری فکر اور سارا اہتمام اس مغز اور مقصد ہی کا تھا رسوم تصوف کے نہ خود پابند تھے نہ دوسروں سے پابندی چاہتے تھے ــــ نسبت اور تعلق مع اللہ کے حصول کیلئے بقدر امکان یکسوئی کے ساتھ کثرت ذکر و فکر پر تو عموماً زور دیتے تھے اور اس کو گویا اس دروازہ کی کنجی سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ زمانہ کے تغیرات، لوگوں کے حالات اور مختلف طبائع کا لحاظ رکھتے ہوئے بالکل مجتہدانہ رہنمائی فرماتے تھے، بہت سوں کیلئے ایک شغل تجویز فرماتے اور بعض دوسروں کو باوجود درخواست کے اس سے منع فرما دیتے تھے مسترشدین اور متوسلین میں سے جو افراد دین و ملت کی کسی خدمت میں لگے ہوتے آپ ذکر کے ساتھ اس خدمت ہی کو ان کا خاص شغل اور وظیفہ قرار دیدیتے اور فرماتے کہ بس اخلاص نیت کا اہتمام کرو، یہی وہ اکسیر ہے جو ہر عمل کو عبادت و قربت اور وصول الی اللہ کا وسیلہ بنا دیتی ہے

مصنفین سے فرماتے کہ جب لکھنے کیلئے بیٹھو تو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر نیت کی تصحیح اور اللہ تعالیٰ سے صواب و سداد کی دعا کر لیا کرو، مدرسین سے فرماتے کہ درس شروع کرو تو نیت کی درستی کا اہتمام کر لیا کرو، واعظین اور مقررین سے فرماتے کہ جب وعظ و تقریر کا موقع آئے تو اللہ کی رضا اور دین و ملت کی خدمت کی نیت کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنے اور دوسروں کے لئے دینی نفع کی اور ہر قسم کے زیغ و ضلال سے حفاظت کی دعا کر لیا کرو، کسانوں، محنت کشوں اور نوکری پیشہ لوگوں سے فرماتے کہ اپنے اور بال بچوں کیلئے حلال روزی کی نیت سے تمہارا محنت کرنا اور کھیتوں میں ہل چلانا بہت سوں کے نوافل سے افضل ہے، ظاہر ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں ایسے ہی متوسع اور صاحب اجتہاد مشائخ، تصوف کی صحیح نمائندگی اور خدمت کر سکتے ہیں، حضرت کی اسی خصوصیت نے تعلق اور فیض کے دائرہ کو بہت وسیع کیا اور اسی وجہ سے امت کے مختلف طبقات کی بہت بڑی تعداد آپ سے دینی نفع اٹھا سکی۔

حضرت کی ایک دوسری خصوصیت جس نے اس عاجز کو بہت متاثر کیا اور جس کا بیس سال مسلسل تجربہ ہوتا رہا، یہ تھی کہ دنیا کے جھمیلوں سے بالکل بے تعلق اور ایک خانقاہ نشین درویش ہونے کے باوجود دنیوی معاملات کو بھی آپ اتنا بہتر سمجھتے تھے اور اپنے خدام و محبین کے اس قسم کے معاملات میں ان کی طلب پر ایسا صحیح و صائب مشورہ دیتے تھے کہ ان امور کے کسی اچھے سے اچھے تجربہ کار اور دانشمند سے بھی اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جا سکتی، اسی طرح قومی و سیاسی تحریکات اور ملکی معاملات سے بظاہر بالکل بے تعلق ہونے کے باوجود ان کے بارہ میں ایسی متوازن صحیح اور صائب رائے رکھتے تھے جس سے وہ عمائد اور زعمائے قوم بھی رہنمائی حاصل کریں جن کی عمریں انھیں میدانوں میں گزری ہیں ــــ لیکن خدام و متوسلین کو بالکل آزادی تھی کہ اس دائرہ میں ان کی جو رائے ہو وہ اس پر قائم رہیں

اور عمل کریں، اسی لئے اس میدان میں حضرت کے خاص خدام و متوسلین کے خیالات میں بعض اوقات باہم سخت اختلاف اور تضاد بھی ہو جاتا اور بعض خدام کی رائے اور کبھی کبھی عملی سرگرمیاں بھی خود حضرت کے رجحان کے خلاف ہوتیں لیکن اس کی وجہ سے حضرت کی شفقت اور قلبی تعلق میں ذرہ برابر فرق نہ آتا ـــــ یہ عاجز اس بارہ میں جتنا غور کرتا ہے اس کو حضرتؒ کی غیر معمولی کرامت سمجھتا ہے، ہم جیسے عام انسانوں کیلئے یہ بات بالکل ناممکن سی ہے۔

اسی طرح ایک خصوصیت اور جامعیت اللہ تعالیٰ نے حضرت کو یہ عطا فرمائی تھی کہ ایک طرف تو توکل(۱) اور تبتل کا وہ اعلیٰ مقام حاصل تھا جس سے ارفع مقام کم از کم اپنی آنکھوں نے نہیں دیکھا اور قرآنی وعدہ کے مطابق اس کے نتیجہ میں "لَا یَحْتَسِبُ" نعمتوں کی موسلا دھار بارش بھی جنگل کی اس خانقاہ پہ دن رات برستی تھی، لیکن اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے مقرر کئے ہوئے سلسلۂ اسباب اور انسانی تدبیر و کوشش کے قدرتی نظام کی اہمیت پر بھی بیحد زور دیتے تھے اور زندگی کے کاروبار میں ترک تدبیر اور تعطیل اسباب کے آپ سخت مخالف تھے ـــــ ۱۳۶۹ھ (۱۹۵۰ء) میں آپ نے آخری حج فرمایا۔ اس حج کے احوال و واردات کا ذکر کرتے ہوئے بار بار آپنے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ "میں دیکھتا تھا کہ اللہ کے بندے بیت اللہ سے چمٹ چمٹ کے اور اس کا غلاف ہاتھوں میں پکڑ پکڑ کے اور خوب رُو رو کے ان باتوں کی دعائیں کرتے تھے جن کیلئے وہ اس عالم اسباب میں امکانی کوششیں بھی نہیں کرتے، ان کا یہ حال دیکھ کر میرے دل سے فوارہ کی طرح یہ بات نکلتی تھی کہ تمہاری ان دعاؤں سے بلا پٹرول اور ڈرائیور کے ایک موٹر تو چل ہی نہیں سکتی ساری دنیا الٹ پلٹ کیسے ہو جائے گی" ـــــ اپنے اسی مزاج اور اصول کی بنا پر اپنی ذات کے بارہ میں بھی دوا علاج اور پرہیز کا پورا اہتمام فرماتے اور دوسروں

(۱) توکل "صرف اللہ پر اعتماد اور بھروسہ ـــــ اور تبتل "سب سے کٹ کے صرف اللہ سے وابستگی۔

کو بھی اسی طرز عمل کی ہدایت اور تاکید فرماتے، لیکن قلب اس یقین سے معمور اور مطمئن رہتا کہ کارساز اور موثر صرف اللہ تعالےٰ کا حکم ہے، مگر اشیاء میں خاصیتیں بھی اللہ تعالےٰ ہی نے رکھی ہیں۔ اور اسی نے تدبیر اور اسباب کے استعمال کا بندوں کو حکم دیا ہے ـــــ یہ واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ اور محققین امت کا توکل ہمیشہ سے یہی رہا ہے، اسباب ہی کو سب کچھ سمجھنا اور ان ہی پر نگاہ رکھنا جیسا کہ آج ہمارا عام حال ہے مقام ایمان کے منافی ہے اور انکی اسبابی حیثیت کا انکار بھی سنگین غلطی ہے، اعتدال کی راہ ہی صراط مستقیم ہے۔

اللہ کے مقبول بندوں کے اَلوان مختلف ہوتے ہیں۔ ع :۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است، کسی پر حُزن و شکستگی کا غلبہ ہوتا ہے کسی پر احساس نعمت اور انبساط کا، کسی پر جلال کے آثار زیادہ ہوتے ہیں کسی پر جمال کے، کسی پر کسی حال کا غلبہ ہوتا ہے کسی پر کسی دوسری کیفیت کا، مرشدنا حضرت رائپوری قدس سرہٗ پر ـــــ جہاں تک اس بے بصر اور بے بصیرت کا اندازہ ہے ـــــ "فنائیت" اور "اَنا" کی نفی کا غلبہ تھا، انہی آنکھوں نے اس باب میں جو حال حضرت کا دیکھا اس سے آگے کے درجہ اور مقام کے تصور سے بھی کم از کم اس ناچیز کا ذہن تو عاجز ہے. بارہا اس کا اظہار فرمایا کہ ہر آنے والے کو میں اس خیال سے بیعت کر لیتا ہوں کہ شاید یہی اللہ کا بندہ میری مغفرت کا ذریعہ بن جائے ـــــ بہٹ ہاؤس (سہارنپور) کے آخری قیام کے زمانہ میں میرے ایک عزیز مولوی تحسین احمد سنبھلی جو حضرتؒ سے بیعت تھے سنبھل سے حاضر خدمت ہوئے اور انھوں نے اپنے والد ماجد (ایک رشتہ کے میرے بڑے بھائی منشی بشیر احمد صاحب) کا یہ پیغام مجھے پہنچایا کہ بینائی سے محرومی کے باعث میں خود سہارنپور حضرت کی خدمت میں حاضری سے معذور ہوں، تم حضرت کی خدمت میں میری معذوری کا حال عرض کر کے درخواست کرو کہ میری بیعت غائبانہ قبول فرما کر مجھے بھی حضرت اپنے خدام میں شامل فرمالیں ـــــ میں نے ایک مناسب وقت پا کر حضرت

کی خدمت میں ان کا یہ حال عرض کیا کہ وہ محکمہ تعلیم میں ملازم ایک مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اللہ کی توفیق سے اس زمانہ میں بھی بہت دیندار اور خوش اوقات تھے، ایک رات اچانک بغیر کسی خاص تکلیف کے ان کی بینائی چلی گئی اور صبح معلوم ہوا کہ کالا پانی اتر آیا ہے جو لاعلاج سمجھا جاتا ہے، جب لکھنؤ سے سنبھل میرا جانا ہوا، اور میں عیادت وتعزیت کی نیت سے انکے پاس گیا تو دیکھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر دل سے راضی ہیں بلکہ انکو ایک درجہ میں اسکی خوشی ہے کہ اب میرے مالک نے مجھے ایسا کر دیا کہ ہر طرف سے یکسو ہو کے بس اسی میں مشغول رہوں۔ پھر انکے جو قابل رشک دینی حالات اور معمولات میرے علم میں تھے وہ بھی میں نے حضرتؒ سے ذکر کئے اور آخر میں عرض کیا کہ نابینائی کی مجبوری کی وجہ سے چونکہ حاضری سے معذور ہیں اس لئے حضرتؒ سے غائبانہ بیعت کی درخواست کرتے ہیں ــــ حضرتؒ پر ان کا حال سن کر رقت طاری ہو گئی اور گلوگیر آواز میں فرمایا "ان کا درجہ بہت اونچا ہے، اللہ کے ایسے بندوں کو بیعت کرنے سے شرم آتی ہے، انھیں اسکی ضرورت بھی نہیں، آپ یہی جواب انکو لکھدیں" ــــ حضرتؒ نے اسوقت یہ بات کچھ اس طرح فرمائی کہ میں اسکے بعد کچھ عرض نہیں کرسکا اور خاموش ہو گیا ــــ چند منٹ کے بعد حضرتؒ نے خود مجھے طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ کے بہت ہی اچھے بندے ہیں، شاید انہی کا تعلق میری مغفرت کا ذریعہ ہو جائے آپ انھیں لکھدیں کہ میں نے انکا تعلق قبول کیا

الحمدللہ ہمیں حضرتؒ کے کشف وکرامات کا بھی بار بار تجربہ ہوا، لیکن بخدا ہزاروں کھلی کرامتیں اس نعمت عظمیٰ "فنائیت" اور "انا" کی نفی کے برابر نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کے قلب باطن کو جاہ کے جذبہ سے بالکل ہی پاک کر دیا تھا ــــ وہی جاہ جس کے متعلق ائمہ معرفت کا ارشاد ہے کہ "آخر ما یخرج من قلوب الصدیقین حب الجاہ" (یعنی طالبین وسالکین ہی نہیں بلکہ صدیقین کے قلوب سے جو روحانی بیماری سب سے آخر میں نکلتی ہے وہ حُبِ جاہ کا جذبہ ہے)

حضرتؒ کے اوصاف وکمالات اور سوانح حیات آپ اصل کتاب میں پڑھیں گے اپنے یہ چند احساسات تو راقم سطور نے جیسا کہ عرض کیا صرف اس لئے یہاں ذکر کئے کہ جو ناظرین حضرت اقدس سرہٗ کی شخصیت سے پہلے سے بالکل واقف نہیں ہیں وہ بھی حضرتؒ کے بارہ میں مقدمہ سے اتنا جان لیں جس سے وہ کتاب کی اہمیت کو سمجھ سکیں اور پھر اس کے مطالعہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔

اب مجھے درمیان سے ہٹ کر ناظرین کو جلدی موقع دینا چاہیئے کہ وہ اصل کتاب کا مطالعہ کریں لیکن محترم ناظرین سے میں اتنی اجازت اور چاہوں گا کہ مصنفِ کتاب رفیق محترم مولانا علی ندوی صاحب سوانح مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کے تعلق کے بارہ میں بھی ان کو کچھ بتا دوں، مقدمہ نگار کی حیثیت سے یہ میرا فریضہ ہے اور چونکہ اس تعلق میں شروع سے آخر تک میری اور مولانا علی کی رفاقت رہی ہے بلکہ ایک طرح سے میں ہی انکے اس تعلق کا ذریعہ بنا ہوں، اس لئے اس کی تاریخ غالباً میں ہی سب سے زیادہ جانتا ہوں۔

۲۴-۲۵ سال پہلے کی بات ہے ۱۹۳۹ء کا غالباً دسمبر کا مہینہ تھا کہ ایک نیم سیاسی اور نیم دینی مقصد کیلئے تین ہم خیال دوستوں نے ایک سفر شروع کیا، دو تو ہم دونوں ہی تھے یعنی مولانا علی اور راقم سطور اور تیسرے رفیق ہمارے دوست حاجی عبدالواحد صاحب (ایم اے) تھے اس سفر ہی میں ہم تینوں پہلی مرتبہ رائے پور کی خانقاہ میں حاضر ہوئے ہیں اگرچہ رائپور پہلی دفعہ اس سفر ہی میں حاضر ہوا تھا لیکن اپنے بعض سفروں میں حضرت قدس سرہ کی زیارت بعض دوسرے مقامات پر اس سے پہلے بھی کر چکا تھا اور اپنے محترم اور عنایت فرما مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی مرحوم سے حضرتؒ کے بارہ میں بہت کچھ سنے ہوئے تھا، اس لئے حضرتؒ سے اچھی خاصی واقفیت اور عقیدت تھی اور چونکہ "الفرقان" شروع ہی سے حضرتؒ کی خدمت میں جاتا تھا اور حضرت اس کو دلچسپی سے ملاحظہ فرماتے تھے اس لئے حضرت بھی اس عاجز سے کچھ واقف تھے، لیکن ہمارے ان دونوں رفیقوں

کی حضرتؒ کی خدمت میں بھی یہ پہلی ہی حاضری تھی اور یہ حضرتؒ سے واقف بھی نہیں تھے اسلئے اس سفر کے پروگرام میں رائپور میری ہی تحریک سے شامل کیا گیا تھا۔

ہمارے اس چھوٹے سے سہ نفری قافلہ کا قیام رائے پور کی خانقاہ میں صرف دو راتیں اور ایک دن رہا، اس تھوڑے سے وقت میں ہم نے حضرت کو جو کچھ جانا اور سمجھا (جو دراصل بہت ہی ناقص جاننا تھا) اس سے ہم تینوں کے دل میں حضرت کی محبت کا بیج پڑ گیا، جو حسب استعداد نشوونما پاتا رہا، یہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ ہم نے یہ سفر ایک نیم سیاسی نیم دینی مقصد سے کیا تھا، اس سفر کا کوئی تعلق اس مقصد سے نہیں تھا جس کیلئے عام طور پر خانقاہوں میں اور صاحب ارشاد مشائخ کی خدمت میں اللہ کے بندے حاضر ہوتے ہیں ـــــ لیکن بالآخر اسی سفر کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ ہم تینوں نے الگ الگ اپنے اپنے مقدر وقت پر حضرت ہی کی حلقہ بگوشی کا فیصلہ کیا ـــــ اَللّٰهُ لَطِيفٌۢ بِعِبَادِهٖ۔

اس کے بعد میں اس حقیقت اور واقعہ کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگرچہ یہ ناچیز ہی مولانا علی کے رائے پور جانے اور حضرت سے تعلق قائم ہونے کا اول ذریعہ بنا اور حضرتؒ سے بیعت کا شرف بھی پہلے ناچیز ہی کو حاصل ہوا، لیکن موصوف کی ان کی خداداد صفات اور خصوصیات کی وجہ سے جن کی اللہ کے ہاں اور اس کے مقبول بندوں کے ہاں بھی زیادہ قدر و قیمت ہے حضرتؒ کے ہاں محبوبیت کا جو مقام ان کو حاصل ہوا وہ اس ناچیز کے لئے موجب مسرت ہونے کے باوجود ہمیشہ رشک و غبطہ کا باعث بھی بنا رہا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ مولانا علی کی اس محبوبیت میں ان کی جن خصوصیات کو دخل تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اللہ کے مقبول بندوں کی سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی ان کا خاص محبوب شغل ہے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اسکی خاص صلاحیت بخشی ہے سب سے پہلے انھوں نے اپنی بالکل نوعمری میں "سیرت سید احمد شہیدؒ" لکھی جس نے اب سے پچیسؔ سال

پہلے جب اس برصغیر میں وہ سیاسی انقلاب شروع ہو رہا تھا جو ۱۹۴۷ء میں مکمل ہوا، یہاں کے مسلمانوں
پر ایک خاص اثر ڈالا ـــــ اسکے بعد انھوں نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح لکھی،
پھر "تاریخ دعوت و عزیمت" کا سلسلہ شروع کیا جو اُمت کی پوری تاریخ کے خاص اصحاب دعوت و
عزیمت مجددین و مصلحین کا یقین آفریں اور حیات بخش تذکرہ ہے، اسکی تین جلدیں چھپ کر شائع
بھی ہو چکی ہیں، اس درمیان میں انھوں نے حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ
کا تذکرہ بھی لکھا ـــــ حضرت قدس سرہٗ کو مولانا علی کی ان سوانحی تصانیف کا اتنا اشتیاق رہتا
تھا کہ دعوت و عزیمت کے کچھ حصے اور حضرت گنج مرادآبادیؒ کا تذکرہ حضرتؒ نے چھپنے سے بھی
پہلے مسودہ ہی منگوا کر سنا، دعوت و عزیمت کی تیسری جلد (جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ،
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہم کے
تذکرہ پر مشتمل ہے اور حضرتؒ کے وصال کے بعد اسی سال چھپی ہے) حضرتؒ کی حیات میں اسکی
تصنیف بھی مکمل نہیں ہوئی تھی، اس کا جس قدر حصہ لکھا جا چکا تھا حضرتؒ نے تقاضا فرما کر وہی
منگوا کر سنا اور مولانا علی کو تاکید فرمائی کہ وہ اس سلسلہ کو جلد ہی پورا کرنے کی کوشش کریں ـــــ
الغرض حضرت کے ہاں مولانا علی کی محبوبیت میں ان کی سوانح نگاری کو بھی خاص دخل تھا اور حضرتؒ
کو ان کی ان کتابوں کے سننے سے بڑی روحانی مسرت ہوتی تھی اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔

دراصل بزرگوں اور دینی شخصیتوں کی سیرت نگاری مولانا علی کی آبائی اور موروثی سعادت
ہے، ان کے دادا (مولانا حکیم سید فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فارسی کے ایک جلیل القدر مؤرخ
اور دبیر تھے جن کے رواں قلم کی یادگار "مہر جہانتاب" (قلمی) (فارسی) (انسائیکلوپیڈیا جس کی
صرف پہلی جلد فلسکیپ سائز کے تیرہ ۱۳ سو صفحات پر تمام ہوئی ہے) اور "سیرۃ السادات" اور "تذکرۂ
علیہ" جیسی کتابیں ہیں، اور ان کے والد بزرگوار مولانا سید عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندستان

کے ابن خلکان اور ابن الندیم تھے جو "نزہۃ الخواطر" جیسی عظیم کتاب کے مصنف ہیں جو ہندستان کے مشاہیر اعیان علماء و مشائخ و اہلِ علم و مصنفین کا آٹھ جلدوں میں مبسوط تذکرہ ہے اس کی سات جلدیں دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہو چکی ہیں[1] ـــــ مولانا علی کی سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی میں اس نسلی اور موروثی ذوق و مناسبت کے ساتھ کچھ عناصر اور بھی شامل ہو گئے ہیں، جن میں سے بعض کا تعلق علم و مطالعہ سے ہے اور بعض کا روح و قلب کی کیفیات سے۔

بہر حال اس خصوصیت کی بنا پر ان کا قدرتی حق تھا اور حضرت قدس سرہٗ کے حلقۂ عقیدت اور پوری ملت کا ان پر حق تھا کہ وہ اپنے روحانی مربی اور مرشد قدس سرہٗ کی سوانح لکھیں ـــــ گزشتہ سال ربیع الاول میں جب حضرت کا لاہور میں وصال ہوا تو مولانا علی وہیں تھے، قدرتی طور پر اس وقت سوانح کا مسئلہ بھی اٹھا اور انھوں نے ذمہ داری لے لی، لیکن بڑا اشکال یہ تھا کہ حضرت قدس سرہٗ کے ہاں احوال کا اتنا اخفا اور نفی اور فنائیت کا اتنا غلبہ تھا کہ اپنے متعلق کچھ فرمانے کی عادت ہی نہ تھی، اس لئے خطرہ تھا کہ شاید بہت سی وہ باتیں اور بہت سے وہ احوال کسی ذریعہ سے بھی معلوم نہ ہو سکیں گے جن کے بغیر اللہ کے کسی مقبول اور صاحب ارشاد بندہ کی سوانح مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مصنف کی طرف سے سیرت کا اعلان ہوتے ہی حضرت کے خواص، متعلقین اور متوسلین نے حضرت کے بارہ میں اپنے جو متفرق معلومات لکھ کر بھیجے ان کے سامنے آنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایسے مخلص بندوں کے احوال کی حفاظت کے خاص انتظامات فرماتا ہے ـــــ ان سب حضرات کو اللہ تعالیٰ بہتر سے بہتر جزا دے جنھوں نے اس سوانح کے مواد فراہم کرنے میں مؤلف کی مدد کی، اگر ان کو یہ تعاون حاصل

[1] آٹھویں جلد جو معاصرین کے خیالات پر مشتمل ہے زیر طبع ہے، پاکستان کے محکمۂ اوقاف نے کتاب کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

نہ ہوتا تو سوانح کسی طرح مکمل نہ ہو سکتی، ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے کہ پوری کتاب کے خواص متوسلین و متعلقین کے بھیجے ہوئے مواد ہی سے مرتب ہوئی ہے۔

سب سے بڑی مدد اور رہنمائی اس سوانح کی تیاری میں مؤلف کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ سے حاصل ہوئی، حضرت قدس سرہ کے بہت سے احوال و کوائف کے علاوہ اہم واقعات کی تاریخیں حضرت ممدوح ہی سے حاصل ہو سکیں، نیز مسودہ کی تکمیل کے بعد حضرت شیخ نے اس کو حرفاً حرفاً سنا اور جا بجا مشورے دیئے جن کی بنا پر مسودہ میں آخری اصلاح اور ترمیم ہوئی آٹھویں باب میں حضرت کے سیاسی رجحان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے ذیل میں تقسیم ہند کے بارے میں حضرت کی رائے کا بھی ذکر آیا ہے۔ بلاشبہ یہ بڑا ہی نازک مسئلہ تھا اور مصالح کے تقاضے متضاد تھے لیکن دیانت کا تقاضا تھا کہ جو کچھ معلوم ہے کسی مصلحت کی رعایت کے بغیر بلا کم و کاست اسکو کاغذ کی امانت بنا دیا جائے۔ اس لئے یہی کیا گیا اور اس کی بھی پوری کوشش کی گئی کہ مصنف کی اپنی رائے اور اپنے ذوق کا بھی کوئی سایہ اس پر نہ پڑنے پائے۔

مقدمہ نگار نے ناظرین کا بہت وقت لے لیا لیکن وہ سامنے سے ہٹا جاتا ہے، کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اب سے پڑھیں اور اس مقصد سے پڑھیں جس مقصد سے اللہ والوں کے حالات پڑھنے چاہئیں۔

اے اللہ اس کتاب سے ناظرین کو وہ نفع پہنچا جس کے لئے اور جس کی امید پر یہ لکھی گئی ہے اور اس کو قبول فرما!

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ
۲۱ رجمادی الاولیٰ ۱۳۸۳ھ } لکھنؤ

أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝
لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ط
لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

سورہ یونس
پارہ ۱۱ ، رکوع ۱۲

دیباچہ
طبع دوم

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد

ناچیز مصنف کتاب اس توفیق وسعادت پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہزار زبان سے ثناخواں وشکرگزار ہے کہ اس سوانح کی دوسری اشاعت اور نئے ایڈیشن کی نوبت آگئی پہلا ایڈیشن ایک سال کے اندر اندر ختم ہوگیا تھا اور کتاب کے قدردانوں اور شائقین کی فرمائشیں جاری تھیں، لیکن نظرثانی میں تاخیر ہوئی اور مختلف مشکلات کی بنا پر طباعت میں مزید تاخیر ہوئی، لیکن اس تاخیر میں خدا کی بڑی مصلحت تھی۔

کتاب کی تصنیف کا آغاز بڑی بے سروسامانی اور اشتباہ کی حالت میں ہوا تھا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے اس کام میں جس طرح مدد فرمائی اور جس طرح اس کا مواد مہیا ہوتا چلا گیا وہ اس بات کی دلیل تھی کہ اللہ تعالےٰ اپنے مقبول بندوں کے حالات کی حفاظت کا کس کس طرح سامان فرماتا ہے، اس سلسلہ میں سب سے بیش قیمت مدد اور رہنمائی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہٗ سے حاصل ہوئی ان کے بعد مخدوم زادگان گرامی، مولانا عبدالجلیل صاحب مولانا حافظ عبدالوحید صاحب اور ان دوسرے خدام خاص سے جنھوں نے اپنے معلومات قلم بند کرکے

بھیجے اور خطوط و ملفوظات کا جتنا ذخیرہ ان کے پاس محفوظ تھا بے تکلف پیش کر دیا۔ ان معاونین و محسنین کا اپنی اپنی جگہ کتاب میں حوالہ دیا گیا ہے، ملفوظات و محفوظات کے سلسلہ میں مولوی علی احمد صاحب مرحوم کی بیاض و روزنامچوں سے بڑی مدد ملی رحمہ اللہ تعالیٰ و غفر لہ اسی طرح صوفی محمد حسین صاحب ایم اے نے بڑا ایثار کیا کہ زیر تجویز سوانح کا جتنا مواد اکٹھا کر چکے تھے اور جتنا ذخیرہ انکے پاس موجود تھا، وہ انہوں نے بے کم و کاست عنایت فرما دیا اور ویؤثرون علی انفسھم کا مظاہرہ کیا جزاہ اللہ تعالیٰ خیرا!

اس سلسلہ کی سب سے زیادہ قابل ذکر اور قابل شکر خدمت محب مکرم چودھری بشیر احمد خاں صاحب نے انجام دی، انھوں نے کتاب کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا اور اس پر اس طرح غور کیا جیسے کسی قانونی دستاویز پر غور کیا جاتا ہے، جہاں جہاں ان کو شبہ ہوا حضرت کے خواص سے رجوع کیا اور ان کی رائے اور تحقیق معلوم کی، ممتاز خلفاء اور قدیم رفقاء سے مراسلت کی ناموں اور لفظوں کی تصحیح کی پھر سب سے بڑا کام یہ کیا کہ مولانا عبداللہ صاحب دھرم کوٹی مرحوم کو ان کی وفات سے چند روز پہلے جب وہ لاہور میں مقیم تھے کتاب پڑھکر سنائی اور اس کے مندرجات کی اصلاح و تحقیق کی، خاندان اور نسب کے بارے میں متعلقہ اشخاص سے خط و کتابت اور کھڈ والوں سے مراسلت کی پھر ساری کتاب کا ایک مفصل صحت نامہ اور صفحہ وار یادداشت مرتب کر کے بھیجی، یہ قیمتی مواد میری غیر موجودگی میں وصول ہوا تھا، اور عرصہ تک گم شدہ رہا یہ بھی تائید الٰہی تھی کہ جب اسکی دستیابی سے بالکل مایوسی ہو گئی تھی وہ مل گیا اور اس سے استفادہ کی پوری توفیق ہوئی، چودھری صاحب نے اس تعلق و اہتمام کا پورا ثبوت دیا جو ایک مسترشد اور منتسب کو اپنے عالی مقام شیخ کے حالات کی حفاظت و اشاعت اور تصحیح و تحقیق کے سلسلہ میں ہونا چاہئے وہ اپنی جانکاہی اور دیدہ ریزی کیلئے نہ صرف مصنف بلکہ حضرت کے تمام منتسبین و خدام کے شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں، شکر اللہ مساعیہ وتقبل عملہ

اسی دوران میں مخدوم زادہ مولانا حافظ عبدالوحید صاحب لکھنؤ اور رائے بریلی تشریف لائے انھوں نے کتاب کو دوبارہ پڑھا کئی جگہ تصحیح و تحقیق کی اور مفید معلومات و واقعات کا اضافہ فرمایا، آخر میں خواہر زادۂ عزیز مولوی سید محمد ثانی سلمہ کے لئے دعائے سعادت دارین ہے کہ ان کے اہتمام اور شوق و قدردانی سے کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اور اب یہ ایڈیشن شائع ہو رہا ہے، اللہ تعالےٰ اس سے حقیقی نفع عطا فرمائے اور پڑھنے والوں کو ایمان و احسان کی چاشنی اور اصلاح حال وحصول کمال کا جذبہ اور شوق پیدا ہو کہ یہی اس سیرت گرامی کا جوہر اور اس کا پیغام ہے، آخر میں دو لفظ اور عرض کر دینا ضروری ہیں کہ اس کتاب میں جو کچھ درج کیا گیا وہ اپنے علم و اطمینان کے مطابق اور اپنے امکان کی حد تک تحقیق و توثیق کے بعد درج کیا گیا ہے، اور اس میں کسی فریق یا کسی فرد کی رعایت، رضاجوئی، یا کسی کی حق تلفی یا حق پوشی سے کام نہیں لیا گیا۔ نہ اس میں ذاتی جذبہ یا ذاتی تعلقات کو دخل ہے یہ ایک تاریخی امانت ہے جس کو بے کم وکاست اہل لوگوں تک پہونچانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس وقت عالم اسلام پر حزن وملال اور شکستگی اضمحلال کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ متعدد سیاسی طاقتوں کے زوال اور مختلف سیاسی و نیم سیاسی تحریکوں کی ناکامی نے یورش تاتار کے بعد عالم اسلام میں پھر یہ سوال ابھار دیا ہے کہ مسلمانوں کی بنیادی کمزوری کیا ہے؟ اور کس چیز کی کمی اور فقدان نے مسلمان جماعتوں اور ملکوں کو اس منزل تک پہونچا دیا ہے۔ ذہنی انتشار روحانی کشمکش اور یاس و ناامیدی کے ایسے ہی مرحلوں پر اہل قلوب اور اہل یقین نے ٹوٹے ہوئے دلوں اور تھکے ہوئے دماغوں کو سہارا دیا ہے اور امید و یقین کا نیا چراغ روشن کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اخلاص و روحانیت صحیح اسلامی اخلاق اور اصلاحِ نفس کے بغیر حکومتیں اور طاقتیں حباب اور انقلاب و ترقی کی کوششیں

سراب سے زائد نہیں۔ یہی مشائخ سلف اور مصلحین امت کی تعلیمات کا خلاصہ تھا اور یہی اس سیرت کا عطر و جوہر اور دعوت و پیغام ہے۔

آخر میں عزیز سعید مولوی نثار الحق ندوی کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنھوں نے اپنی سعادت اور حضرت کے ساتھ تعلق کی بنا پر پہلے ایڈیشن کا بھی پورا مسودہ اپنے قلم سے لکھا، مصنف کے لئے اپنی نظر کی کمزوری کی بنا پر خود لکھنا دشوار تھا اس لئے تقریباً ساری کتاب املا کرانی پڑی، دوسری اشاعت کے موقع پر بھی ترمیم و اضافہ اور نظرثانی کے کام میں انھوں نے وقت صرف کیا اور محنت کی۔ بارک اللہ لہ۔

ابوالحسن علی

دائرہ شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ

۲۸ر جمادی الآخرہ ۱۳۸۵ھ ہجری

مطابق ۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۵ء بروز یکشنبہ

پہلا باب(۱)

خاندان، طفولیت، تعلیم اور سفر

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

ساعت بسیاری باید کشیدن انتظار
تا کہ در جوف صدف باراں شود در عدن

(حکیم سنائی)

خاندان حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ رائپوری کا خاندان ابتداء میں ٹھوہا محرم خاں تحصیل تلاگنگ ضلع کیمبل پور (مغربی پنجاب) میں رہتا تھا، آپ نسلاً راجپوت تھے(۱) اور جبٹ جیپ آپ کی گوت تھی جو اس نواح میں معروف ہے(۲)۔

---

(۱) آپ خود کبھی کبھی اس کا تذکرہ فرماتے تھے کہ آپ ہندوستانی نسل سے ہیں اور آپ کے اسلاف نے بزرگان دین کی تبلیغ سے اسلام قبول کیا تھا، اس سلسلہ میں یہ لطیفہ قابل ذکر ہے جو آپ نے خود سنایا کہ ایک مرتبہ کسی دعوت میں ایک ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے آپ کا تعارف کرایا گیا جو کسی اونچے مسلمان خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور عیسائی ہو گیا تھا، اس زمانہ میں عیسائیت کی تبلیغ کا بڑا زور تھا اور عیسائی مشنریوں کے اثر اور مشن اسکولوں میں تعلیم پانے کی وجہ سے بہت سے خاندانی مسلمان عیسائیت قبول کر رہے تھے اس عیسائی نے آپ سے بھی مذہبی گفتگو شروع کر دی اور آپ کو عیسائیت کی دعوت دینے لگا، آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کا کچھ اعتبار نہیں، تم نے ہم سے چار سو برس کیا ہمارے باپ دادا غیر مسلم تھے تمہارے بزرگوں کی تبلیغ و تلقین سے انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اب جب ہم مسلمان ہو گئے تو تم ہم کو چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے، اب بھی تمہارا کیا اعتبار ہے ہم تمہارے پیچھے چلیں گے تو تم ہم کو پھر چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ گے، یہ سن کر وہ شخص بہت خفیف ہوا اور کہا ہم آپ سے پھر کبھی ملیں گے۔

(۲) خاندانی روایت۔

اس خاندان کے پہلے نامور شخص مولوی عبدالرحیم صاحب تھے جو شاہان مغلیہ کے دور میں تھے، ان کو کسی بزرگ نے بشارت دی تھی کہ سات پشت تک تمہاری اولاد میں حفظ قرآن کی دولت اور علم رہے گا۔

مولوی عبدالرحیم صاحب کے تین فرزند تھے (۱) مولانا محمد اکرم (۲) مولانا محمد حسن (۳) مولانا محمد محسن، مولانا محمد اکرم، حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کے حقیقی دادا ہیں، یہ تینوں علاتی بھائی تھے، مولانا محمد حسن لیلیانی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا میں آکر آباد ہوئے مولانا محمد محسن مکھڈ شریف ضلع کیمبل پور میں پڑھنے کیلئے گئے، یہ اس نواح میں ایک بڑا علمی اور روحانی مرکز تھا، چشتیہ، نظامیہ، سلیمانیہ سلسلہ کی ایک بڑی خانقاہ وہاں موجود تھی، اس وقت مولانا محمد علیؒ[1] سجادہ نشین تھے، جو حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ کے خلفاء میں سے تھے مولانا محمد محسن آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے ساتھ ان کے فرزند مولانا محمد صاحب بھی تھے مولانا محمد علی نے مولانا محمد محسن کو قرآن شریف کا مدرس بنا دیا اور فرزند ارجمند کو طالبعلموں میں داخل کرلیا۔

آپ کے دادا اور چچا صاحبان مولانا[2] محمد اکرم خاندانی وطن تھوہا محرم خاں ہی میں رہے، آپ کے دونوں علاتی بھائیوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ ہم دونوں تعلیم میں مشغول رہیں اور

---

(۱) مولانا محمد علی صاحب کے حالات کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ مشائخ چشت از پروفیسر خلیق احمد نظامی (۲) خاندانی روایت ہے کہ بعد میں مولانا محمد صاحب کا عقد مولانا زین الدین صاحب کی دختر سے ہو گیا جنکو حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ نے خلیفہ محمد عابد جیؒ کا جانشین بنایا تھا خلیفہ محمد عابد جی حضرت مولانا محمد علی صاحب کے شاگرد و خلیفہ تھے، مکھڈ کے موجودہ سجادہ نشینوں کے شجرہ میں صوفی میاں محمد صاحب کا نام آتا ہے جنکے صاحبزادہ مولوی غلام محی الدین احمد صاحب بعد میں سجادہ نشین ہوئے، میاں محمد صاحب کے والد کا نام حافظ محمد محسن صاحب ہی لکھا ہوا ہے لیکن شجرہ میں انکے والد کا نام بجائے مولوی عبدالرحیم صاحب کے (جو حضرت رائپوری کے جد امجد ہیں) مولوی محمد ابراہیم صاحب دیا ہے اور انکے والد صاحب کا نام اللہ نور تحریر ہے اس خاندان کا سلسلۂ نسب سیدنا علی المرتضیٰ تک پہونچایا گیا ہے (شجرہ مرسلہ مولوی احمد الدین صاحب سجادہ نشین سابق) اس خاندان کا انتساب پنجاب کی مشہور و سربرآوردہ اعوان برادری سے ہے،
مکھڈ کے اس شجرہ کی بنیاد پر یہ بات کسی قدر مشتبہ ہو جاتی ہے کہ مولانا محمد محسن صاحب وہی ہیں جنکا تذکرہ سوانح میں آیا ہے اور وہ حضرت کے حقیقی دادا کے علاتی بھائی تھے۔ یا کوئی دوسری شخصیت ہیں؟ اور ان کے اجداد میں بھی اختلاف ہے اسلئے خاندان کے متعلق روایت ہی معتبر اور قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے جسکو سوانح میں درج کیا ہے

محمد اکرم گھر میں مال اور مویشیوں کی نگرانی کریں، وہاں سے تین کوس پر ایک درس[1] تھا، وہاں ایک عالم تھے، آپ رات کو ان سے پڑھنے جایا کرتے تھے، رات کو پڑھتے تھے اور صبح کو آجایا کرتے تھے، یہ سلسلہ ان کے والد اور بھائی کی لاعلمی میں جاری رہا، وہ سمجھتے رہے کہ یہ بالکل جاہل ہیں، ایک مرتبہ وہاں کسی مسئلہ پر مجلس مناظرہ قائم ہوئی، مولوی محمد اکرم بھی شامل تھے، کسی سلسلہ میں وہ بھی بولے یا کوئی حوالہ دیا، اس وقت انھوں نے منھ پر کپڑا ڈال رکھا تھا، والد نے ان کی آواز سے پہچانا کہ یہ مولوی محمد اکرم ہیں، سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ اگر یہ محمد اکرم ہیں تو یہ کیسے بول رہے ہیں، انھوں نے تو کچھ پڑھا پڑھایا نہیں، اٹھ کر تحقیق کی تو وہی تھے، والد نے گلے لگا لیا، پوچھنے پر انھوں نے تفصیل بیان کی، تلاگنگ کے علاقہ میں ان کے کشف کرامات مشہور ہیں۔

مولانا محمد اکرم کے چار صاحبزادے تھے (۱) مولانا محمد احسن (۲) مولانا کلیم اللہ عرف ٹوپی والا (۳) مولانا محمد یٰسین (۴) سب سے چھوٹے حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کے والد حافظ احمد صاحب تھے۔

مولانا محمد احسن

مولانا محمد احسن بڑے عالم، جیّد حافظ اور عابد شخص تھے، آپ کا معمول یومیہ ختم قرآن کا تھا، قبرستان میں چھپ کر سو رکعتیں نفل پڑھ لیتے، اس زمانہ میں مطابع کا عام رواج نہیں تھا، بڑی بڑی ضخیم کتابیں اپنے ہاتھ سے نقل کرتے، ہر وقت کتابت اور نقل کا مشغلہ رہتا تھا جب اس سے تھکتے تو نوافل شروع کر دیتے تھے، کتابوں کے جمع کرنے کا اتنا شوق تھا کہ اپنے مکانات سات سات روپئے پر فروخت کر کے کتابیں خرید

(۱) پنجاب اور صوبۂ سرحد کی اصطلاح میں جہاں کوئی عالم بیٹھ کر درس دینا شروع کر دیتے تھے اور طلباء جمع ہو جاتے تھے اس کو درس کہتے ہیں۔

لیتے تھے جو قیمت بھی لگائی جاتی تھی کتاب کے شوق میں اس کو فوراً قبول کر لیتے تھے۔

ایک مرتبہ اپنے بھائی کی شادی کا سامان خریدنے کیلئے بھیرہ گئے، حجام ساتھ تھا وہاں کسی ایسی کتاب کا علم ہوا کہ فروخت ہو رہی ہے جس کی تیس برس سے آرزو تھی، اس محلہ میں گئے، کتاب کی قیمت دریافت کی، دام بتائے گئے فوراً سب رقم کھول کر ڈال دی اور کتاب لے کر چلے آئے، فرمایا ایسی چیز لے کر آیا ہوں جو پشتہا پشت کام آئے گی حجام نے ملامت کی، فرمایا اس کتاب کے حصول کیلئے تیس برس سے دعا کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے آج نصیب فرمائی اور یہ شعر پڑھا۔[1]

جمادے چند دادم جاں خریدم
بحمد اللہ کہ بس ارزاں خریدم

طبیعت نہایت سادہ تھی، کھدر کی ایک چادر اوپر ڈال لیا کرتے تھے، ایک باندھ لیا کرتے تھے۔ ایک روز قبرستان جا رہے تھے کوئی کانٹا لگا، یا کسی چیز نے کاٹا اسی حالت میں وضو کرتے رہے، پیر متورم ہو گیا اسی حال میں انتقال ہوا مگر اپنے معمولات کو نہیں چھوڑا۔

آپ کے دو صاحبزادے تھے (۱) مولوی حاجی احمد صاحب[2] (۲) مولوی فضل احمد صاحب[3]

مولانا کلیم اللہ

مولانا کلیم اللہ حضرت حاجی عبدالغفور آخوند صاحبؒ صوات سے بیعت تھے اور آپ ہی سے خلافت تھی، پیدل صوات اپنے شیخ کی خدمت میں جایا کرتے تھے، بہت خوبصورت جوان تھے، آخوند صاحبؒ نے فرمایا کہ بال ترشوا دو اور پگڑی نہ باندھا

---

(۱) مسودہ صوفی محمد حسین صاحب ایم اے۔ (۲) مولوی حاجی احمد صاحب کے صاحبزادہ مولانا محمد صادق صاحب تھے، جن کے صاحبزادہ مولوی حافظ عبدالوحید صاحب اور بشیر احمد صاحب (خواہر زادگان حضرت مولانا عبدالقادر صاحب ہیں) (۳) مولانا فضل احمد صاحب کے صاحبزادہ عبدالباقی صاحب ہیں۔

کرو، ٹوپی پہنا کرو، اس سے ٹوپی والے مشہور ہوئے۔ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب فرماتے تھے کہ میں نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے ان کے پاس بہت ہندو مرد عورت تعویذ لینے آتے تھے لیکن وہ ان کو سر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔

مولانا کلیم اللہ بخاری شریف کھول کر وعظ فرماتے تھے جب وعظ ہوتا عشاء کے بعد شروع کرتے صبح تک سلسلہ جاری رہتا، اس پہاڑی علاقہ میں بکثرت انکے مرید تھے، آپ کو اپنے بھتیجے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب سے بڑی محبت تھی اپنی اولاد سے زیادہ محبت کرتے تھے بزرگوں کے پاس لے جاتے اور دعا کراتے، آپ کے صاحبزادے مولوی سعید اللہ تھے(۱) یہ بھی بڑے عالم تھے۔

۱۸۹۰-۹۱ء (۱۳۰۸ھ) میں مولانا کلیم اللہ کی وفات ہوئی۔(۲)

مولانا محمد یٰسین مولانا محمد یٰسین عالم اور مدرس تھے، ہمیشہ درس کا معمول رہتا تھا، اکثر حدیث پڑھایا کرتے تھے، ساٹھ ساٹھ ستر ستر طالب علم رہا کرتے تھے، مسجد میں درس ہوتا تھا، خود یا حاجی احمد صاحب سارے گاؤں سے آٹا اکٹھا کر کے گھر میں روٹی پکواتے، طالب علموں کو کھلا کر پھر پڑھانے بیٹھتے اور شام تک پڑھاتے رہتے۔

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کی شادی انھیں کی صاحبزادی فاطمہ بی بی سے ہوئی، دوسری صاحبزادی حضرت کے دو حقیقی بھائی حافظ عبدالعزیز صاحب کے گھر میں تھیں۔

آپ کے والد حافظ احمد صاحب حافظ احمد صاحب کی خالہ ڈھڈیاں(۳) بیاہی ہوئی

---

(۱) مولوی سعید اللہ کے بیٹے میاں امام الدین تھے جن کے صاحبزادے مولوی عبدالرحمٰنؒ، حافظ فضل الٰہیؒ اور عبدالسلامؒ ہیں۔ (۲) مسودہ صوفی محمد حسین ایم۔ اے۔ (۳) اس گاؤں کو بالآخر حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کا مولد اور وطن بننے کا شرف حاصل ہوا، پرانا گاؤں جہلم نے دریا برد کر دیا، موجودہ ڈھڈیاں اس سے کچھ فاصلہ پر جانب جنوب آباد ہے۔

تھیں، ان کے اولاد نہ تھی، انھوں نے اپنے شوہر کو جن کا نام بھی احمد تھا بھیجا کہ بھانجہ کو لے آئیں اور وہ اُنکو بیٹے کی طرح رکھیں، باپ نے عذر کیا، جب ان کی طرف سے زیادہ اصرار ہوا تو منظور فرمالیا لیکن بددعا دی کہ تم میرے بچہ کو زمین کی وجہ سے علم سے محروم رکھتے ہو، اللہ تعالیٰ تمہاری زمین کو دریابرد کر دے[1]۔

حافظ احمد صاحب قرآن مجید حفظ کر کے آئے تھے، تحصیل علم کی نوبت نہ آئی، تلاگنگ کا علاقہ حفظ قرآن میں دور دور مشہور تھا، بکثرت حفاظ ہوتے تھے اس لئے اس کو "اعوان قاری" کا علاقہ کہتے تھے[2]۔ حافظ احمد صاحب نے جو کچھ زمین پائی وہ سب بھائیوں میں مشترک رکھی، خود محنت کرتے تھے اور غلہ سب بھائیوں میں تقسیم فرما دیتے تھے، بڑے معاملہ فہم تھے، قوت فیصلہ بہت تھی، لوگوں کو آپ پر بڑا اعتماد تھا، اپنے معاملات میں آپ کو اکثر حکم اور ثالث بناتے تھے، جسمانی طور پر بڑے قوی تھے، اخیر عمر تک خود ہل چلاتے تھے۔

آپ قرآن مجید کے جید حافظ تھے، تلاوت میں بڑا انہماک تھا، ہر وقت قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے، اپنی زمین پر جاتے تو فرماتے کہ پانچ پارے پڑھ لیتا ہوں، تلاوت میں ترتیل کا بڑا اہتمام تھا، کھیت کے چاروں طرف شاگرد پڑھتے رہتے تھے، جہاں فارغ ہوتے ان کا سبق سن لیتے، کند ذہن سے کند ذہن طالب علم کے ساتھ محنت کرتے تھے، بڑی تعداد میں حافظ تیار کر دیے، صبح صادق کے ساتھ فجر کی نماز شروع فرما دیتے، قرأت اتنی طویل ہوتی تھی کہ لوگ اذان سن کر اٹھتے اور تیاری کر کے نماز میں شریک ہو جاتے

---

(۱) دریائے جہلم میں دو مرتبہ ایسا سیلاب آیا کہ اس سے ڈھڈیاں دریابرد ہو گیا اور نئی جگہ آباد ہوا۔

(۲) اس علاقہ میں "اعوان" کے نام کی ایک بڑی برادری اور قوم آباد ہے، اس برادری کے بہت سے افراد اب بھی حکومت پاکستان میں بڑے بڑے عہدوں پر ہیں۔

بعض مرتبہ اندیشہ ہوتا کہ سورج تو نہیں نکل آیا۔

قرآن مجید کے حفظ میں ایسی پختگی اور اطمینان تھا کہ آپ کے لقمہ دینے سے بڑے بڑے حافظوں کی سالہا سال کی غلطیاں نکلیں، جب آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کی تلاش کیلئے ہندستان کا سفر کیا (جس کا حال اپنی جگہ پر آئے گا) تو امرت سر کے ایک دیہات میں رات کو ایک مسجد میں قیام کیا، امام صاحب نے فجر کی نماز میں ایک جگہ غلط پڑھا، حافظ صاحب نے لقمہ دیا، امام صاحب نے لقمہ قبول نہیں کیا۔ دو تین مرتبہ ایسا ہوا، بالآخر انھوں نے لقمہ لیا۔ نماز کے بعد انھوں نے دریافت کیا کہ مجھے لقمہ کس نے دیا؟ آپ نے کہا میں نے۔ انھوں نے کہا تم کون ہو؟ کہا مسافر، کہا تم نے لقمہ غلط دیا۔ فرمایا نہیں صحیح دیا! آخر قرآن مجید لایا گیا، اس میں ویسا ہی چھپا ہوا تھا جیسا امام صاحب نے پڑھا، فرمایا یہ غلط ہے، دوسرا قرآن شریف منگواؤ، بالآخر غلطی نکلی، امام صاحب نے کہا تمھارا بڑا احسان ہے، ساٹھ برس سے میں غلط پڑھ رہا تھا، پھر انھوں نے اونٹ دیا اور کہا جہاں تک چاہو لیجاؤ، حافظ صاحب نے تیس چالیس میل لے جا کر واپس بھیج دیا، اس سفر میں آپ نے چالیس قرآن مجید ختم کئے۔

حافظ احمد صاحب کی پہلی شادی ڈھکواں میں ہوئی جو ڈھڈیاں سے چار میل کے فاصلہ پر ضلع سرگودھا میں ہے ان سے ایک صاحبزادی ہوئیں، کوئی اولاد نرینہ نہیں ہوئی، ساٹھ برس کی عمر تک دوسری شادی نہیں کی، حافظ صاحب کے ایک شاگرد حافظ روشن دین کی روایت ہے جو اس بستی میں مشہور ہے کہ حافظ صاحب کو دیکھ کر ایک مجذوب بزرگ نے کہا تم شادی کرو، میں تمھاری پشت میں ایک ایسا نور دیکھتا ہوں جس سے ایک عالم منور ہوگا، چنانچہ آپ نے موضع للیانی ضلع سرگودھا کے ایک معزز زمیندار خاندان

میں شادی کی۔[1] اِن اہلیہ سے تین صاحبزادے ہوئے (۱) حضرت مولانا عبدالقادر صاحب (۲) حافظ عبدالعزیز صاحب (۳) حافظ محمد خلیل صاحب[2] اور ایک صاحبزادی[3]۔

وفات کے وقت کمسن صاحبزادی سورۂ یٰسین پڑھنے لگیں۔ آپ نے منع فرمایا اور حافظ روشن دین کو حکم دیا، حافظ صاحب نے تلاوت شروع کی، آیت بَلٰی وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ پر وہ عمداً ٹھہرے کہ دیکھیں حافظ صاحب حسب عادت لقمہ دیتے ہیں یا نہیں؟ آپ نے لقمہ دیا جس طرح سے کنویں کے اندر سے آواز آتی ہے۔ اخیر کی آیت فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ خود پڑھی اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔[4]

ولادت وطفولیت

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کو خود یا آپ کے کسی بھائی یا عزیز کو تعین کے ساتھ آپ کا سنہ ولادت یاد نہیں، اس وقت کسی کو بھی اس کا احساس نہیں ہوگا کہ یہ بچہ آگے جا کر کتنا بڑا شیخ اور عارف ہونے والا ہے اس لئے گاؤں میں پیدا ہونے والے بچوں کی طرح کسی نے آپ کا سنہ ولادت لکھنے یا یاد رکھنے کا اہتمام نہیں کیا، لیکن بعض قرائن اور قیاسات سے تقریبی طریقہ پر آپ کے سن ولادت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، آپ فرماتے تھے کہ میں بہت بچہ تھا میں نے اپنے سب بڑوں کو کہتے ہوئے سنا کہ اللہ خیر کرے چودھویں صدی چڑھ رہی ہے، میں اتنا چھوٹا تھا کہ صدی کے

---

(۱) حضرت کی والدہ صاحبہ کا انتقال ۱۳۴۸-۴۹ھ/۱۹۳۰-۳۱ء میں ہوا، بڑی ذاکر شاغل تھیں، بارہ ہزار اسم ذات کا ذکر کر لیا کرتی تھیں، حضرت فرماتے تھے کہ بعد کے دور میں میں کبھی کہتا کہ والدہ صاحبہ یہ اچھا تھا کہ میں یہاں پڑا رہتا یا یہ اچھا ہے؟ فرماتیں بیٹا کیا مقابلہ؟ (۲) آپ کے صاحبزادہ مولوی عبدالجلیل صاحب حافظ محمد صدیق صاحب مولوی محمد رفیق صاحب ہیں۔ (۳) والدہ مولوی عبدالوحید صاحب (۴) آبائی اور خاندانی حالات کا ماخذ مستند خاندانی روایات ہیں جن کا بڑا حصہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کے چھوٹے بھائی حافظ محمد خلیل صاحب کے ارشادات سے ماخوذ ہے۔

چڑھنے (یعنی صدی کے شروع ہونے) کا مطلب نہیں سمجھتا تھا، میں سمجھا کہ جیسے سورج چڑھتا ہے اسی طرح کوئی نئی چیز چڑھنے والی ہے۔ چنانچہ میں مشرق کی طرف بہت غور سے دیکھتا تھا کہ صدی کیسے چڑھتی ہے؟

اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کی عمر ۹۔۱۰ سال سے زیادہ نہیں ہوگی، اگر اسکو صحیح مان لیا جائے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء کے کچھ بعد آپ کی ولادت ہوئی، کبھی کبھی حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ میرا سن اس وقت ۸، ۹ برس کا رہا ہوگا۔

آپ کا نام والدین نے غلام جیلانی رکھا اور یہی نام آپ کا اس وقت تک رہا، جب آپ رائے پور حاضر ہوئے، آپ کے شیخ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب نے نام دریافت کیا تو آپ نے فرمایا، غلام جیلانی، ارشاد ہوا کہ آپ تو عبد القادر ہیں، اسوقت سے یہی نام مشہور ہوا، اب بھی علاقہ کے اکثر لوگ غلام جیلانی ہی کے نام سے جانتے ہیں اور کاغذات میں بھی اسی نام سے اندراج تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ سکھوں کی عملداری ختم ہو کر نئی نئی انگریزی حکومت قائم ہوئی تھی اور پنجاب کے علاقہ میں جو سکھوں کی فوجی حکومت کی بے آئینی اور وقت بے وقت کی غارتگری سے تاخت وتاراج ہو رہا تھا، نیا نیا امن اور نظام قائم ہوا تھا، اور لوگوں کی جان میں جان آئی تھی، حضرت فرماتے تھے جب ہمارے باپ چچا سونے کو لیٹتے تھے تو اللہ کا بڑا شکر ادا کرتے تھے اور دیر تک الحمد للہ الحمد للہ کہتے تھے، میں نے دریافت کیا کہ آپ کیوں بڑی دیر تک الحمد للہ کہتے رہتے ہیں۔؟ انھوں نے فرمایا بیٹا تم کیا جانو کہ ہم نے کیسا زمانہ گزارا ہے، سکھ عامل آتے تھے اور ہماری کھڑی فصلیں کاٹ لے جاتے تھے نہ ہمارے گھر میں کوئی کپڑا چھوڑتے تھے اور نہ کھانے کا کوئی سامان، چمڑے کے ٹکڑے بھون بھون کر کھانے کی

نوبت آتی تھی، سردی میں اوڑھنے کیلئے کپڑا نہیں ہوتا تھا، اب ہم لحاف اوڑھتے ہیں تو بے اختیار اللہ تعالیٰ کا شکر زبان سے جاری ہو جاتا ہے۔!

حضرت کا رنگ بچپن میں زیادہ سانولا تھا، حافظ احمد صاحب کو اپنے سب لڑکوں میں حضرت سے زیادہ محبت تھی، لوگ طعنہ دیتے تھے کہ اپنے سب خوبصورت لڑکوں میں آپ کو اس لڑکے سے محبت ہے، فرماتے تھے کہ تم اس کو کیا جانو، جب اس کے ہنر کھلیں گے تب تم پہچانو گے

ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے چچا حافظ محمد یٰسین صاحب اور مولانا کلیم اللہ صاحب سے پائی، چچا صاحبان اکثر کھیوڑے میں رہتے تھے، آپ نے مولانا کلیم اللہ صاحب سے قرآن مجید حفظ کیا، اس وقت ڈھڈیاں کے قریب بھرت شریف اور جھاوریاں(۱) تعلیم کے مرکز تھے، آپ نے دونوں مقامات پر مولانا محمد خلیل صاحب سے تعلیم حاصل کی۔

مولانا محمد خلیل صاحب بھرت شریف کے رہنے والے تھے، جھاوریاں میں پڑھاتے تھے، بڑے مخلص، صاحب نسبت علماء میں سے تھے، حسبۃً للہ درس دیا کرتے تھے، مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ پیدل جا رہے تھے، قافلہ سے بچھڑ گئے، پیاس کی شدت سے بے ہوش ہو کر گر گئے، ایک سن رسیدہ بدوی خاتون نے ان کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا، اس کے پاس صراحی تھی اس نے قطرہ قطرہ منہ میں ٹپکایا، اس سے ہوش آیا، ہوش آتے ہی انھوں نے دیکھا کہ ان کا سر ایک بوڑھی عورت کے زانو پر ہے، پہلا کلمہ یہ فرمایا کہ تم نامحرم ہو، میرا سر اپنے زانو سے ہٹا لو، اسی بیہوشی کی حالت میں سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ ان کو بیعت کر لو، اور سلسلۂ قادریہ

(۱) یہ ایک آباد اور پر رونق قصبہ ہے اور ڈھڈیاں سے چھ میل مغرب کی طرف واقع ہے۔

کا ذکر تلقین کرو، وہاں سے واپس آئے تو بڑا رجوع ہوا، آپ پر استغراق اور جذب کا غلبہ ہوا اور اسی حالت میں انتقال فرمایا۔ حضرت رائپوری فرماتے تھے کہ یہ ان کی بے لوث اور خالصتاً لوجہ اللہ خدمت و عمل کا نتیجہ تھا۔[1]

بھادریاں میں مسجد عنایت والی میں تقریباً سات ماہ یا کم و بیش قیام رہا، اسوقت عمر پندرہ یا سولہ سال کی رہی ہوگی۔[2] آپکے تایازاد بھائیوں کی خواہش تھی کہ آپ ہمارے جانوروں کی نگرانی کریں اور ہم دوسرا کام کریں، آپکے والد صاحب کو یہ بہت ناگوار تھا، فرماتے تھے کہ مجھے تم کام کرتے اچھے نہیں معلوم ہوتے، میری آرزو یہ ہے کہ تم پڑھو۔

آپنے "مراح الارواح" اور "قال اقول" تک مولانا محمد خلیل صاحب سے پڑھا، غالباً وطن میں اور وطن کے قریب رہ کر تعلیم کا جاری رکھنا دشوار نظر آتا تھا، یوں بھی ہندستان کا مرکزی اور شمالی حصہ (دہلی و صوبہ جات متحدہ) علمی و تعلیمی مرکز تھا، اور وہاں بڑے بڑے نامور اور جید علماء موجود تھے، جن سے پڑھنے کیلئے افغانستان اور سرحد اور پنجاب کے دور دراز گوشوں سے طالب علم جایا کرتے تھے، عام طور پر اس حصہ کو پنجاب میں "ہندستان" کہتے تھے،

تحصیل علم کیلئے ہندوستان کا سفر

آپنے دہلی اور اس کے آس پاس کے علمی مرکزوں میں تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا، کچھ روپئے جو گھر میں تھے لئے، اور جہلم پار کر کے للہ سے گاڑی پر سوار ہوے، اس وقت خوشاب اور ملک وال کے درمیان ریل تھی، اس حصہ کو ریل سے طے کر کے آپ نے بقیہ سفر طے کیا جس کی تفصیل معلوم نہیں،

(۱) مولانا محمد خلیل صاحب کے ایک صاحبزادہ مولانا محمد رفیق تھے جنکو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے تلمذ حاصل تھا اور آپ ہی کے مسلک و عقائد پر تھے، (۲) روایت صوفی غلام فرید صاحب ساکن بھادریاں۔

سہارن پور(۱) اس وقت مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کی شرح جامی بہت شہرۂ آفاق تھی، لوگ کابل وقندھار سے مولانا ثابت(۲) علیؒ سے شرح جامی پڑھنے آتے تھے، فارغ التحصیل طلبا بھی شرح جامی کے شوق سے سہارنپور کا سفر اختیار کرتے تھے، آپ بھی شرح جامی پڑھنے کے شوق سے سہارنپور آئے، یہ غالباً ۱۳۱۴ھ کا زمانہ ہے، اصل مقصد تو مولانا ثابت علیؒ سے شرح جامی کا پڑھنا تھا، ضابطہ میں مدرسہ کے قواعد کے مطابق تین سبق اور ہوں گے، بنجاروں کے محلہ کی کسی مسجد میں قیام تھا، حضرت اس زمانہ کے کچھ قصے بھی

(۱) حضرت اپنے حالات کے تذکرہ میں سنین کا تعین بہت کم فرماتے تھے سوالات بھی تاریخی ذہن سے نہیں بلکہ عبرت یا تربیت کی مصلحت سے ضمناً بیان فرمادیا کرتے تھے، اس بناپر ان مقامات میں تاریخی ترتیب قائم کرنی بہت مشکل ہے جہاں آپ نے تعلیم کی غرض سے قیام کیا، لیکن خوش قسمتی سے آپ نے اکثر مقامات کے تذکرہ میں بعض ایسے واقعات کا تذکرہ فرمایا ہے جنکے سہارے انکے زمانہ کا تعین اور ان میں ترتیب قائم کی جاسکتی ہے سہارنپور کے تذکرہ میں آپ نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (فرزند مولانا احمد علی صاحب محدثؒ) سہارنپوری کے پڑھنے کا پانی پت میں مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحبؒ کی قرأت سننے کا اور اپنے زمانۂ قیام میں ان کی وفات کا، دہلی کے تذکرہ میں مولانا سید انور شاہؒ کے درس میں شامل ہونے اور ان کے مدرسہ امینیہ میں مدرس ہونے کا تذکرہ فرمایا،

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ۲۲ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ کو رخصت لے کر سہارنپور سے حیدرآباد تشریف لے گئے اور قاری عبدالرحمٰن صاحبؒ نے ۵ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ کو وفات پائی، مولانا انور شاہؒ صاحب کا تقرر بحیثیت صدر مدرس مدرسہ امینیہ ۱۰ شعبان ۱۳۱۶ھ کو ہوا، اور آپ ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کو اپنے والد صاحب کے اصرار پر وطن چلے گئے، اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ پہلے سہارنپور پھر پانی پت اور آخر میں دہلی گئے، پانی پت اور دہلی کے زمانۂ قیام کے درمیان آپ نے رامپور قیام فرمایا ہوگا، بعض مرتبہ آپ نے فرمایا بھی کہ آپ رامپور سے دہلی تشریف لے گئے تھے۔

(۲) مولانا ثابت علی بڑے مخلص اور متقی علماء میں سے تھے، آپ مولانا سید عبداللطیف صاحب سابق ناظم مدرسہ مظاہر العلوم کے چچا تھے، مدرسہ مظاہر العلوم کے نہایت ہی قدیم مدرسین میں تھے، مدرسہ ہی میں اول تا آخر پڑھا پھر دو روپے پر نائب مدرس رکھے گئے اور اخیر عمر تک مدرسہ ہی میں زندگی گزار کر سہارنپور ہی میں ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۴۲ھ کی شب میں وفات پائی وہیں مدفون ہوئے (افادہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مدظلہ العالی)

سنایا کرتے تھے، مولانا سید عبداللطیف سابق ناظم مدرسہ مظاہر العلوم کی تعریف میں بارہا یہ فرمایا کہ اس زمانہ میں یہ بے ریش تھے، ہم لوگ تو عصر کے بعد سیر سپاٹے میں رہتے اور مولانا عبداللطیف صاحب اس نوعمری میں جامع مسجد کے حوض کی پٹری پر قبلہ رخ بیٹھ کر حفظ قرآن شریف پڑھا کرتے تھے، اس وقت ناظم صاحب مرحوم کی ابتدائی کتابیں تھیں اور حضرت کے یہاں متوسط۔[1]

سہارنپور میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (فرزند مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری) سے بھی پڑھا اور ایک مسجد میں امامت بھی کی، اسی زمانہ میں غالباً حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری ؒ کی پہلی زیارت ہوئی، شاید اس وقت خیال بھی نہ ہو کہ بالآخران ہی کے قدموں میں زندگی گزارنی ہے۔

پانی پت

یہاں سے آپ پانی پت آئے، یہ ۱۳۱۴ھ تھا فرماتے تھے کہ ہمیں قاری عبدالرحمٰن صاحب کا قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا، آپ کا معمول تھا کہ وعظ سے پہلے ایک کوع پڑھتے تھے، ہمیں سن کر تعجب ہوا کہ بہت سادہ پڑھتے ہیں، ہمارے پہونچنے کے اٹھارہ جمعے بعد قاری صاحب کی وفات ہوئی۔

آپ نے پانی پت میں مختصر قیام کیا، محلہ مٹکی والا میں مدرسہ تھا، رہائش جامع مسجد میں تھی۔[2] وہیں مولانا محمد یحییٰ صاحب[3] سے شرح جامی پڑھی، فرماتے تھے کہ شرح جامی کا یہ نسخہ

---

(۱) افادہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہٗ (۲) مسودہ صوفی محمد حسین صاحب (۳) مولانا محمد یحییٰ صاحب کے والد کا نام حافظ محمد عابد صاحب عثمانی تھا۔ آپ پانی پت کے مشہور عثمانی خاندان (جس میں حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی ہستی مشہور و معروف ہے) میں تھے، پانی پت کے مدرسہ اسلامیہ میں مولانا راغب اللہ صاحب عثمانی اور مولانا لطیف اللہ صاحب (والد مولانا القاری اللہ صاحب) سے تحصیل علم کی، مولانا راغب اللہ صاحب کے انتقال کے بعد اس مدرسہ میں آخر وقت تک تعلیم دیتے رہے، روحانی تعلق حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ؒ سے تھا، انکی وفات کے بعد آپ نے حضرت مظفر شاہ صاحب مرادآبادی اور حضرت مولانا تھانوی ؒ سے تعلق قائم کیا، انتقال تقریباً ۱۹۱۶ء میں ہوا (افادہ مولانا القاری اللہ صاحب عثمانی)

مولانا محمد یحییٰ صاحب ہی کی ملکیت تھی، دوران مطالعہ میں جلد ٹوٹ گئی میں نے ڈرکر اس کو کسی طرح ٹھیک کر کے واپس کیا،[1] پانی پت میں آپ نے مولانا راغب اللہ[2] صاحب سے بھی پڑھا، مولانا القار اللہ صاحب پانی پتی فرماتے ہیں کہ حضرت نے کچھ ان کے والد صاحب مولانا لطیف اللہ صاحب سے بھی پڑھا، اس زمانہ میں قصبہ کے بعض علماء و شرفاء بعض ممتاز طالب علموں کو اپنے گھر پر کھانا کھلایا کرتے تھے اور اپنے بچوں ہی کی طرح برتاؤ کرتے تھے، مولانا لطیف اللہ صاحب کے گھر جو معزز طالب علم کھانا کھاتے تھے ان میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب بھی تھے، مولانا القار اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ میری والدہ صاحبہ مرحومہ اکثر حضرت کا نام لیا کرتی تھیں، اور یہ بھی کہا کرتی تھیں کہ تو ان کی خدمت میں بہت گستاخ تھا، مولانا فرماتے ہیں کہ ۱۹۲۶ء میں ایک مجلس میں حضرت کی زیارت ہوئی۔ میں حضرت کی طرف بغور دیکھ رہا تھا، حافظ عبدالجلیل صاحب دہلوی نے حضرت سے فرمایا کہ یہ مولانا القار اللہ عثمانی پانی پتی ہیں، حضرت نے بغور چہرہ کو دیکھ کر فرمایا کہ تمہارے والد کا نام مولوی لطیف اللہ ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ حضرت نے معانقہ گلے سے لگالیا اور پیار کیا اور والدہ صاحبہ کی خیریت دریافت کی اور مسکراتے ہوئے پچھلی باتیں یاد دلاتے رہے۔[3]

(۱) روایت مولانا محمد وجیہ عثمانی صاحب خلف مولانا محمد یحییٰ پانی پتی، مولانا محمد وجیہ صاحب کہتے ہیں کہ حضرت نے اس واقعہ کا تذکرہ کر کے اس کتاب کے دوبارہ دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا لیکن اس کتاب کے متعلق مولوی محمد وجیہ صاحب کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ (۲) مولانا راغب اللہ صاحب مولانا محب اللہ صاحب عثمانی کے فرزند تھے ان کا مکان مدرسہ کے نام سے ۱۹۴۶ء تک مشہور تھا، مولانا راغب اللہ صاحب نے مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ اور مولانا لطیف اللہ صاحب علیگڑھی سے سند حاصل کی، روحانی تعلق حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی سے رکھتے تھے، ان کی وفات کے بعد حضرت شاہ مظفر مرادآبادی سے رجوع فرمایا، تقریباً ۱۳۲۰ھ میں انتقال کیا اور حضرت قاری صاحبؒ کے پہلو میں دفن کئے گئے (افادہ مولانا القار اللہ صاحب عثمانی)

(۳) مکتوب مولانا القار اللہ صاحب۔

حضرت فرماتے تھے کہ پانی پت میں جس مسجد میں رہتا تھا کچھ عامی لوگ آئے کہیں سے فاتحہ نذر کی روٹی آئی تو انھوں نے نہیں کھائی، وہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، مجھے تعجب ہوا کہ آپ کی نسبت اور تاثیر اتنی قوی ہے کہ جاہل عامیوں کے اندر بھی بدعات سے اجتناب کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

رام پور رام پور کی معقولات اور منطق کی (جس کی پنجاب اور مغربی ہندستان میں بڑی اہمیت تھی) بڑی شہرت تھی، مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادی اور ان کے تلامذہ نے اپنے قیام اور تدریس سے اس کو معقولات کی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز بنا دیا تھا. شیخ محمد طیب عرب صاحب بھی وہیں تھے، اور نواب کلب علی خاں خلد مکاں کی جوہر شناسی اور علمی سرپرستی نے بڑے بڑے اہل کمال اور ماہرین فن کو رام پور کھینچ لیا تھا جو ان کی وفات کے بعد بھی عرصہ تک رام پور کی زیب و زینت رہے۔ کچھ عجیب نہیں کہ منطق اور علوم عقلیہ کے شوق میں جو قدیم درس نظامی کے مایۂ ناز مضامین تھے، آپ نے رام پور کا سفر اختیار کیا ہو،

یہاں دستور تھا کہ طلباء مسجد میں رہتے تھے اور اہل محلہ ان کے کھانے کے متکفل ہوتے تھے، اس وقت سرحد وغیرہ کے طلباء یہاں کثرت سے پڑھتے تھے اور وہی نو وارد طلباء کے لئے کوئی مسجد لوا دیتے تھے، آپ کا یہاں دو مسجدوں میں قیام ہوا. مولانا ذوالفقار احمد صاحب رام پوری راوی ہیں کہ "ان دونوں مسجدوں میں حضرت خود رام پور تشریف آوری کے زمانہ میں ہمارے ساتھ ایک بار تشریف لے گئے، ایک شہر کے مغربی محلہ پھلواڑ میں ہے جو حضرت کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا جعفر علی خاں کی مسجد کہلاتی تھی، اور اب چوک محمد سعید خاں کی مسجد کے نام سے مشہور ہے. حضرت نے ہم لوگوں کو مسجد میں گنبد پوش حجرہ دکھا کر فرمایا تھا کہ اس حجرہ میں میرا قیام رہا تھا، یہ حجرہ اب تک بحالہ موجود ہے، دوسری

مسجد شہر کے مشرقی حصہ محلہ گنج قدیم کی مچھلی بازار والی مسجد ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں ہی مسجدیں مچھلی والوں کی ہیں، حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ اس وقت مدرسہ عالیہ رامپور نواب حیدر علی خاں کی کوٹھی[1] میں تھا، یہ نواب حامد علی خاں کے ابتدائی عہد حکومت کا زمانہ ہے۔"

حضرت فرماتے تھے کہ میرا جی یہاں نہیں لگا، شہر کی سڑکوں پر غریب ہندو کہار جو اُپلے بیچنے کو لاتے تھے، لوگ ان کو طرح طرح سے تنگ کرتے تھے اور اُپلے چھین چھین کرلے جاتے تھے، میں سوچتا تھا کہ ان مظالم کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں کیا ہوگا، فرماتے تھے کہ میں تھوڑے ہی دن یہاں رہا اور کچھ ابتدائی کتابیں یہاں پڑھیں، محلہ مدرسہ (جیل روڈ) پر ایک مولوی صاحب سے پڑھنے جاتا تھا، یہ بھی کبھی ارشاد فرمایا کہ حکیم احمد رضا خاں صاحب سے کچھ طب کی کتابیں بھی پڑھی تھیں[2]، فرمایا کرتے تھے کہ مجھے محلہ سے روٹیاں اور ایک پیسہ روز ملتا تھا اس پیسہ کے میں چنے لے آیا کرتا تھا، انھیں ابال کر کھالیتا تھا[3]۔

آپ علمائے معقولات کے پاس اٹھنے بیٹھنے اور ان کے حالات سے واقف ہونے کی بنا پر ان سے زیادہ متأثر اور ان کے عقیدت مند نہیں رہے تھے، ان کی آزادروی اور ان میں سے بعض کے عدم تورع اور بلند بانگ دعاوی سے آپ کی طبیعت متنفر ہوگئی تھی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان منطقیوں اور ادیبوں میں تکبر اور حُبّ جاہ دیکھا، وہ کسی عالم کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور "ہم چو من دیگرے نیست" ان کا قول تھا،

---

(۱) اب اس مقام پر غلہ کی منڈی ہے اور مسٹن گنج کے نام سے مشہور ہے (۲) حکیم صاحب لکھنؤ کے رہنے والے تھے، رامپور میں ایک بلند پایہ شخصیت، ماہر طبیب، نڈر، بہادر اور مرجع خاص و عام تھے، آپ کے صاحبزادے حکیم ہادی رضا خاں صاحب بانی منبع الطب اور حکیم حبیب رضا خاں صاحب مرحوم دونوں طبیب تھے
(۳) مکتوب مولانا ذوالفقار احمد صاحب رامپوری۔

والد صاحب کی آمد اور رام پور کی جفاکشانہ طالب علمی

فرماتے تھے کہ رامپور سے کسی دوست نے خط لکھ دیا کہ غلام جیلانی کا انتقال ہوگیا، مجھے جب اس کا علم ہوا تو میں نے خط لکھا کہ میں زندہ ہوں، والدہ صاحبہ نے والد صاحب سے اصرار کیا کہ اس کو لے کر آؤ۔ والد صاحب رام پور تشریف لے گئے، انھوں نے رام پور آکر کسی استاد سے پوچھا کہ ہم اپنے لڑکے غلام جیلانی کو ڈھونڈنے آئے ہیں، انھوں نے کہا ابھی ابھی یہاں بیٹھے تھے، فلاں جگہ پڑھنے گئے ہیں پھر واپس آجائیں گے، انتظار کرلو، انھوں نے فرمایا کہ نہیں ہم تو ابھی جائیں گے، انھوں نے ایک آدمی ساتھ کردیا، فرماتے تھے کہ میں بازار سے گزر رہا تھا، میں نے دور سے والد صاحب کو پہچان لیا، پہلے میرے جی میں آیا کہ میں کہیں چھپ جاؤں، یہ کہیں مجھے واپس نہ لے جائیں، معاً خیال آیا کہ والد صاحب اتنی مسافت طے کرکے تشریف لائے ہیں، یہ بڑی بے مروتی اور سنگدلی ہے، میں نے ملاقات کی، بڑی محبت سے ملے، اور فرمایا کہ تمہاری والدہ نے اصرار کیا کہ میں تمھیں لے آؤں، تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں ابھی پڑھوں گا جب تک فارغ نہیں ہوجاتا واپس نہیں جاتا، والد صاحب سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم پڑھ کر آؤ۔

رات کے وقت حضرت نے کہیں سے بستر مانگ کر والد صاحب کیلئے بچھایا، عرض کیا کہ آپ آرام فرمائیں، میں مطالعہ کرآؤں، آپ مسجد کے چراغ کی روشنی میں ازراہ احتیاط مطالعہ نہیں فرماتے تھے، بازار کی لالٹین کی روشنی میں مطالعہ کرتے تھے، بعض اوقات کھانا نہ ہونے کی وجہ سے مولی کے پتے اٹھا کر کھا لیا کرتے تھے،

اور کئی کئی وقت اسی پر گزارا ہوتا تھا، واپس آئے تو والد صاحب سو چکے تھے، سردی کا زمانہ تھا، خود ایک لپٹی ہوئی صف کے اندر گھس کر سو گئے، کپکپی سے ایسی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے کوئی چوہا یا بلی ہے والد صاحب جب یہ آواز سنتے تو چھڑی زمین پر پٹک کر اس کو بھگاتے جب بار بار اسکی نوبت آئی تو حضرت نے فرمایا کہ میں غلام جیلانی ہوں، آپ فکر نہ فرمائیں، اس حالت کو دیکھ کر والد صاحب کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس وقت آٹھ روپے انکے پاس تھے، فرمایا کہ میرے پاس آٹھ روپئے ہیں، اس سے رضائی لبستر بنوالو حضرت نے فرمایا کہ آپ میری فکر نہ فرمائیں، آپ کو راستہ میں ضرورت ہوگی، لیکن آپنے اصرار سے دے دیا، والد صاحب نے اساتذہ سے شکوہ کیا کہ آپ کا ایک طالب علم ہے، آپ اس کا خیال نہیں فرماتے، انھوں نے کہا کہ ہم نے مولوی صاحب سے ہر چند اصرار کیا مگر انھوں نے قبول نہیں کیا،

والد صاحب واپس وطن تشریف لے گئے اور یہ وعدہ لے لیا کہ خط لکھتے رہو گے آپ خط لکھتے تھے اور جو کتابیں زیر درس تھیں، والد صاحب کی خوشی کیلئے ان کے نام بھی لکھ دیتے تھے، حافظ صاحب جھاوریاں جاکر مولانا محمد خلیل صاحب سے پوچھتے تھے کہ یہ کون سی کتابیں ہیں جن کو غلام جیلانی نے لکھا ہے کہ ہم پڑھتے ہیں[1]۔

رام پور میں مولوی عبد الرحمٰن[2] صاحب بتوی سے خاص تعلقات اور دوستی ہوگئی،

(۱) روایت حافظ محمد خلیل صاحب برادر اصغر حضرت مولانا عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۲) مولوی عبد الرحمٰن صاحب مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے اور بہت متشدد اہل حدیث تھے، انکی علمی استعداد بالخصوص نحو بہت اچھی تھی، اخیر زمانہ میں رائے بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، اور وہیں شادی کر لی، حضرت سے اس ناچیز نے جب اس کا تذکرہ کیا تو حضرت بہت خوش ہوئے، اکثر ان کی صحبتوں کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے اور بڑی دلچسپی سے اُن کے حالات دریافت فرماتے، ملاقات کی نوبت نہیں آئی، ان کے صاحبزادے حکیم مولوی عبید اللہ صاحب نے حضرت سے شرف بیعت حاصل کیا،

یہ صاحب بالسی ضلع بستی کے رہنے والے تھے اور عدم تقلید اور مسلک اہل حدیث کی طرف ان کا شدید رجحان تھا، اکثر ان سے بحث بھی ہوتی تھی، آپس میں ایک دوسرے سے روٹھ بھی جاتے، اور پھر جیسا کہ نوعمری کا تقاضا اور طالب علموں کا طریقہ ہے پھر خود ہی من بھی جاتے، انھیں کی معیت میں آپ نے رامپور سے دہلی کا قصد کیا، ممکن ہے کہ انھوں نے وہاں حدیث پڑھنے کا شوق دلایا ہو،

اس وقت سفر خرچ کے لئے صرف ایک آنہ پاس تھا، رام پور سے دہلی پیدل سفر ہوا، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ راستہ بھر اسی ایک آنہ کے چنے پر گزر گیا، ایک جگہ دریا کو عبور کرنا تھا کشتی والے نے رعایت کی اور طالب علم سمجھ کر مفت اتار دیا۔

دہلی دہلی کا یہ سفر ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۹ء اور ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء کے درمیان پیش آیا، اگر پانی پت سہارنپور اور رامپور کی طالب علمی کم سے کم دو تین سال کی فرض کریں تو اغلب یہ ہے کہ یہ سفر ۱۳۱۷ھ یا ۱۳۱۸ھ میں ہوا ہو گا۔[1] غالباً مولوی عبدالرحمٰن صاحب کی رہبری اور مشورہ سے اور ان کے تعلقات کی بناء پر ابتداءً آپ کا قیام مولانا عبدالوہاب صاحب کے مدرسہ واقع صدر بازار میں ہوا، آپ کی نشست و برخاست زیادہ تر اہل حدیث طلباء و علماء کے ساتھ رہتی تھی، اختلافی مسائل پر طالب علمانہ بحث و گفتگو اور مناظرہ رہتا اور چونکہ نوعمری اور نوجوانی تھی گفتگو میں تیزی اور تندی بھی پیدا ہو جاتی اور مناظرہ کی بھی ٹھن جاتی

(۱) اس اندازہ کی بنیاد یہ ہے کہ حضرت نے کئی بار اس کا تذکرہ فرمایا کہ جب ہم طالب علموں کے درمیان حنفیوں اور اہل حدیث کے مابہ النزاع مسائل پر بہت بحث ہوئی تو ہم نے آپس میں یہ طے کیا کہ ان مسائل پر فریقین کے دو جید عالموں کا مناظرہ ہو جائے تاکہ اس قضیہ کا کلی طور پر تصفیہ ہو جائے ہم نے اپنی طرف سے مولانا انور شاہ صاحب کو جو مدرسہ امینیہ میں حدیث کے استاد تھے طے کیا اور شاہ صاحب نے اسکو منظور بھی فرمالیا ہمارے اہل حدیث ساتھیوں نے مولانا عبدالوہاب صاحب (صدر بازار) کو تیار کیا، لیکن کسی وجہ سے مناظرہ کی نوبت نہیں آئی

مولوی عبدالرحمٰن صاحب سے زیادہ بے تکلفی اور صحبت تھی، حضرت اکثر تذکرہ فرماتے تھے کہ ہم آپس میں لڑتے بھی بہت تھے اور ایک دوسرے کو چھوڑتے بھی نہیں تھے۔

اس وقت میاں سید نذیر حسین صاحب کا درس اہل حدیث طلبا رکا مرکز و مرجع بنا ہوا تھا حضرت فرماتے تھے کہ میں ان کے درس میں شریک ہوا مگر دل نہ لگا، مدرسہ امینیہ کے حدیث کے اسباق میں بھی جو اس وقت سنہری مسجد میں تھا شرکت کی، وہاں مولانا انور شاہ صاحب کے درس کی تقریر سنی تو معلوم ہوا کہ حنفیوں کے پاس بھی دلائل ہیں، مدرسہ حسین بخش میں مولانا عبدالعلیؒ[1] صاحب کے اسباق میں بھی کبھی کبھی شرکت کی نوبت آئی۔

اس وقت دہلی فقہی مسائل اور عقائد کے مناظرہ اور مجادلہ کا میدان بنا ہوا تھا، جامع مسجد مختلف الخیال واعظین اور مناظرین کا اکھاڑا تھا، ہر فرقہ والا دوسرے فرقہ والے کی شدومد کے ساتھ تردید کرتا تھا، آپ ان سب مجلسوں میں شریک ہوتے اور سب کی باتوں کو سنتے، فرمایا کرتے تھے کہ ایک فریق کی بات سن کر معلوم ہوتا کہ اس کے علاوہ سب مشرک ہیں، دوسرا فریق پہلے فریق کو کافر کہتا، ان متضاد باتوں کے سننے سے آپ کی طبیعت میں خود بخود ایک جامعیت اور اعتدال کا رنگ پیدا ہو گیا اور احساس ہوا کہ سب مبالغہ اور تشدد سے کام لیتے ہیں، اور اپنے سوا دوسرے کو بالکل بر سر غلط اور باطل پرست سمجھتے ہیں، ایک مرتبہ فرمایا۔

"ہم جب اپنی بستی میں رہتے تھے تو صرف ایک ہی مذہب جانتے تھے لیکن جب ہم دلّی پہونچے تو دیکھا کئی مذاہب ہیں، پہلے ہم ایک فریق کے پاس پہونچے، انھوں نے کہا یہ سب شرک ہے اور تم سب مشرک ہو، ہم نے کہا

(۱) آپ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے شاگرد تھے۔

ادھو یہ تو بڑی مشکل ہوئی، پھر ہم دوسرے فریق کے پاس پہونچے تو انھوں نے کہا وہ تو کافر ہے، ہم نے کہا، اب بھی کافر ہیں؟ آخر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ ہمیں اپنے حضرات کے پاس پہونچا دیا جس سے دین کی حقیقت معلوم ہوئی، ہم نے تو سمجھا تھا کہ جنت کوئی آسان چیز ہے لیکن علمائے کرام نے تو بہت مشکل بنا رکھی ہے"۔[1]

فرماتے کہ جب کبھی طبیعت میں بے چینی اور حق کی تلاش کا جذبہ پیدا ہوتا تو دو رکعت نماز نفل پڑھتا اور الحاح کے ساتھ دعا کرتا فوراً طبیعت سرد ہو جاتی اور اطمینان ہو جاتا،

استغناء اور احتیاط

دہلی میں آپ مدرسہ سے کھانا نہیں لیتے تھے اسوقت معمول تھا کہ جامع مسجد میں سحری تک قرآن شریف ہوتا تھا، سحری میں رؤسا کے کھانے آتے تھے، وہ ضرورت سے زائد ہوتے تھے معمول تھا کہ دو چار آدمی ان کے قریب اس امید میں بیٹھے رہتے تھے اور وہ رؤسا ان کو شریک کر لیتے تھے، آپ کا معمول تھا کہ اس وقت مسجد کے ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتے، بعض حضرات اندر آکر اصرار سے لے جاتے اور زبردستی دو چار لقمے کھلا دیتے۔

مختلف مقامات پر تعلیم کا سلسلہ

پانی پت، سہارنپور، رام پور، دہلی کے علاوہ آپ نے بعض دوسرے مقامات پر بھی جہاں کے اساتذہ یا کسی خاص فن یا درس کی شہرت تھی تعلیم حاصل کی، ان میں سے آپ اکثر گلاوٹھی (ضلع بلند شہر) اور بانس بریلی کا تذکرہ فرماتے تھے۔

(۱) از ملفوظات مرتبہ مولانا سعید احمد صاحب ڈونگوی۔

بریلی بریلی میں آپ نے مدرسہ مصباح التہذیب[1] میں پڑھا، وہاں اس زمانہ میں مولوی محمد دین صاحب پنجابی پڑھایا کرتے تھے، قیام پہلے مدرسہ کی چھت پر رہا اسکے بعد کلھاڑا پیر کی مسجد میں جو قبرستان کے نزدیک ہے، اس کے بعد مولوی خدا یار خاں کے یہاں آپ نے فلسفہ کی کئی کتابیں اور ہیئت میں شرح چغمنی اور کتاب الاُکر، کتاب المناظر اور غالباً الافق المبین پڑھی[2]۔ بریلی کا زمانۂ قیام ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ یا ۱۹۰۲ء) ہے۔

ملازمت ان مختلف مقامات پر علوم کی تحصیل اور درسیات کی تکمیل کرکے فراغت حاصل کی، شاید اس کا سلسلہ بریلی میں تکمیل کو پہونچا، وہیں بریلی قدیم کے ایک رئیس مولوی خدا یار خاں کے ہاں ان کے صاحبزادے مقتدا یار خاں کو پڑھانے پر ملازم[3] ہوئے اپنی تنخواہ میں سے وقتاً فوقتاً پس انداز کرتے، اسی زمانہ میں اپنے والد صاحب کی خدمت میں اسّی روپئے بھیجے اسی کے آگے پیچھے آپ نے دس گیارہ مہینے مولوی احمد رضا خاں صاحب کے ہاں ان کے لڑکوں غالباً مولوی مصطفٰے رضا خاں صاحب وغیرہ کی تعلیم کے سلسلہ میں قیام کیا۔ آٹھ روپئے تنخواہ[4] تھی۔ فرماتے تھے کہ وہ جس طرح علماء دیوبند کی تردید و مذمت کرتے

---

(۱) یہ بریلی کا بڑا قدیم مدرسہ ہے، پہلے اس کا نام مصباح التہذیب تھا جو تاریخی نام ہے، بعد میں مصباح العلوم ہوگیا بریلی کے ایک رئیس حافظ جعفر خاں صاحب نے ۱۲۸۰ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تحریک سے قائم کیا اور مولانا نے دیوبند سے بریلی آکر حافظ صاحب کی کوٹھی میں اس مدرسہ کا افتتاح فرمایا، مولانا خلیل احمد صاحب نے بھی اس مدرسہ میں پڑھایا ہے ان کے زمانۂ قیام تک یہ مدرسہ حافظ جعفر خاں صاحب کی کوٹھی میں رہا، اسکے بعد داری دروازہ کی مسجد میں جاری رہا، یہ مدرسہ اب بھی بریلی میں اسی نام سے قائم ہے (۲) روایت حکیم صدیق احمد صاحب، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ آپ نے یہ کتابیں ان کے والد جناب حکیم مختار احمد صاحب سے پڑھی تھیں۔
(۳) ایک مرتبہ بریلی کے سفر میں حضرت ان سے ملنے ان کے مکان پر تشریف لے گئے، راقم سطور اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی بھی ہمرکاب تھے حضرت اس پرانے زمانہ اور گزشتہ واقعات کو یاد فرماتے رہے، مقتدا یار خاں صاحب کا انتقال ہوگیا ہے اور ان کے صاحبزادے اور اہل خاندان پاکستان منتقل ہوگئے۔ (۴) مسودہ صوفی محمد حسین صاحب

تھے اور اتنی حقانیت اور عظمت ثابت کرتے، اس سے طبیعت کھٹی ہوئی اور اندازہ ہوا کہ یہ سب نفسانیت اور حُب جاہ ہے، مولانا احمد رضا خاں صاحب کے بعض معاصر علماء کے ساتھ مناظرے بھی دیکھے، اس وقت رامپور اور بریلی کے بڑے بڑے علماء تشریف لاتے تھے، مارہرہ کے ایک شیخ الطریقت بھی جن کے خاندان میں مولانا احمد رضا خاں صاحب بیعت تھے تشریف لاتے تھے، آپ اکثر ان لوگوں کے واقعات اور اپنے اس وقت کے تأثرات جن سے آپ کی سلامت طبع، حق پسندی اور قوت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، بیان فرمایا کرتے تھے، بریلی کے ایک سفر میں یہ بھی فرمایا کہ میرا کبھی یہاں جی نہیں لگا۔

دوران ملازمت میں والد صاحب کے انتقال کی خبر ملی، ان کے انتقال کے دو ماہ بعد ملازمت چھوڑ دی۔

بریلی میں حکیم مختار احمد صاحب[1] سے طب کی کتابیں شرح اسباب تک پڑھیں آپ کی نیت تھی کہ معاش کے لئے کوئی ایسا سلسلہ اختیار فرمائیں جس میں تھوڑا وقت صرف کر کے گزارا ہو جائے، غالباً کسی دوست یا رفیق درس کے تعلق سے آپ نے افضل گڑھ (ضلع بجنور) کا سفر کیا اور وہاں چھ مہینے کے قریب مطب کا مشغلہ رہا۔

---

(۱) حکیم صاحب اطباء قدیم کی یادگار اور طب یونانی کے آخری ماہرین فن میں سے تھے، بریلی میں خدمت خلق میں مصروف تھے، وطن امروہہ تھا، سنہ میں انتقال ہوا، حکیم صدیق احمد صاحب آپ کے صاحبزادے حضرت ہی سے تعلق رکھتے ہیں،

دوسرا باب (۲)

بیچینی اور روحانی انجذاب، مرشد کا انتخاب اور رائپور کی حاضری

اے شہ عشاق شیریں داستاں — باز گو از بے نشان من نشاں
صرف و نحو و منطقم را سوختی — آتش عشق خدا افروختی (۱)

بیچینی اور طلب حصول یقین، ترقی روحانی اور کامیابی کے راستہ کی ابتدا اکثر بے چینی، اضطراب اور اندرونی طلب اور سوال سے ہوتی ہے، مردانِ خدا اور کاملین راہ کی سوانح اور حالات میں اسکی مثالیں بکثرت ملتی ہیں،

حضرت کے چچازاد بھائی مولوی سعید اللہ صاحب فرزند مولانا کلیم اللہ صاحب بڑے ذہین اور ذی استعداد عالم تھے، وہ عرصہ تک مانگرول میں شیخ صاحب مانگرول کے مصاحب رہے تھے، وہاں مختلف الخیال لوگوں کی صحبت، طبیعت کی تیزی اور غلط ماحول کے اثر سے ان کی طبیعت میں اضطراب پیدا ہوگیا تھا، فرماتے تھے کہ انکی صحبت سے میری طبیعت متأثر ہوئی اور بعض مرتبہ شکوک پیدا ہونے لگے۔

---

(۱) یہ دو شعر ہیں جو اپنے مرض وفات میں حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی اپنے مرشد حضرت شاہ محمد آفاق صاحب کی یاد میں پڑھا کرتے تھے، پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں اپنے مرشد کے نام کی رعایت سے "اے شہ آفاق" تھا یہاں اس میں خفیف سی ترمیم کردی گئی ہے ۱۲

فرماتے تھے کہ جس زمانہ میں شکوک کا حملہ ہوتا تھا صحابۂ کرام کے حالات پڑھ کر بڑا اطمینان پیدا ہوتا، یقین ہو جاتا کہ یہ لوگ حق پر تھے اور اسلام اللہ تعالیٰ کا مقبول دین ہے حضرت کی زندگی میں صحابۂ کرام کے حالات کا اثر اخیر تک رہا، انھیں کے حالات کو اپنا مرشد سمجھتے تھے اور ان کتابوں کو اپنا بڑا محسن مانتے تھے جن کے ذریعہ صحابہ کرامؓ کی عظمت کا نقش اور اسلام کی حقانیت کا یقین پیدا ہوا۔(۱)

انھیں دنوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے مجاہدین کے حالات کا کوئی مجموعہ کہیں سے مل گیا۔(۲) ان حضرات کے ایمان افروز حالات پڑھ کر اور ان کے اخلاص اور قوت ایمانی کو دیکھ کر قلب کو تقویت اور سکینت حاصل ہوئی۔

وجدانی یقین اور شرح صدر

اس زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوے اور دعوت کا بڑا غلغلہ تھا پنجاب میں خاص طور پر مسلمانوں کی کم بستیاں اس چرچے اور تذکرہ سے خالی تھیں، ان کی کتابیں اور رسائل مسلمانوں میں پڑھے جاتے تھے اور ان پر بحث و گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا تھا، حضرت کے وطن کے قریب ہی بھیرہ ہے، وہاں کے ایک عالم جو حضرت کے خاندانی بزرگوں کے شاگرد بھی تھے، حکیم نورالدین مرزا صاحب کے خاص معتقدین اور معاونین میں سے تھے اور ان کی نصرت اور رفاقت کے لئے مستقل طور پر قادیان میں سکونت پذیر تھے، مرزا صاحب کے عنداللہ مقبول اور مستجاب الدعوات ہونے کا ان کے معتقدین اور حلقۂ اثر میں عام چرچا تھا، حضرت نے مرزا صاحب کی تصنیفات میں کہیں پڑھا تھا کہ

(۱) غالباً اسی جذبہ کے ماتحت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے صحابہ کرام کے حالات لکھنے کی فرمائش کی جس کی تعمیل حکایات صحابہؓ کی مقبول و مشہور کتاب کی شکل میں ہوئی (۲) غالباً سوانح احمدی تھی حضرت اکثر مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری کی کتاب اور ان کا تذکرہ فرماتے تھے،

ان کو خدا کی طرف سے الہام ہوا ہے کہ اجیب کل دعائك الا فی شرکائك (میں تمہاری تمام دعائیں قبول کرونگا، سوا ان دعاؤں کے جو تمہارے شرکت داروں کے بارے میں ہوں) حضرت نے مرزا صاحب کو اسی الہام اور وعدہ کا حوالہ دے کر افضل گڑھ سے خط لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ میری آپ سے کسی طرح کی بھی شرکت نہیں ہے اسلئے آپ میری ہدایت اور شرح صدر کیلئے دعا کریں وہاں سے مولوی عبدالکریم صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا جواب ملا کہ تمہارا خط پہونچا تمہارے لئے خوب دعا کرائی گئی، تم کبھی کبھی اسکی یاد دہانی کر دیا کرو، حضرت فرماتے تھے کہ اس زمانہ میں ایک پیسہ کا کارڈ تھا، میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک کارڈ دعا کی درخواست کا ڈال دیتا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب نے ایک دفعہ مرزائیوں کی کتابیں منگوائی تھیں اس غرض سے کہ ان کی تردید کریں گے، میں نے بھی دیکھیں، قلب پر اتنا اثر ہوا کہ اس طرف میلان ہو گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ سچے ہیں[1]۔

اکثر فرماتے تھے کہ جب کبھی اس طرح کی کشمکش پیدا ہوتی اور طبیعت میں شدت سے اس کا تقاضا پیدا ہوتا کہ حق کیا ہے؟ تو میں دو رکعت نفل پڑھ کر الحاح کے ساتھ دعا کرتا، طبیعت اس طرف سے سرد ہو جاتی اور قلب میں ایک سکون پیدا ہو جاتا کبھی کبھی فرماتے تھے کہ میرے مالک کا یہ بڑا فضل ہے کہ بغیر دلائل کے حق واضح ہوتا گیا[2]۔

---

(۱) ملفوظات مرتبہ مولوی علی احمد صاحب مرحوم مجلس ۰ رجمادی الثانی ۱۳۷۶ھ؁ / ۱۹۵۶ء کوٹھی مولوی عبدالحمید صاحب لاہور

(۲) روایت مولانا عبدالوحید صاحب۔ اس قسم کے تجربات اور عارضی تاثرات اولیائے کاملین اور اصحاب علم و یقین کو زمانہ سابق میں بکثرت پیش آئے ہیں بالآخر اللہ تبارک و تعالےٰ نے جو مربی حقیقی اور حکیم مطلق ہے یقین و معرفت کے اعلیٰ درجہ پر پہونچایا، ان ذاتی تجربات اور درمیانی تاثرات کے بعد جو یقین اور اذعان حاصل ہوتا ہے وہ بڑا محکم اور بے تکلف ہوتا ہے، اس قسم کے واقعات کا ذکر حضرت رحمۃ اللہ علیہ احسان خداوندی کے طور پر اور یہ ثابت کرنے کے لئے فرماتے تھے کہ مربی مطلق اور ہادی برحق صرف وہی ذات ہے، اور دلائل کا راستہ طویل پُر پیچ اور ناکہ ہے محفوظ و بے خطر راستہ وجدانی یقین اور شرح صدر کا ہے اللہ یجتبی الیہ من یشاء ویہدی الیہ من ینیب۔

انجذاب الی اللہ

بریلی وغیرہ کے قیام کے دوران میں طبیعت کی بےچینی اپنے ماحول اور مشاغل سے بے اطمینانی کی کیفیت اور قلبی کشمکش اور زیادہ بڑھ گئی، اس زمانہ میں امام غزالیؒ کی مشہور کتاب "المنقذ من الضلال" کا اردو ترجمہ جو "لکھر امام غزالیؒ" کے نام سے چھپا تھا کہیں سے مل گیا، اس کتاب میں امام غزالی نے اپنی سرگزشت سنائی ہے کہ کس طرح مدرسہ نظامیہ کی صدر مدرسی اور علمی شہرت ومقبولیت کے بام عروج پر پہنچنے کے باوجود انکے دل میں کھٹک پیدا ہوئی اور اس کا بڑی شدت سے احساس ہوا کہ وہ جو کچھ پڑھ پڑھا رہے ہیں وہ محض لفاظی اور لسانی ہے اور جس کو دینی مشغلہ سمجھ رہے ہیں وہ محض دنیاداری اور دنیا طلبی ہے، یقین کا سررشتہ انکے ہاتھ سے چھٹا ہوا ہے اور وہ حقیقی علم ومعرفت کی دولت سے محروم ہیں اس احساس کا ان پر اتنا غلبہ ہوا کہ ان کی زبان بند ہوگئی، اشتہا بالکل مفقود ہوگئی اور صحت جواب دے گئی، درس وتدریس کا سلسلہ ان کو ملمع سازی معلوم ہونے لگا اور طبیعت یکسر اس سے اچاٹ ہوگئی، یہ کیفیت اتنی بڑھی کہ وہ اس سب علمی جاہ ومنزلت کو لات مار کر یقین کی تلاش میں بغداد سے پیادہ پا نکل کھڑے ہوئے اور بالآخر عرصہ کی صحرانوردی اور مجاہدہ کے بعد یقین کی دولت سے مالامال ہوئے اور ان کو نظر آیا کہ صحیح راستہ صوفیائے کرام کا راستہ ہے جو اپنی سیرت واخلاق میں نبوت کے پرتو کامل ہیں، ان حالات وماحول اور اس قلبی کیفیت میں جس سے آپ دوچار تھے، اس کتاب نے ایک رہبر کامل کا کام دیا اور اسی "یوسف گم گشتہ" کی تلاش میں لگ جانے کا فیصلہ کر دیا جس کی تلاش کے لئے امام غزالیؒ نے سفر کیا تھا اور جس کے بغیر علم بےمعنی اور زندگی بے حاصل معلوم ہوتی تھی۔

افضل گڑھ کے قیام کے دوران میں یہ بےچینی اور ذہنی اور قلبی کشمکش اور زیادہ بڑھ گئی، وہیں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی مثنوی "تحفۃ العشاق" کہیں سے مل گئی

فرماتے تھے کہ اس نے طبیعت میں اور بےچینی اور عشق کی شورش پیدا کر دی، چھ مہینے تک یہ معمول رہا کہ قبرستان چلا جاتا اور روتا رہتا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے قدموں میں

اس وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا آفتاب رشد و ہدایت اپنے پورے عروج پر تھا اور وہی شیخ الکل کی حیثیت رکھتے تھے، حضرت حاجی صاحبؒ کی کتابوں کے مطالعہ نے اور درود محبت اور اتباع سنت کی دولت رکھنے والے سلسلوں سے فطری مناسبت نے انھیں کے سلسلہ کے مشائخ کی طرف رجوع ہونے کا مشورہ دیا۔

اس زمانہ میں حضرت گنگوہیؒ کے ممتاز خلیفہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائپوریؒ کے دَورے مشرقی پنجاب میں ہوا کرتے تھے، حضرت کے چند مریدین سے بھی آپ کی ملاقات ہو چکی تھی، آپ نے افضل گڑھ سے حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کی خدمت میں خط لکھا اور عرض کیا کہ میں بیعت کے واسطے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں، حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ "حدیث میں آتا ہے" المستشار مؤتمن" میں آپ کو لکھتا ہوں کہ میں کوئی چیز نہیں ہوں آپ میں تو طلب ہے، مجھ میں یہ بھی نہیں، آپ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی طرف رجوع کریں"

حضرت فرماتے تھے کہ میں یہ خط پڑھ کر پھڑک گیا کہ اخلاص اور بےنفسی اس کو کہتے ہیں، حضرت ایک مرتبہ پانی پت جاتے ہوئے گنگوہ میں حضرت مولانا کی زیارت کر چکے تھے، آپ کی جلالت شان اور آپ کے علو منزلت سے ناواقف نہیں تھے، پانی پت میں بعض دہقانی مریدوں کا بدعات سے تنفر اور ان کی پختگی اور استقامت دیکھ کر آپ کی تاثیر صحبت اور قوت نسبت کے معتقد بھی ہو گئے تھے لیکن قلب سلیم نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک ایسے مرجع خلائق و شہرہ آفاق شیخ کی خدمت میں جو اپنی عمر و صحت کے آخری مرحلہ پر ہے اور جو اپنے وقت کے ناموَر ترین علماء اور

مشائخ کا مرجع بنا ہوا ہے، مجھ جیسا مبتدی اور نو وارد طالب کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے اور کس طرح اپنی اصلاح باطن اور تربیت کی طرف شیخ کی خصوصی توجہات مبذول کر سکتا ہے اگر آپ میں حُبِ جاہ و ترفع کا جذبہ ہوتا تو آپ شیخ المشائخ کو چھوڑ کر اس کے خلفاء منتسبین کی طرف متوجہ نہ ہوتے لیکن اللہ تعالٰی کی یہ خاص رہبری اور آپ کا اخلاص تھا کہ آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ یہاں علوِ سند اور قلت وسائط کا سوال نہیں ہے حقیقی نفع اور مناسبت کا سوال ہے اس لئے آپ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوریؒ ہی کا دامن پکڑنا ہے اور انھیں کے قدموں میں رہنا ہے، آپ نے پھر حضرت کو خط لکھا اور عرض کیا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو جو کچھ ملا حضرت گنگوہیؒ سے ملا مگر میرا رجحان آپ کی طرف ہے، میری طرف سے اگر مہمان داری کی فکر ہے تو میرے حقوق حضرت کے ذمہ نہیں ہیں، میں اپنے قیام و طعام کا خود ذمہ دار ہوں، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ یہ خط دیکھ کر بہت خوش ہوئے، لوگوں کو یہ خط دکھایا اور فرمایا دیکھو یہ ہیں طالب۔

رائے پور میں

آپ رائے پور حاضر ہوئے[1] اور بیعت کی درخواست کی، حضرت نے فرمایا جلدی کیا ہے، استخارہ کر لو، چونکہ آپ کو گھر جانا تھا فرمایا گھر ہو آؤ پھر بیعت کر لینا۔ جب آپ وطن کو روانہ ہوئے تو حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ گنگوہ حاضر ہونے کیلئے روانہ ہو رہے تھے، حضرت گنگوہیؒ کے فرزند ارجمند حکیم مسعود احمد صاحب کا ولیمہ تھا۔

ذکر کی تلقین اور مکان کی واپسی

حضرت نے وطن جا کر یکسوئی کے ساتھ پڑھنے کو

---

(۱) حضرت نے رائے پور حاضر ہونے کا سنہ تعین کے ساتھ ذکر نہیں فرمایا، لیکن کئی موقعوں پر حضرت کی خدمت میں چودہ سال رہنے کا تذکرہ فرمایا، حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کی وفات ۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ میں ہوئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ رائے پور پہلی بار ۱۳۲۲ھ یا ۱۳۲۳ھ کے شروع میں حاضر ہوئے ہوں گے اور ۱۳۲۳ھ سے مستقل قیام رہا۔

فرمادیا، آپ نے ڈھڈیاں پہونچ کر گاؤں سے باہر ایک مسجد میں کسی ایک اسم " کا ذکر شروع کیا، اس زمانہ کی حلاوت ولذت، یکسوئی، ماسوی اللہ سے انقطاع اور اللہ تعالےٰ کے افضال والطاف کو ہمیشہ بڑی لذت سے یاد فرماتے تھے، فرماتے تھے کہ جو بات اس زمانہ میں حاصل ہوئی، پھر حاصل نہیں ہوئی، فرماتے تھے کہ دیکھا جو کچھ دیکھا، پایا جو کچھ پایا، وہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔

رائے پور کا عزم اور قادیان کا سفر

ڈھڈیاں سے فارغ ہو کر رائپور کا عزم کیا تو واپسی کے لئے کرایہ نہ تھا اور گھر میں بھی نہ تھا، آپ کے بھائی عبدالعزیز صاحب مرحوم کے پاس ایک بکری تھی اسی کو فروخت کر کے وہ روپئے حضرت کو دیے فرمایا کہ ہم نے تو نیت کرلی تھی کہ پیدل ہی رائے پور جائیں گے مگر بھائی نے احسان کیا اور ہم جلد ہی رائے پور پہونچ گئے۔

رائے پور کا قصد فرمایا تو آپ کے چچازاد بھائی مولوی سعید اللہ صاحب کے بیٹے مولوی امام الدین نے جو بیمار تھے فرمائش کی کہ راستہ میں ہمیں حکیم نورالدین صاحب کو دکھاتے چلو، والد صاحب کے شاگرد حافظ روشن دین ساتھ تھے، آپ کے ایک ساتھی مولوی صدیق صاحب نے جو اہل حدیث تھے اور آپ کے ساتھ دہلی میں اکٹھے رہے تھے، حکیم صاحب سے آپ کا ذکر کیا تھا اور تعارف کرایا تھا کہ آپ کے استادوں کے خاندان میں سے ہیں، حکیم نورالدین صاحب نے لکھا بھی تھا کہ تم یہاں ایک مرتبہ مرزا صاحب کے پاس آجاؤ، غرض آپ قادیان گئے اور سات آٹھ روز حکیم صاحب ہی کے مہمان رہے ایک مرتبہ راقم سطور کے اس سوال پر کہ حکیم صاحب مخلص تھے ؟ آپ نے قادیان کے سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے تفصیل سے اس کا قصہ سنایا، ارشاد فرمایا۔

"مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے والد امام الدین جب بیمار ہوئے تو مجھ سے کہا کہ مجھے حکیم نورالدین کے پاس لے چلو، میں لے گیا عصر کے بعد ان کی عام مجلس ہوا کرتی تھی، قسم قسم کے لوگ آئے، پوچھتے پاچھتے رہے، جب تنہائی ہوئی تو میں نے پوچھا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ حق صرف ہمارے ہی پاس ہے اور باقی سب باطل ہیں اور قرآن ان کے دلوں میں نہیں اترا ہے تو اسکی کیا دلیل ہے کہ آپ ہی حق پر ہیں؟ اور دوسرے باطل پر، انھوں نے کہا کہ ہمیں انوار نظر آتے ہیں اور کہا کہ مجھے تو مرزا صاحب نے فرمایا تھا کہ آریوں اور عیسائیوں کے رد میں ایک کتاب لکھو، میں نے لکھی![1] میرا سلوک تو اسی میں طے ہو گیا۔ تو میں نے کہا کہ انوار تو دوسروں کو بھی نظر آتے ہیں حتیٰ کہ ہندوؤں کو بھی، وہ خاموش ہو گئے، تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ ہم سے مکالمۂ باری ہوتا ہے، اس پر میں خاموش ہو گیا کیونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ دوسروں کو مکالمۂ باری ہوتا ہے یا نہیں میں چونکہ رائپور سے ہو کر گیا تھا میں نے اتنا کہا کہ تم حق پر ہو یا نہ ہو، بہرحال جس شخص کو میں دیکھ کر آیا ہوں وہ ضرور باطل پر نہیں ہے یقیناً حق پر ہے، میں نے حضرت کو قرآن مجید پڑھتے بھی دیکھا تھا، تہجد میں طویل تلاوت فرماتے تھے، کبھی رو رہے ہیں، جب عذاب کا ذکر آتا تو رو رو کر استغفار پڑھ رہے ہیں، ہاتھ جوڑ رہے ہیں، اسی طرح جب آیات رحمت کا ذکر آتا تو خوش ہو رہے ہیں اور سکوت ہے، میں نے سمجھا کہ یہ بھی غلط ہے کہ دوسروں کے دلوں میں قرآن نہیں اترا، اگر میں نے حضرت کو نہ دیکھا ہوتا تو میں تو قادیانی بن گیا ہوتا"[2]

(۱) کتاب نورالدین مراد ہے۔ (۲) ملفوظات مرتبہ مولوی علی احمد صاحب مرحوم مجلس ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶ھ ۱۹۵۶ء کوٹھی صوفی عبدالحمید صاحب لاہور۔

حکیم صاحب کی مجلس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا میں دیکھتا تھا کہ کچھ وقفہ کے بعد وہ بڑے درد سے لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ o اس طرح پڑھتے تھے کہ دل کھنچتا تھا، مجھے خیال ہوتا تھا کہ ان کو ایسی رقت اور انابت ہوتی ہے، یہ کیسے ضلالت پر ہو سکتے ہیں؟ مگر اسی کے ساتھ دل میں آتا تھا کہ میں جس اللہ کے بندے کو دیکھ کر آیا ہوں اگر اللہ تعالےٰ رحمٰن و رحیم ہے اور یقیناً ہے تو اس کو ضلالت میں نہیں چھوڑ سکتا، اس سفر میں مرزا صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، فرماتے تھے کہ میں ان کے امام کے پیچھے بھی نماز پڑھتا تھا اور اپنی الگ بھی پڑھ لیتا تھا۔

دوبارہ رائے پور میں

قادیان سے آپ کے ہمراہی وطن کو واپس ہوئے اور آپ نے سہارنپور کا قصد فرمایا، جہاں سے علیحدہ ہونا تھا وہاں سے سہارنپور کا ٹکٹ لے کر بقیہ رقم انھیں کو دے دی، سارا راستہ کھانا کھانے کی نوبت نہیں آئی، جب سہارنپور پہونچے تو کھانا کھائے دو چار وقت گزر چکے تھے، سہارنپور کسی سے نہ ملے اور پیدل ہی رائپور روانہ ہو گئے، منھ کا مزا سخت تلخ تھا، راستہ میں ایک مسجد میں ذرا سی دیر کیلئے آرام فرمایا تو ایک آدمی نے آکر پوچھا کہ میاں کہاں جاؤ گے؟ فرمایا میاں مسافر ہیں، ادھر سے آئے ہیں ادھر کو جائیں گے تم سے کیا؟ آخر حضرت کی خدمت میں بخیریت پہونچ گئے، حضرت نے ذکر کی کیفیت اور اثر پوچھا، آپ نے کسر نفسی سے فرمایا، حضرت میں تو غبی ہوں اپنے اندر کچھ نہیں پاتا، پھر کیفیت عرض کی، فرمایا الحمد للہ، اسی حاضری میں بیعت سے مشرف ہوئے اور قیام کا ارادہ فرمالیا۔

حضرت نے دریافت فرمایا کہ مولوی صاحب آپ کے پیچھے کتنے لوگ ہیں؟

فرمایا والدہ، بیوی[1] اور دو بھائی اور دو بہنیں فرمایا یہ تو بڑا کنبہ ہے، ہمارا تو جی چاہتا تھا کہ ہم آپ اکٹھے رہتے، عرض کیا کہ حضرت سب کے ہوتے ہوئے بھی میرا کوئی نہیں ہے میں تو یہ نیت لے کر آیا تھا کہ ساتھ ہی رہوں گا۔

فرمایا کہ ایک مرتبہ موقع دیکھ کر عرض کیا کہ حضرت، قادیانی انوار کا دعویٰ کرتے ہیں ان کو نماز وغیرہ میں بہت حالات اور کیفیات پیش آتے ہیں اور گریہ و خشیت کا غلبہ ہوتا ہے اس کا کیا سبب ہے؟ حضرت سنبھل کر بیٹھ گئے اور جوش سے فرمایا، مولوی صاحب سنو! وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى[2]، حضرت کچھ اسکی تشریح فرمانا چاہتے تھے میں نے کہا حضرت بس میں سمجھ گیا، اس کے بعد پھر اس مسئلہ میں کبھی کوئی کھٹک نہیں ہوئی۔

---

(۱) رائے پور ہی کے زمانۂ قیام میں اہلیہ کے انتقال کی اطلاع ملی، آپ نے اطلاعی خط حضرت کی خدمت میں پیش کیا، حضرت نے کچھ ایسے کلمات فرمائے جن سے مترشح ہوتا تھا کہ حکمت الٰہی یہی ہے اور اللہ تعالیٰ کسی دوسرے کام کے لئے یکسو بنانا چاہتا ہے، خود آپ پر رائے پور حاضری کی مسرت اس حزن پر غالب تھی، (۲) آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ضلالت کی صورت میں بھی جو لوگ مجاہدے اور محنت میں لگے رہتے ہیں ان کے لئے بھی ایسی صورتیں اور آثار ظاہر ہوتے ہیں جن سے ان کو اپنے مسلک کی تائید اور اس پر اطمینان حاصل ہوتا ہے اور وہ اس میں اور زیادہ پختہ ہو جاتے ہیں، اسی کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں استدراج بھی ہے، اسی لئے محض کشوف و انوار اور کیفیات و آثار حقانیت اور مقبولیت کا معیار نہیں ہے، اصل معیار کتاب و سنت اور مسلک سلف سے مطابقت ہے۔

تیسرا باب (۳)

رائے پور کا قیام، مجاہدہ و ریاضت، تربیت و تکمیل

صدق و اخلاص و درستی باید و عمر دراز
تا قرین حق شود صاحبقرانے در قرن (حکیم سنائی)

رائے پور کا مجاہدہ

رائپور کے قیام میں آپ نے اس عالی ہمتی، جفاکشی اور مجاہدے سے کام لیا، جنکے واقعات اب صرف اولیائے متقدمین کے تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں اور جو انھیں لوگوں کا حصہ ہے جنکی استعداد و جوہر نہایت عالی، عزم و ارادہ نہایت قوی، اور طلب نہایت صادق ہوتی ہے جنکے خمیر میں روز ازل سے عشق کا مادہ ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ کو انھیں اس راہ کے اعلیٰ ترین مقامات اور کمالات پر پہنچا کر ان سے ہدایت اور تربیت خلق کا کام لینا ہوتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ میں رائے پور پہنچ کر سارا دن باغ میں پھرتا رہا کہ میں کس درخت کے پتے کھا کر گزارہ کر سکتا ہوں، آپ نے بعض اوقات کسی درخت کا نام بھی لیا کہ اس کو منتخب کیا تھا، کبھی آپ کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا کہ آپ نے توت کے پتے کھائے ہیں، فرماتے تھے کہ الحمد للہ اسکی بہت کم نوبت آئی، کیونکہ حضرت نے اپنے خادم میاں جی معز الدین سے فرما دیا تھا کہ ان کے کھانے وغیرہ کا خیال رکھنا۔

رائے پور کا وہ دور بڑے مجاہدے اور جفاکشی کا تھا اور یہ سب ان لوگوں کی تکمیل حال کے لئے تھا، جن کی ترقی و پختگی اللہ تعالیٰ کو منظور تھی، لنگر کی روٹی اتنی موٹی اور کچی ہوتی تھی کہ بغیر پانی یا چھاچھ کے حلق سے نہیں اترتی تھی، اخیر زمانہ میں اکثر فرماتے تھے کہ یہ ریاح کا مرض اور ضعف معدہ اسی وقت سے ہے، فرماتے تھے کہ ایک روز روٹی جلی ہوئی تھی، حاجی جانی مطبخ کے مہتمم تھے، میں نے کہا حاجی جی روٹی جلی ہوئی ہے، کہا کہ اچھا کل جلی ہوئی نہ ہوگی، اگلے روز ایک طرف جلی ہوئی، اور دوسری طرف کچی تھی۔ حاجی جانی سے جب دوسری مرتبہ کہا کہ روٹی کچی ہے تو حاجی صاحب نے کہا کہ میاں اگر روٹی کھانے آیا ہے تو کہیں اور چلا جا، مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ حضرت سے نہ کہہ دیں، میں نے اپنے کو بڑی ملامت کی اور دل میں کہا ارے آیا تو ہے تو اپنے نفع کی خاطر اور پھر نخرے کرتا ہے، اور یہ عہد کیا کہ آئندہ کبھی کچھ نہیں کہوں گا، پھر کبھی کوئی شکایت نہیں کی، چودہ[۱۴] سال تک کبھی باسی کبھی کچی، کبھی سوکھی روٹی کھائی اور نام نہیں لیا، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے خود حضرت کے حوالہ سے لکھا ہے:۔

"فرماتے تھے کہ مسلسل دس سال ایسے گزرے ہیں کہ ہم لوگوں کو جو طالبین کی حیثیت سے خانقاہ میں رہتے تھے، ایک دن میں صرف ایک روٹی ٹکی کی ملتی تھی اور وہ بھی درمیان سے بالکل کچی ہوتی تھی، جو صاحب پکانے والے تھے انھیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ روٹی سکی یا نہیں سکی، سالن یا دال ترکاری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، گاؤں سے کسی دن چھاچھ آجاتی تو کھانے پینے کے لحاظ سے ہم خانقاہ والوں کے لئے گویا وہ عید کا دن ہوتا، فرماتے تھے اس علاقہ کے

(یو۔ پی) ہمارے ساتھی تو وہی ایک روٹی آدھی آدھی کرکے دونوں وقت
کھاتے تھے لیکن میں پنجاب کا رہنے والا تھا اس لئے ایک ہی وقت میں
کھالیتا تھا اور دوسرے وقت بس اللہ کا نام؛
فرمایا کہ سوکھی روٹی کھانے کی وجہ سے میرے پیٹ میں درد رہنے لگا اور گڑ گڑاہٹ ہوتی تھی، خیال آیا کہ حضرت سے عرض کرونگا کہ خادم سے فرما دیا جائے کہ روٹی اچھی طرح سینک دیا کرے، پھر خیال آیا کہ اگر حضرت نے فرمایا کہ مولوی صاحب جہاں پکی روٹی ملتی ہو وہاں چلے جاؤ تو پھر کیا ہوگا، خود بخود دل میں خیال آیا تو سونٹھ پیس کر استعمال کی استعمال کے بعد جب ایک مرتبہ استنجے گیا، تو ایک بڑا سا جونک جیسا کیڑا نکلا، میرا خیال ہوا کہ شاید آنت باہر آگئی ہے مگر دیکھا تو کیڑا تھا، اس وقت ڈر گیا بعد میں مفردات میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ سونٹھ کی ایسی ہی خاصیت ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کبھی شفقتاً اپنے دسترخوان پر جب کبھی حضرت شیخ الہندؒ یا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری تشریف لاتے تو بلاتے کہ تم بھی کھانا کھالو، میں اپنے وقت پر جو کچھ مجھے باسی مل جاتا تھا کھالیتا تھا وہ سختی سے معذرت کرتا تھا حضرت شدت سے اصرار کرتے اور فرماتے کہ مولانا میں آپکے نفع کیلئے کہہ رہا ہوں حضرت کی تعمیل ارشاد میں ان حضرات کے ساتھ بیٹھ کر کچھ کھالیتا، اسی طرح جب چائے کی پتی بچ جاتی میں اس کو سکھا لیتا، جو گڑ مدر کھے رکھے پرانا اور خراب ہو جاتا میں اس کا شیرہ پکا کر اس کا شیرہ چائے میں ڈال کر اس سے روٹی کھالیتا تاکہ جلدی لیٹ جاؤں، اور حضرت کے اٹھنے سے پہلے ایک بجے حاضر ہو جاؤں۔
رہائش کے لئے حافظ یوسف علی صاحب کے چھپر میں جہاں ان کی گھوڑی بندھی تھی ان کی اجازت سے ایک طرف صاف کرکے اس پر اپنا بستر لگا دیا، ایک

گھوڑے[1] پر ایک پھٹا ہوا کمبل ملا تھا اس کو دھو کر وہاں بچھا دیا، یہی بستر تھا اس کو اتنی تہیں دیں کہ اس کے سوراخ بند ہوگئے، چودہ سال تک یہی بستر رہا، یہی جائے نماز، خانقاہ میں اس وقت ایک ہی لالٹین تھی وہ حضرت کے حجرہ میں رہتی، دوسری لالٹین تھی ہی نہیں۔

رائے پور میں سانپوں اور بچھوؤں اور حشرات الارض کی کثرت ہے فرماتے تھے کہ میں نے ایک ٹوٹا ہوا بانس اٹھا لیا، وقتاً فوقتاً اس کو بجاتا رہتا تھا کہ کوئی کیڑا یا سانپ نہ آئے، الحمد للہ کہ سوائے ایک مرتبہ کے ایک کھنکھجورہ آیا، کبھی کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔[2]

ایک مرتبہ فرمایا کہ سردی کا موسم تھا، میرے پاس کوئی کپڑا اوڑھنے بچھانے کا نہیں تھا، شام کو مغرب سے لے کر عشار تک وضو کے لئے جہاں پانی گرم ہوتا تھا وہیں بیٹھا رہتا تھا اور اپنا وظیفہ پڑھتا رہتا تھا، پھر نماز عشار کے بعد مسجد کے دروازے بند کر کے مسجد کی چٹائی میں اپنے کو لپیٹ لیتا تھا مگر اس میں کبھی پاؤں اور سر کی طرف سے ہوا آتی تھی، پھر تھوڑی دیر اس چٹائی میں رہ کر اس سے باہر نکل آتا تھا اور ذکر شروع کر دیتا اور ساری رات ذکر کی گرمی سے گزارتا، اسی طرح سارا موسم سردی کا ختم ہوگیا، مگر نہ میں نے کسی سے ذکر کیا اور نہ کسی پر ظاہر ہوا، فرماتے تھے کہ سردی تو اس طرح گزر گئی مگر اس کے بعد کوئی سردی ایسی نہیں آئی جس میں کم از کم ایک رضائی نئی نہ آئی ہو۔[3]

ذکر کا انہماک | ذکر میں شدت سے انہماک تھا، رات میں بہت کم سونے کی نوبت

(۱) کوڑے کرکٹ کا ڈھیر (۲) روایت مولوی عبدالوحید صاحب و دیگر اصحاب، (۳) روایت حضرت شیخ الحدیث۔

آتی، فرماتے تھے کہ نزلہ کے زور کی وجہ سے ایک رومال رکھ لیتا اور ذکر شروع کرتا، رطوبت کی وجہ سے وہ تر ہو جاتا۔[1]

شیخ سے تعلق و محبت خدمت و فنائیت

حضرت کا اپنے شیخ سے وہ عاشقانہ اور والہانہ تعلق تھا

جسکو مناسبت اور ترقی باطن میں ہزار اذکار اور ریاضتوں سے زیادہ دخل ہے، اسکی کیفیت یہ تھی کہ

انبساطِ عید دیدن روئے تو
عیدگاہِ ما غریباں کوئے تو

ذکر کے علاوہ حضرت کی خدمت میں مشغولیت رہتی تھی، ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت کو لٹاکر بدن دباتا تو دیر کے بعد حضرت فرما دیتے کہ جاؤ مولوی صاحب آرام کرو، میں کواڑ بند کر کے اپنی جگہ آجاتا پھر خیال آتا کہ کوئی مکھی منہ پر بیٹھ کر نہ ستاتی ہو، پھر دبے پاؤں آکر دیکھتا اسی طرح آتا جاتا رہتا یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہو جاتا۔[2] فرمایا کہ کبھی حضرت کی خدمت میں بے وضو حاضر نہیں ہوا اور ہر وقت با وضو رہتا تھا۔ حضرت اکثر شفقت اور محبت کا برتاؤ فرماتے: میں کبھی ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ میں تو اپنی اصلاح کے لئے آیا ہوں اور حضرت کی شفقتیں ایسی ہیں کہ جن سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں میں نااہل نہ سمجھا جا رہا ہوں اور مجھے ناکارہ سمجھ کر یہ شفقتیں ہو رہی ہوں۔ اس پر حضرت جواب میں فرماتے نہیں مولوی صاحب، میں تمھاری طرف سے بے خبر نہیں ہوں، اکثر یہ بھی ہوتا کہ بلا کسی قصور کے ڈانٹ دیا کرتے، پھر دیکھتے کہ مجھ پر اس ڈانٹ کا کوئی اثر تو نہیں ہوا، مگر الحمد للہ کہ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔[3]

(۱) روایت مولانا محمد منظور نعمانی (۲) روایت مولانا سعید احمد صاحب ڈونگوی (۳) روایت مولوی عبدالوحید صاحب

رائے پور کی مشغولیت

آپ کا رائے پور کا قیام ایک ایسے عاشق خادم اور ایک ایسے صادق طالب کا قیام تھا جس نے اپنے نفس کی اصلاح حصول مقصود کیلئے مجاہدہ اور شیخ کی خدمت کے سوا دنیا کی کسی غرض اور کسی مطلب سے واسطہ ہی نہیں رکھا تھا، یہ پورا زمانہ اپنی ہستی کو مٹانے اور اپنے کو بھول جانے میں اس طرح گزرا کہ سوائے اس خدمت اور مجاہدہ کے جس کا حال اللہ کو معلوم ہے اور کبھی کبھی خدام کی تربیت اور اصلاح کے لئے آپ کسی بات کا ذکر فرما دیتے اور ان کو معلوم ہو جاتا، نہ اس زمانہ کی کوئی یادگار ہے اور نہ کوئی تاریخی دستاویز، آنے والوں کو بعض اوقات آپ کی طرف توجہ بھی نہیں ہوتی تھی اور بہت سے لوگ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے کہ آپ حضرت کے ایک مخلص خادم اور خانقاہ کے ایک ذاکر شاغل درویش ہیں، ایک مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے ایک ملاقات پر آپ سے فرمایا کہ میں تو رائے پور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ مجھے یاد نہیں، فرمایا حضرت میں آپ کو کیا یاد رہ سکتا تھا، میری وہاں کوئی حیثیت اور اقیاز نہیں تھا، شاید آپ کو یاد ہو کہ حضرت کی خدمت میں ایک خادم بار بار آتا تھا، بدن پر ایک کمری ہوتی تھی اور تہبند باندھے ہوئے، فرمایا ہاں کچھ یاد تو آتا ہے فرمایا میں وہی ہوں[1]۔

گمتھلہ کا قیام

حضرت نے کچھ عرصہ کیلئے آپ کو گمتھلہ[2] بھیج دیا، فرماتے تھے کہ مجھے مدرس بنا کر گمتھلہ بھیجا، مجھے حضرت کی جدائی بہت ہی شاق تھی یہ بھی فکر ہوئی کہ حضرت کسی وجہ سے یہاں سے علٰحدہ فرمانا چاہتے ہیں لیکن میری درخواست کے

---

(۱) روایت مولانا لطیف الرحمٰن صاحب کاندھلوی مرحوم (۲) گمتھلہ ضلع انبالہ میں راجپوت زمینداروں کا ایک قصبہ ہے حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب کی ایک صاحبزادی وہیں بیاہی ہوئی تھیں۔

باوجود حضرت نے حکماً اصرار سے بھیجا، فرمایا کہ مولانا ایک وقت ہوتا ہے کہ ماں اپنے بچے کو سینہ سے چمٹاتی ہے، پھر ایک وقت اس کی طلب کے باوجود اس کو اپنے سے علیحدہ رکھتی ہے، کچھ عرصہ کے بعد واپس بلالیا۔(۱)

قرب و اختصاص

یوں تو حضرت کی جوہر شناس نگاہ نے آپ کے خط کے انداز ہی سے پہچان لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اخلاص اور طلب صادق کا جوہر عطا فرمایا ہے پھر ملاقات پر پورا اندازہ ہوگیا کہ محبت کی چنگاری اور اطاعت و انقیاد کا وہ مادہ ہے جو اس زمانہ میں نایاب اور عام طور پر عنقا ہے لیکن آپ کی خدمت شیخ سے تعلق قلبی، مجاہدہ جفاکشی و بے نفسی سے قرب و اختصاص روز بروز بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ اکثر اہم خدمتیں آپ سے متعلق ہوگئیں، امامت بھی آپ کے سپرد ہوئی جس میں حضرت کے ضعف اور غلبۂ ریاح کی وجہ سے خاص رعایت کرنی پڑتی تھی، سفر حضر میں معیت و رفاقت لازمی ہوگئی، حضرت پر کمال اتباع سنت سے کسی چیز کو اپنی ملک میں رکھنا بہت گراں تھا۔ آپ اپنے کپڑوں کو بھی مولانا کی ملک میں کردیا کرتے تھے اور آپ کی ملک بنا کر استعمال کیا کرتے تھے، باوجود اس کے کہ حضرت نے آپ کو کلیۃً مختار بنا دیا تھا، مگر آپ کبھی ان کو استعمال نہیں کرتے تھے، فرماتے تھے کہ ایک دفعہ جمعہ کو نہر پر کپڑے دھونے گیا، ایک ہی جوڑا کپڑوں کا تھا، اسی کو دھو سکھا کر پہن لینا، اس دن سوکھنے میں ذرا دیر ہوگئی، جمعہ کا وقت ہوگیا، جمعہ میں ہی پڑھایا کرتا تھا، حضرت میرے انتظار میں تھے، جب حاضر ہوا فرمایا، مولانا کہاں رہ گئے تھے؟ میں نے سکوت کیا، دوبارہ پھر دریافت فرمایا، میں نے سکوت کیا، بار بار اصرار سے دریافت فرمایا تو عرض کیا حضرت

(۱) روایت حضرت شیخ الحدیث۔

کپڑے نہیں سوکھے تھے، اس لئے حاضری میں دیر ہوگئی، حضرت نے غصہ سے فرمایا آپ کے پاس میرے کپڑے موجود نہیں ہیں؟ ان کو کیوں نہیں استعمال کرتے، کیا ان کو آگ لگانا ہے، مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے، اس کے باوجود کبھی حضرت کے کپڑے پہننے کی جرأت نہیں ہوئی۔"(۱)

حضرت شاہ عبدالرحیم پنجاب کے طویل دورے فرمایا کرتے تھے، اور مہینوں کا سفر ہوا کرتا تھا، جگہ جگہ قیام فرماتے، رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رہتا، حضرت ہر جگہ ہمرکاب رہتے اور حضرت کی تمام ضروریات کا اہتمام فرماتے، فرمایا کرتے تھے کہ مجھے حضرت سے ایسی مناسبت ہوگئی تھی کہ جو چیز حضرت کے قلب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد ہوتی وہی چیز میرے قلب پر وارد ہوتی، اور جو چیز میرے قلب پر وارد ہوتی حضرت کے قلب پر اس کا ورود ہو جاتا۔(۲)

اصلاح و تکمیل حال

حضرت فرماتے تھے کہ رائے پور ہی کے زمانۂ قیام میں ایک مرتبہ ساری رات عجیب کیفیت رہی دوسری رات بھی اسی طرح گزری تیسری رات ایک قطرۂ نور قلب پر وارد ہوا، حضرت نے فرمایا اب تمہارے دل میں جو رجحان و تقاضا پیدا ہو اس کو من جانب اللہ سمجھو اور اس پر عمل کرو، ایک مرتبہ فرمایا کہ مولانا میری خدمت کی وجہ سے تمہارا بڑا حرج ہوا ہے، اگر میرے بعد یکسو ہو کر اپنے کام میں لگ جاؤ گے تو نقد ذائقہ چکھ لو گے۔(۳)

سفرِ حج

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری نے ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں سفرِ حج کا عزم فرمایا تو آپ ہمرکاب تھے، یہ سفر ادائے فریضۂ حج اور ایک مقبول بارگاہ کی ہمرکابی میں دربار میں حاضری کی سعادت اور اس کے برکات کے علاوہ آپ کی باطنی

(۱) روایت مولوی عبدالوحید صاحب (۲ و ۳) روایت مولوی عبدالجلیل صاحب

ترقیات، شیخ کی رضا اور محبت کے حصول اور اس کے قرب و اختصاص کا خاص ذریعہ ثابت ہوا، اس بابرکت سفر میں آپ کی اطاعت وانقیاد، بے نفسی و قربانی اور شیخ کے ساتھ سچے تعلق کے مزید جوہر کھلے۔ اس سفر میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا موقع فراہم کردیا جس سے خدام اور رفقاء کے حلقہ میں آپ کا امتیاز و انفرادیت کھل کر سامنے آگئی، ایک مرتبہ فرمایا۔

میں ہمیشہ اس بات کے لئے فکرمند رہتا تھا کہ حضرت مجھ سے راضی ہیں یا نہیں؟ اکثر اس سلسلہ میں دعا بھی کیا کرتا تھا کہ یا اللہ میرے حضرت مجھ سے راضی ہوجائیں، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ایسا موقع مرحمت فرمایا جس سے مجھے بھی اطمینان ہوا کہ انشاء اللہ حضرت مجھ سے راضی ہوں گے۔ صورت یہ ہوئی کہ سفر حج میں حضرت کے ہمراہ آپ کے صاحبزادہ حافظ عبدالرشید صاحب بھی تھے، ان کو راستہ میں اسہال شروع ہوگیا اور ضعف اتنا بڑھ گیا کہ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت بھی نہ رہی، چونکہ اسہال مسلسل جاری تھے، اس لئے میں نے اپنے کو ان کی خدمت کے لئے مخصوص کرلیا تھا۔ جب صاحبزادہ صاحب کو اسہال ہوتا تو میں صاف کردیتا تھا اور پاخانہ اپنے ہاتھ سے اٹھاکر سمندر میں ڈال دیتا، انھیں دنوں میں حضرت نے مجھے لٹھے کا کپڑا مرحمت فرمایا تھا کہ اسکے ٹکڑے پھاڑ کر پہلے صفائی کردیا کرو، میں ان ٹکڑوں سے صفائی کرتا پھر ان کو دھوکر پاک کرلیتا، اس کے بعد ان ٹکڑوں کو جمع کرکے سی لیا۔ اسی طرح میں خدمت کرتا رہا، یہاں تک کہ صاحبزادہ کا انتقال ہوگیا[1]۔ حضرت اس خدمت سے

(۱) مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الخلیل میں حضرت مولانا رائپوری کے تذکرہ میں حافظ عبدالرشید صاحب کی علالت کے واقعہ کا تذکرہ کیا ہے لکھا ہے کہ "مدینہ منورہ سے مبنوع ہوکر جہاز میں سوار ہوئے، عدن کے قریب عبدالرشید مرحوم راہی عالم قدس ہوئے"۔ صفحہ ۱۶۴

بہت خوش ہوئے، اکثر اپنی خوشنودی کا اظہار بھی بڑے اہتمام سے فرماتے، میں نے عرض کیا کہ حضرت جس طرح میری تعریف فرماتے ہیں مجھے بہت ہی شرمندگی ہوتی ہے اس پر حضرت نے فرمایا کہ اب انشاء اللہ آپ کے سامنے یہ ذکر نہ کروں گا۔"[1]

اس خدمت و مجاہدہ اور اس محبت و عاشقانہ ادا سے حضرت کے دل میں آپ کی جو وقعت و محبت پیدا ہوئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، بعد میں اللہ تعالٰے نے جس اعزاز و امتیاز اور جس اعتماد و اختصاص سے سرفراز فرمایا اس میں آپ کی اس خود شکنی کو بہت دخل ہے۔

حضرت رائپوری کا مرض وفات

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہٗ کی علالت کا سلسلہ وفات سے پانچ چھ سال پہلے شروع ہو گیا تھا، مرض نے بہت طول کھینچا، آپ نے اس علالت کے زمانہ میں خدمت و محبت کا وہ مظاہرہ کیا جو ایک عاشق صادق ایسے موقع پر کرتا ہے، دواؤں کا استعمال کرانا، کھانا کھلانا، چائے پلانا سب آپ کے ذمہ تھا، اس عرصہ میں آپ کا اصول یہ رہا کہ شیخ کامل کے (جس کا قلب مورد الطاف الٰہی و انوار ربانی ہے) رجحان کو ہر مصلحت پر ترجیح دینا ہے اور اپنی رائے کو اس کی رائے کے مقابلہ میں کالعدم قرار دینا ہے، اس زمانہ میں آپ نے حضرت کی عجیب و غریب باطنی کیفیات، درجۂ یقین و احسان اور شوق لقاء و اشتیاق دیدار کی عجیب و غریب حالت کا مشاہدہ کیا، فرماتے تھے کہ:۔

"اخیر کے رمضان شریف میں دونوں وقت کا کھانا چھوڑ دیا تھا، رات کا کھانا تو ہر رمضان میں پہلے بھی نہیں کھایا کرتے تھے، مگر اس دفعہ دونوں وقت

---

(۱) روایت مولوی عبدالوحید صاحب

سحری وافطاری کا ترک کر دیا تھا، ساری رات صبح تک قرآن شریف ہی سنتے رہتے، سحری کے وقت میں سادی چائے لے جایا کرتا تو عرب کی چھوٹی فنجان میں سے صرف ایک گھونٹ برائے نام ہی لیتے ایک پتلی چپاتی، بالکل پتلی ایسی پتلی کہیں نہیں دیکھی، اس میں سے صرف ایک چھوٹا سا لقمہ توڑتے اور چائے کی ایک چمچی سے حلق میں اتار لیتے، دو تین دن تو میں عرض کرتا رہا کہ حضرت آپ دونوں وقت کچھ نہیں کھاتے ضعف ہو جائے گا، جواب نہیں دیا تیسرے چوتھے روز فرمایا، مولوی صاحب! اللہ تعالیٰ نے جنت کا ذائقہ نصیب فرما دیا ہے اس کھانے کی ضرورت نہیں رہی۔ حالانکہ چہرہ ایسا سرخ تھا جیسے بڑے لذیذ کھانے کھاتے ہیں، موت کا بہت شوق تھا، بڑے ذوق سے فرمایا کرتے کہ جب اللہ تعالیٰ وہ وقت نصیب فرمائے تو سنت کے موافق تجہیز و تکفین کرنا، ایک دن فرمایا کوئی عمل تو ہے نہیں، خبر نہیں موت کا شوق کیوں ہے مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے صدیقین کا مرتبہ عطا فرمایا ہے۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (۱)

فرماتے تھے کہ حضرت نے وفات سے قبل وہ روپیہ جو خرچ کے لئے میرے پاس تھا منگوایا اور تقسیم فرمایا تاکہ ترکہ نہ بنے، اس میں سے مجھے بھی تین سو روپئے عنایت فرمائے مجھے بہت پریشانی ہوئی، تمام دن اسی پریشانی اور غم میں گزرا کہ اگر یہاں بھی یہی روپیہ پیسہ ملنا تھا تو پہلے ہی دکان یا کوئی مزدوری کر لیتے اس سے روپیہ بہت اکٹھا ہو سکتا تھا

(۱) ملفوظات جمع کردہ مولوی علی احمد صاحب مرحوم مجلس ۱۴ر جمادی الثانیہ ۱۳۷۶ھ (مطابق ۱۶ر جنوری ۱۹۵۷ء) کوٹھی صوفی عبدالحمید صاحب لاہور۔

شام کے وقت حضرت نے فرمایا مولوی صاحب تم کچھ پریشان نظر آتے ہو، کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا کہ یہ چیز تو کہیں اور مزدوری کرکے حاصل کر لیتے! فرمایا افسوس نہ کرو، تم فائز المرام ہو، اور یہ بھی فرمایا کہ میرا مال تمھارا مال ہے اور تمھارا مال میرا مال ہے۔(۱)

مرض وفات میں جو لوگ بیعت کے لئے حاضر ہوتے حضرت کے حکم سے آپ ان کو بیعت کراتے، اس زمانہ میں بکثرت لوگ آپ سے بیعت ہوئے۔(۲)

غایت اتحاد

حضرت نے ایک بار آپ سے فرمایا کہ جی تو یہ چاہتا تھا کہ جیسے زندگی میں اکٹھا ہیں مرنے کے بعد بھی ایک جگہ رہیں، مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔(۳)

اپنے بعد کا انتظام

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے حضرت کے مرض وفات میں جب خطرہ قریب محسوس ہونے لگا، کسی کو بھیج کر کہلوایا کہ آپ نے اپنے بعد کیا انتظام کیا ہے؟ حضرت نے مدرسہ کے وقف اور اس کی جائداد وغیرہ کی تولیت سے متعلق جو انتظامات کئے تھے ان کا ذکر فرمایا، مولانا نے فرمایا کہ میں ان چیزوں کو نہیں پوچھتا ہوں، اپنے کام کے متعلق کیا کیا؟ حضرت نے اپنے خلفاء میں سے تین صاحبوں (۱) مولانا اللہ بخش بھاول نگری،(۴) (۲) منشی رحمت علی صاحب جالندھری(۵) اور (۳) مولانا عبدالقادر صاحب کا نام لیا۔(۶)

---

(۱) روایت مولوی عبدالوحید صاحب (۲) روایت حضرت شیخ الحدیث (۳) چنانچہ اسی کا ظہور ہوا بعد باوجود آپ کی شدید خواہش کے کہ رائپور میں اپنے شیخ کے پاس مدفون ہوں، آپ اپنے وطن ڈھڈیاں میں مدفون ہوئے

(۴) مولانا اللہ بخش صاحب بھاول نگر ریاست بھاولپور کے رہنے والے تھے، دہلی میں تعلیم پائی اور دہلی میں جوہری بازار (جسکو دریبہ کلاں بھی کہتے ہیں) کی ایک مسجد جو ہرکن کے خطیب مقرر ہوگئے، مزاج پر اتباع سنت کا اہتمام تھا حضرت مولانا

(باقی حاشیہ صفحہ ۷۶ پر)

آپ نے چودھری محمد صدیق صاحب رئیس رائے پور سے خاص طور سے فرمایا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۵ کا) شاہ عبدالرحیم صاحبؒ بغرض علاج دہلی تشریف لائے اور اسی مسجد میں مولانا کے حجرہ میں قیام فرمایا۔ ان کو حضرت کی بے نفسی اور تورع کی ادا بھا گئی، درخواست بیعت پیش کی۔ حضرت نے استخارہ کے لئے فرمایا اور رائے پور تشریف لے گئے، دل کی بے قراری بڑھتی گئی آپ کی خدمت میں جاکر بیعت ہو گئے اور عالی ہمتی کے ساتھ منازل سلوک طے کئے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب فرماتے تھے کہ ان کو بہت تھوڑے عرصہ میں وہ مراتب حاصل ہوئے جو دوسروں کو سالہا سال صرف کرنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں، مکاشفات واحوال عجیبہ اور علوم عالیہ کا بڑا ورود ہوتا، فرمایا کرتے تھے علوم کے آسمان وزمین بھرے ہوئے دیکھتا ہوں، ایک مرتبہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب چک نادرہ (بھاول نگر کے نزدیک ایک گاؤں) تشریف لے گئے، وہاں سے واپسی پر جب دین پور والی جگہ سے گزر ہوا تو وہاں سب کا سب جنگل ہی جنگل تھا، آپ وہاں کھڑے ہو گئے اور لاٹھی کو گاڑ دیا اور چاروں طرف دیکھا اور فرمایا کہ مولانا اللہ بخش یہ جنگل تو بڑا مبارک ہے، اس جنگل میں تو انوار برس رہے ہیں، تم تو اپنی جگہ اسی جنگل میں بناؤ، مولانا نے اسی جنگل میں ایک ٹپری ڈال لی اور متوکلانہ بیٹھ گئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو مرکز عقیدت اور اس جگہ کو مرکز ہدایت بنا دیا، اور بہت رجوع ہوا، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب فرماتے تھے کہ مولانا کو پتھری کی شکایت تھی انڈے کے برابر پتھری تھی، پیشاب میں بعض مرتبہ اس کی تکلیف ایسی ہوتی کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا لیکن فرماتے تھے کہ انعامات الٰہیہ کی لذت وسرور اس تکلیف پر غالب ہے۔ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب فرماتے تھے۔ کہ مولانا بھاول نگری مجھ سے پانچ سال پہلے حضرت کی خدمت میں آئے تھے، آپ نے پہلے ان کو قادری سلسلہ میں اجازت دی تھی، پھر چاروں سلسلوں میں اجازت

(باقی حاشیہ صفحہ ۷۷ پر)

میرے بعد مولوی صاحب کا خیال رکھنا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶ کا) مرحمت فرمائی۔ فرماتے تھے کہ مولانا ہر وقت چلتے پھرتے بھی مراقب رہتے تھے، فرمایا کہ انتقال کے بعد خواب میں زیارت ہوئی، میں نے دریافت کیا کہ حضرت کیا معاملہ ہوا؟ اس پر فرمایا الحمد للہ جب سے روح تن سے جدا ہوئی ہے اپنے آپ کو جدا نہیں پاتا۔ حضرت نے فرمایا کہ مطلب یہ تھا کہ فنائیت تامہ حاصل ہوگئی ہے۔ ۱۰ر رجب ۱۳۵۲ھ (۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۳ء) شب سہ شنبہ کو وفات ہوئی اور دین پور ریاست بھاول پور میں مدفون ہوئے (تحریر مولوی محمد یحییٰ صاحب نبیرہ مولانا اللہ بخش صاحبؒ)۔

(۵) منشی رحمت علی صاحبؒ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے اخص اصحاب اور کبار خلفاء میں سے ہیں، استعداد بڑی عالی اور کمالات وعلوم باطنیہ سے بڑی مناسبت تھی، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ بڑا ہی بسط تھا، بڑا ہی بسط تھا، بڑا ہی بسط تھا، تین دفعہ فرمایا۔ ایک مرتبہ آپ نے کتاب فتوح الغیب کو دریافت کیا، کسی نے عرض کیا وہ تو حضرت منشی صاحب لے گئے ہیں۔ فرمایا ان کو فتوح الغیب کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو خود فتوح الغیب ہیں۔ تعلیم معمولی تھی اور گاؤں کے ایک مکتب میں پڑھاتے تھے لیکن جب بسط ہوتا اور کچھ ارشاد فرمانے لگتے تو بڑے بلند مضامین اور علوم عالیہ کا ورود ہوتا۔ ۲۱ر جمادی الآخر کی شب میں ۱۳۵۱ھ کو انتقال فرمایا (ملفوظات مرتبہ مولوی علی احمد صاحب مرحوم زافادہ حضرت شیخ الحدیث)

(۶) روایت حضرت شیخ الحدیث۔

چوتھا باب (۴)

حضرت رائپوری کی وفات، رائے پور کا قیام، نئی خانقاہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جسکو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

(اقبال)

حضرت رائپوری کی وفات

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے مرض کا اشتداد ہوا تو آپ شاہ زاہد حسن صاحب(۱) کے اصرار سے انکے موضع بیلوں میں جہاں کی آب و ہوا بہت عمدہ اور صحت بخش سمجھی جاتی تھی اور اس خیال سے کہ سڑک کے قرب کی وجہ سے ڈاکٹروں کی آمد و رفت میں سہولت ہوگی منتقل ہو گئے، یہاں شاہ صاحب کی

---

(۱) شاہ زاہد حسن صاحب بہٹ کے شرفا و رؤسا کے ایک قدیم خاندان کے فرد تھے، جس کے مورث اعلیٰ سلطان بہلول لودھی کے عہد میں تشریف لائے تھے، شاہ عبداللہ صاحب حضرت بہاؤالحق سہروردی کی اولاد میں تھے، شاہ زاہد حسن صاحب باوجود امارت و ریاست کے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بڑا خادمانہ و عاشقانہ تعلق رکھتے تھے، حضرت کو بھی ان سے نہایت خصوصیت تھی، بیلوں جب انکی کوٹھی میں مقیم تھے تو فرمادیا تھا کہ یا تو تم اپنا دفتر یہیں منگوا لو یا ایسی تیز سواری اپنے پاس رکھو کہ میں جس وقت بلاؤں فوراً پہنچ جاؤ، انھوں نے اپنا دفتر وہیں منگوا لیا، حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ فرماتے تھے کہ انکے ساتھ انتقال کے وقت ایسا واقعہ پیش آیا جس کو القائے نسبت سے تعبیر کرتے ہیں، حضرت کی وفات کے بعد حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ سے خصوصی تعلق اور محبت تھی اور حضرت کو بھی ان سے نہایت درجہ خصوصیت تھی، ۵ رجمادی الثانیہ ۱۳۵۶ھ (۳ راگست ۱۹۳۷ء) میں انتقال کیا، دو فرزند چھوڑے، شاہ محمد سعید، شاہ محمد مسعود، شاہ محمد سعید صاحب کا ۱۹۶۲ء میں کراچی میں انتقال ہو گیا، شاہ محمد مسعود صاحب اپنے والد کی یادگار ہیں، حضرت کو ان سے خصوصی تعلق و شفقت تھی، اطال اللہ بقاءہ،

ایک موزوں اور ہوادار کوٹھی تھی جو انھوں نے ایک انگریز سے خریدی تھی، یہاں طویل عرصہ تک آپ کا قیام رہا، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب اور دوسرے خصوصی خدام اور اہل تعلق وہیں مقیم اور خدمت و تیمارداری میں سرگرم اور منہمک تھے، وہیں ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ (مطابق ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء) کو وہ وقت موعود آیا جس کا حضرت کو شدت سے انتظار و اشتیاق اور خدام و اہل تعلق کو خطرہ و اندیشہ تھا، رات کے وقت واقعہ پیش آیا، دوسرے دن اہل رائپور حضرت کی نعش مبارک کو دفن کے لئے رائے پور لائے۔ آپ جنازہ کے ساتھ نہیں آئے بلکہ حضرت کی اہلیہ صاحبہ کو ہمراہ لے کر رائے پور آئے، جب جنازہ سے فارغ ہو کر واپس بہلوں جانے لگے تو راستہ میں راؤ عبدالرحمن خاں صاحب نے منت سے عرض کیا کہ مولانا! اور زمین تو میری مشترک ہے مگر یہ باغ میرا تنہا کا ہے، میں یہ وقف کردوں گا۔ آپ یہیں رہیں ہم کو چھوڑ کر نہ جائیں[1]۔ حضرت رائپوریؒ چودھری محمد صدیق خاں صاحب سے فرما چکے تھے کہ میرے بعد مولانا کیلئے یہاں مکان بنوادینا۔

رائے پور کا قیام

بہرحال شیخ کا کھلا اشارہ اور ایماء، اپنے خدام کو ہدایات، زندگی اور موت میں ایک ہی جگہ رہنے کی خواہش کا اظہار، انتہائی قرب و تعلق خاص اور دائمی رفاقت و خدمت، پھر سب سے بڑھ کر آپ کی یہ ادا کہ سب کشتیاں جلا کر اور سارے تعلقات ختم کر کے اپنے شیخ اور محبوب کے قدموں میں آکر پڑ گئے تھے اور دنیا و مافیہا سے آنکھیں بند کرلی تھیں صاف بتاتی تھی کہ رسمی جانشینی اور اعلان خلافت کے بغیر آپ ہی اپنے شیخ کے جانشین اور ان کی دولت و میراث کے امین ہیں۔

---

(۱) روایت حاجی فضل الرحمن خاں۔

یقیں می داں کہ آں شاہ نکو نام

بدست سر بریدہ می دہد جام

حضرت سہارنپوری کی توثیق

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے کسی موقع پر فرمایا تھا کہ سیاسیات میں جو کچھ مراجعت کرنی ہو حضرت شیخ الہند کی طرف کی جائے مگر سلوک میں حضرت سہارنپوری کی طرف، میں نے حضرت کو اس لائن میں بہت اونچا پایا ہے۔ آپ نے حضرت سہارنپوری سے عرض کیا کہ حضرت کا تو وصال ہوگیا، اب میں حضرت سے تجدید بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت سہارنپوری نے اول حالات دریافت فرمائے اور پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے اسکی کوئی ضرورت نہیں، کوئی بات پوچھنی ہو تو میں حاضر ہوں۔(۱)

نئی خانقاہ کی بنیاد

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کا قیام خانقاہ کی جس کوٹھی میں تھا وہ حضرت کے قائم کئے ہوئے مدرسہ کیلئے وقف کردی گئی تھی، خود حضرتؒ کرایہ دے کر اس میں رہتے تھے، حضرت کی وفات کے بعد انکے بھانجے مولانا اشفاق احمد صاحب کا وہاں قیام رہنے لگا، وہی مدرسہ کے ناظم و متولی اور صاحب جائداد تھے، حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کا رائے پور، اس کی خانقاہ اور اس ماحول سے جو کچھ تعلق تھا وہ محض حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کی اس نظر عنایت اور محبت و خصوصیت کی بنا پر تھا جو حضرت نے انکے ساتھ رکھی تھی، کوئی رسمی جانشینی عمل میں نہیں آئی۔ اس سلسلہ کے بہت سے اکابر کا یہی دستور اور معمول رہا ہے کہ جس کو اپنے شیخ سے زیادہ مناسبت اور جس میں زیادہ اہلیت اور استعداد ہو وہ قدرتی طور پر اپنے شیخ کی جگہ لے لیتا ہے، اور خدام و اہل تعلق کو اس سے مناسبت اور تعلق پیدا ہو جاتا ہے، یوں تو حضرت کا

(۱) روایت حضرت شیخ الحدیث۔

معاملہ اور آپ کے اشارات اس بات کو ظاہر کر رہے تھے کہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ ہی اس سلسلہ اور حلقہ کا مرکز اور مرجع بنیں گے، لیکن بہت سے لوگ خاندانی تعلق اور قرب کی بنا پر عرصہ تک مولانا اشفاق احمد صاحب ہی کو جانشینی کا اصل حقدار سمجھتے تھے جو اسی خاندان کے چشم و چراغ اور حضرت کے حقیقی بھانجے عالم ذاکر و شاغل و جوان صالح تھے۔

حضرت کی طبیعت ہر طرح کی کشمکش، مقابلہ، دعوے اور اپنی شخصیت کے اظہار سے گریزاں تھی، آپ نے کشمکش کے ڈر سے ان دنوں رائپور کا قیام ترک کر دیا تھا، کبھی بہٹ، کبھی کھیڑی اور کبھی مکان پر رہتے تھے، تقریباً ۳-۴ سال رائپور میں مستقل قیام نہیں رہا،[1] لیکن رفتہ رفتہ آپ کی طرف رجوع بڑھا اور منجانب اللہ آپ کی شخصیت مرکز بنتی چلی گئی، جو لوگ اصل مقصود (اصلاح و تربیت) کے طالب تھے اور اللہ کے نام کے لذت آشنا تھے وہ بے اختیار آپ کی طرف کھنچتے چلے گئے اور آپ کے اخلاص و ایثار اور عنداللہ مقبولیت کے اثر سے آپ کی مرکزیت نمایاں ہوتی چلی گئی اور ساتھ ہی ساتھ آپ کا قیام بھی رائے پور میں طویل ہوتا چلا گیا۔

نئی خانقاہ کی تعمیر حضرت کی طبیعت ہمیشہ سے عمارت و تعمیرات سے ہٹی ہوئی تھی، چودھری محمد صدیق خاں صاحب نے بڑے حضرت کی وصیت کی تعمیل میں جب آپ کیلئے کچھ تعمیر کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا مکان نہ بنوائیے، میرے لئے تو صرف ایک چھپر ڈال دیجئے مگر وہ نہ مانے کہا مجھے تو حضرتؒ کا حکم ہے، مکان ہی بنواؤں گا حضرت کے کسی سفر کے زمانہ میں انھوں نے موقع غنیمت سمجھ کر ایک پختہ دالان بنوا دیا

(۱) روایت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب،

رفتہ رفتہ آس پاس کئی چھپر اور سائبان پڑ گئے اور ایک خس پوش خام خانقاہ تیار ہو گئی، جو کچھ ہی عرصہ کے بعد طالبین خدا کا ایسا مرکز بن گئی جس نے مادیت اور غفلت کے اس دور میں اور چودھویں صدی کے وسط میں شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ کی خانقاہ کی یاد تازہ کر دی اور بہت سی حیثیتوں سے اپنے وقت میں برعظیم ہند کی سب سے بڑی زندہ اور آباد خانقاہ تھی، جہاں ہندستان کے ہر ذوق اور ہر طبقہ کے ممتاز افراد عشق کا سودا اور دل کی دوا لینے کیلئے ملک کے گوشہ گوشہ سے جمع ہونے لگے اور جہاں مشکل سے کوئی وقت ذکر اللہ کی صداؤں اور عشق و محبت کے نغموں سے خالی ہوتا ہوگا، جہاں کی سرشاری اور بیخودی، ماسوی اللہ سے انقطاع اور ساقی کی عالی ظرفی اور فیاضی کو دیکھ کر بہت سے آلودہ دامن پکار اٹھتے تھے ؎

حشر تک یارب طفیل خادمانِ مے فروش
اک درِ توبہ کھلا رکھ، اک دکانِ مے فروش

ابتدائی قیام کا نظام اس ابتدائی قیام میں کچھ عرصہ تک آپ کا کھانا چودھری محمد صدیق صاحب کی اہلیہ کے ہاں سے آتا تھا، بقیہ مقیمین خانقاہ کیلئے دال روٹی یہاں پکتی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ معمول ہو گیا کہ فجر کی نماز سے پیشتر چائے پی لیتے تھے، نماز کے بعد سیر کو جاتے، واپسی میں مزار پر بیٹھ کر آجاتے اور آٹھ بجے کھانا کھا لیتے، حاجی ظفر الدین[1] صاحب دو روٹیاں پکا دیا کرتے، اسی وقت دروازہ بند کر لیتے، ظہر کی نماز کے

(۱) حاجی ظفر الدین صاحب اصل ضلع جالندھر تحصیل نکودر کے رہنے والے ہیں، بعد میں قیام سندھ ہو گیا تھا بیعت حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سے ہے، بچپن سے حضرت کی خدمت میں رہے، حضرت کے

(باقی حاشیہ صفحہ ۸۳ پر)

وقت باہر تشریف لاتے تھے، معلوم نہیں کسی وقت لیٹتے بھی تھے یا مشغول ہی رہتے تھے۔

کبھی کبھی حضرت کی محبت اور یاد میں حضرت کے خدام سے مل کر دل کو تسکین دینے کیلئے باہر چلے جاتے، ایک دفعہ بہٹ سے تنہا ہی لودھی پور تشریف لے گئے، راستہ صحیح نہ معلوم ہونے کی وجہ سے نالہ میں سے گزرتے ہوئے پاجامہ اور کرتا بھیگ گیا، گاؤں کے باہر حافظ طفیل صاحب وغیرہ ملے، وہ گھر لے گئے، کپڑے بدلوائے اور عرض کیا کہ تنہا کیسے تشریف لے آئے، اطلاع ہو جاتی تو ہم آجاتے، حضرت نے فرمایا خیال آگیا کہ تم سب کے سب حضرت کے خواص تھے، جی چاہا کہ تمہاری زیارت کرتا جاؤں[1]۔

اس وقت بغیر کسی دینی اور اصلاحی مقصد اور فائدہ کے حضرت کا معمول اہل تعلق کے پاس جانے اور اس طرح دورہ کرنے کا نہیں تھا، جس طرح پیر اپنے مریدوں میں جایا کرتے ہیں، ایک دفعہ لودھی پور والوں نے اصرار کیا کہ حضرت تو ہمارے یہاں آتے نہیں ہیں، بڑے حضرت تو تشریف لاتے رہتے تھے، فرمایا کہ یوں تو آنا مشکل ہے، البتہ اگر تم لوگ ذکر کرنے لگ جاؤ تو ضرور آتا رہوں گا، اس پر حافظ طفیل صاحب اور صوفی برکت صاحب وغیرہ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۲ کا) ساتھ پہلوں میں تھے، آپ کا وصال انہیں کی گود میں ہوا، آپ کے بعد سے خانقاہ کا لنگر حاجی صاحب ہی کے سپرد ہو گیا اور حضرت مولانا عبد القادر صاحب کی وفات سے چند مہینے پہلے تک برابر وہی لنگر کے مہتمم رہے، وہ اور ان کا مختصر سا کنبہ بڑی مستعدی اور جفاکشی کے ساتھ خانقاہ کے مقیمین اور ان نئے نئے آنے والے مہمانوں کے لئے جن کی تعداد کا اندازہ پہلے سے کبھی نہیں ہو سکا خدمت انجام دیتے رہے، بعض بیماریوں اور معذوریوں کی بنا پر اخیر زمانہ میں یہ ذمہ داری ان سے لے لی گئی تھی۔

(۱) روایت مولوی عبد الجلیل صاحب بحوالہ صوفی برکت صاحب وغیرہ۔

ذکر سیکھا اور ذکر کرنا شروع کردیا۔[1]

رفتہ رفتہ بڑے حضرت کے لوگوں کی اور آس پاس اور دُور دُور کے مقامات کے طالبین کی آمد بڑھتی چلی گئی اور رائے پور کی خانقاہ دوبارہ اسی طرح آباد اور پر رونق ہوگئی جیسے بڑے حضرت کے زمانہ میں تھی اور مخلصین کے اصرار اور خواہش پر آپ بھی ان کے یہاں جانے لگے، جہاں تشریف لے جاتے وہاں اسی طرح ذکر کی سرگرمی اور یادِ خدا کی ہماہمی شروع ہوجاتی اور وہی جگہ خانقاہ معلوم ہونے لگتی۔

ترکِ سفر کا تہیّہ اس زمانہ میں آپ نے خود اپنی طبیعت کے رجحان یا بعض غیبی[2] اشاروں کی بنا پر ترکِ سفر کا تہیہ فرمالیا اور رائے پور میں ایسا مستقل قیام اختیار فرمایا کہ نہ بہٹ تشریف لے جاتے اور نہ کہیں اور، کچھ عرصہ کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم کے سالانہ جلسہ کے موقع پر جس میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے تشریف لانے سے معذرت کردی تھی، حضرت شیخ الحدیث نے آپ سے شرکت کیلئے اصرار فرمایا، آپ نے شرکت قبول فرمائی، اس معمول کو بدلنے اور اپنا عزم فسخ کرنے سے گرانی بھی ہوئی لیکن آپ نے اس کو گوارہ فرمایا اور اس وقت سے سفروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔[3]

دوسرا حج حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم کی وفات کے بعد آپ نے دوسرا حج ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۷ء میں کیا، جب سفرِ حج کا ارادہ ہوا تو آپ پہلے ڈھڈیان تشریف لے گئے والدہ صاحبہ حیات تھیں ان سے حج کی اجازت لی، انھوں نے فرمایا کہ دونوں بھائیوں کو

---

(۱) روایت مولوی عبدالجلیل صاحب بحوالہ صوفی برکت وغیرہ (۲) اس سلسلہ میں یہ روایت مشہور ہے کہ ایک مجذوب بزرگ رائے پور آئے، آپ خلوت میں تھے، کچھ دیر انتظار کیا اور خود بات کرکے چلے گئے کہ آپ سفر بالکل نہ کریں اور مستقل خانقاہ میں رہیں۔ (۳) روایت حضرت شیخ الحدیث۔

بھی لیجاؤ، حضرت نے فرمایا ایک کو لے جاؤں گا اور وہ بھی محمد خلیل مناسب ہیں، آپ وہاں سے واپس ہو گئے اور اپنے بھائی محمد خلیل صاحب اور محمد علی خادم سے فرما گئے کہ اتنے روز کے بعد آجانا، رائے پور سے دہلی ہو کر روانہ ہوئے وہاں دس بارہ روز ٹھہرنا ہوا، اس سفر میں آپ کے ہمراہ آپ کے چھوٹے بھائی حافظ محمد خلیل صاحب، حاجی محمد علی خادم، مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی، حاجی ظفر الدین، راؤ عبدالشکور خان رائے پوری، شاہ سکندر علی مرحوم، حافظ احمد حسن صاحب بن مولانا نور محمد صاحب لدھیانوی وغیرہ تھے، ۲۱ رجب ۱۳۴۵ھ (۲۵ جنوری ۱۹۲۷ء) کو جہاز روانہ ہوا، اس حج سے قبل ہی پیچش کی شکایت تھی، جدہ سے اونٹ کر کے مکہ مکرمہ گئے عمرہ کر کے مدینہ طیبہ کا ارادہ فرمایا، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری اور مولانا محمد زکریا صاحب (شیخ الحدیث) وہیں مقیم تھے حضرت نے بھی رمضان کے روزے وہیں رکھنے کا فیصلہ فرمایا، مکہ معظمہ سے مدینہ طیبہ تیرہ روز میں پہنچنا ہوا، عصر پڑھ کر مغرب تک اونٹ کے ہمراہ چلتے تھے مغرب پڑھ کر سوار ہوتے ویسے بھی کچھ نہ کچھ پیدل چلتے تھے، آخری منزل پر بدو سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ جگہ آجائے جہاں سے گنبد خضرا نظر آتا ہے تو فوراً بتا دے، اس نے بتا دیا وہاں سے اتر کر پیدل چلتے رہے، رفقاء کو پہلے ہی تاکید فرما دی تھی کہ درود شریف کی کثرت رکھیں، خاموش رہیں اور بہت ادب و احترام کے ساتھ حاضری دیں، صبح کو مدینہ طیبہ پہونچنا ہوا۔ حضرت سہارنپوری دروازہ پر موجود تھے، سامان اتروا کر لے گئے، حضرت سہارنپوری ہی نے پہلا سلام مواجہہ شریف پر پڑھوایا۔[1]

رمضان سے پیشتر مدینہ طیبہ پہونچ گئے تھے، تراویح حضرت سہارنپوری کے ساتھ مدرسہ علوم شرعیہ میں ہوا کرتی تھی، حضرت سہارنپوری قدس سرہٗ کو نافع کی قرأت میں

(۱) روایت جناب حافظ محمد خلیل صاحب برادر اصغر حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ

قرآن شریف سننے کا شوق تھا، ایک مالکی قاری تراویح پڑھایا کرتے تھے حضرت سہارنپوریؒ اور حضرت رائپوریؒ حرم سے فرض کی نماز پڑھکر تشریف لے آتے، رفقاء اور خدام بھی ان حضرات کے ساتھ آجایا کرتے
۱۶ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ (۱۸ مئی ۱۹۲۶ء چہارشنبہ) کو مدینہ طیبہ سے شیخ الحدیث کی معیت میں مکہ معظمہ واپسی ہوئی، حضرت شیخ الحدیث کو یہ کہہ کر قافلہ کا امیر بنادیا کہ "الأئمۃ من قریش" آپ کے خدام آپ کا شغدف اچھی طرح سے باندھتے تاکہ سفر میں راحت رہے، ایک شریک قافلہ رئیس کو اس بات کی شکایت رہتی کہ ان کا شغدف اچھی طرح نہیں باندھا جاتا، ان کے بار بار شکایت کرنے پر شیخ الحدیث نے بحیثیت امیر کے حکم دیا کہ وہ حضرت کے شغدف میں سوار ہوں اور حضرت ان کے شغدف میں حضرت تو اپنے شغدف سے فوراً اتر گئے، ان رئیس نے اترنے سے انکار کر دیا، اس پر شیخ نے کہا کہ پھر حضرت پیدل چلیں گے، حضرت نے اس کو بخوشی منظور فرمایا اور پیدل روانہ ہو گئے، رئیس نے بڑی معذرت کی اور بڑے اصرار سے آپ کو سوار کرایا اور پھر شکایت نہیں کی[1]۔

اس سال گرمی بڑی سخت پڑی، لو کی بڑی شدت تھی، اموات بکثرت ہوئیں، پانی کی نایابی کی وجہ سے لوگ اونٹوں پر چلتے چلتے مرجاتے تھے[2] حضرت نے اس موقع پر اپنے پانی سے بہت سے جاں بلب حجاج کی مدد فرمائی، اکثر اس وقت کی موت کی گرم بازاری اور حجاج کی تکلیف کے واقعات بیان فرماتے۔

یکم محرم ۱۳۴۶ھ (مطابق یکم جولائی ۱۹۲۷ء) یوم جمعہ کو کراچی پہونچے اور ۶ محرم ۱۳۴۶ھ (۶ جولائی ۱۹۲۷ء کو) سہارنپور تشریف لے آئے، راستہ میں اہل تعلق کی بڑی بڑی جماعتیں زیارت و ملاقات سے مشرف ہوئیں[3]۔

(۱) روایت حضرت شیخ الحدیث (۲) روایت حافظ محمد خلیل صاحب (۳) روایت حضرت شیخ الحدیث

پانچواں باب (۵)

اخلاص و محبّت اور اخلاق و تربیت کا ایک مرکز

درو نہا تیرہ شد باشد کہ از غیب — چراغے بر کند خلوت نشینے
نہ حافظ را حضور از ورد قرآں — نہ دانشمند را علم الیقینے

زندگی اور مختلف طبقات کا وسیع مطالعہ و تجربہ حکمت الٰہی نے حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کی تعلیم و تربیت کا اس طرح انتظام کیا تھا کہ انکی شعوری زندگی کا معتد بہ اور طویل حصّہ مختلف ماحول اور مسلمانوں کی مختلف العقائد مذہبی جماعتوں اور طبقوں میں گزرا تھا انھوں نے ایک ایسے دینی ماحول میں آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا جو زمانہ حاضر کے اثرات اور جدید تعلیم کے خیالات سے دور تھا، مگر کبھی کبھی کسی روزن سے باہر کی آزاد خیالی کے جھونکے آجاتے تھے اور ان کی سلیم لیکن حساس و ذہین طبیعت کی سطح پر تموّج پیدا کر دیتے تھے پھر حکمت الٰہی (جسکی مصلحتوں کو کوئی نہیں جانتا) آپ کو قادیان لے گئی[1] جو اس وقت ایک ایسی نئی تحریک اور دعوت کا مرکز تھا جو نئی بنیادوں پر ایک نئی ملت کی تاسیس کر رہی تھی اور جس کو جمہور اہل اسلام اور سواد اعظم سے بنیادی اختلاف تھا اور وہ

(۱) یہ سفر اپنے چچا زاد بھائی کے علاج کے سلسلہ میں اور ان کی خواہش پر تھا (ملاحظہ ہو صـ۴۶)

ذہنی طور پر بے چین اور باغی عناصر کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا تھا، وہاں انھوں نے اس تحریک کے بانی (مرزا صاحب) اور اس کے سب سے بڑے ترجمان اور وکیل (حکیم نورالدین صاحب) سے ملاقات کی اور اس نئی دینی ریاست اور پیشوائی کے اندرونی حالات دیکھے پھر ہندستان کے مختلف دینی و علمی مرکزوں اور مشہور درسگاہوں میں رہ کر علماء کی حریفانہ کشمکش، جذبۂ رقابت، تکفیر و تفسیق کے مشغلے، اہل علم کا علمی پندار اور نخوت، اساتذہ کا معقولات میں توغل، مصلحین میں اپنی اصلاح، نفسانی امراض اور اخلاق رذیلہ کے علاج و استیصال سے غفلت کے مناظر اور نمونے دیکھے۔

اس دوران میں سلمانوں کی اصلاح و ترقی کی کئی تحریکیں پیدا ہوئیں لیکن آندھی پانی کی طرح آئیں اور آندھی پانی کی طرح نکل گئیں، ان تحریکوں کے قائدین اور کارکنوں میں جذبات کی افسردگی، اخلاق کی پستی، تعلقات کی خرابی اور اپنی اصلاح نہ ہونے کے مفاسد اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان تحریکوں کے شاندار آغاز کے ساتھ ان کا حسرتناک انجام بھی مشاہدہ فرمایا۔

باہر کا انتشار اندر کے انتشار کا نتیجہ

رائے پور کے زمانۂ قیام میں تحریک خلافت کا عروج بھی دیکھا جو جدید ہندوستان کی سب سے عظیم، سب سے ہمہ گیر اور سب سے طاقتور نیم دینی، نیم سیاسی تحریک تھی اس تحریک کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا بلکہ اس کے رازہائے سربستہ اور اس کے منصوبوں سے واقفیت کا موقع بھی ملا۔ پھر حضرت نے (شیخ الہند کی وفات کے بعد) اس تحریک کا زوال، اس کے قائدین اور کارکنوں میں انتشار، مخصوص حضرات کو چھوڑ کر تحریک کے رہنماؤں میں اخلاص و تربیت کی کمی، رضا کاروں اور کارکنوں

میں نظم واطاعت کا فقدان، عوام میں اعتماد وانقیاد کی اور منتظمین وذمہ داروں میں امانت ودیانت کی کمی محسوس فرمائی اور اس کے شکوے سنے اور آپ کی حقیقت رس طبیعت نے نتیجہ نکال لیا اور اس کو ذہن کے امانت خانہ میں محفوظ کرلیا کہ باہر کا انتشار اندر کے انتشار اور خلا کا نتیجہ ہے۔

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

قلب کا خلا اور بگاڑ

آپ نے یہ بھی محسوس کرلیا کہ عوام میں انتشار واضطراب قیادت کی کمزوری کی وجہ سے ہے اور قیادت کی کمزوری، قائدین کی عدم تربیت اور سوزِ دروں کی کمی کی وجہ سے ہے، عوام کا قلب قائد ہیں لیکن خود قائدین کا قلب اپنی جگہ سے ہٹا ہوا اور ایمان ویقین اور عشق وسوز کے بجائے حُبّ دنیا اور حُبّ جاہ سے بھرا ہوا ہے۔

میرِ سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف

اپنے وطن پنجاب میں مشائخ اور اہل خانقاہ کو دیکھا کہ انھوں نے بھی (الا ماشاء اللہ) متاع درد اور دوائے دل تقسیم کرنے کے بجائے اپنی مشیخت کی دکانیں سجا رکھی ہیں اب یہاں بھی اصلاح وتربیت نفس اور اخلاص وللّٰہیت کی دولت ملنے کے بجائے نفس کو غذا اور عقل بہانہ جو کو دنیا طلبی کا حیلہ اور سند ملتی ہے۔

واعظین ومقررین کی شیوہ بیانی اور فصاحت وبلاغت بھی سنی اور مصنفین اور اہل قلم کے ہاں معلومات کی فراوانی اور انشاء پردازی کا زور بھی دیکھا لیکن یہاں بھی اخلاص کی کمی، عمل کی کوتاہی اور درد وسوز کے فقدان کی وجہ سے ان کے ذریعے

عوام کی بہت کم اصلاح اور انقلاب حال ہوتا دیکھا، چودھویں صدی کے وسط کا یہ زمانہ ہندستان میں دینی خطابت کے انتہائی عروج و ترقی کا دور ہے، لیکن زندگی کا کاروانِ سست جس خواب گراں میں مدہوش یا جس غلط رخ پر رواں دواں تھا اس میں کوئی تغیر نہیں، کچھ عرصہ کی بات ہے کہ حضرت جگر مرادآبادی مرحوم نے حضرت کو اپنی ایک غزل سنائی، جب وہ غزل کے اس شعر تک پہونچے تو حضرت نے بڑی تحسین فرمائی، یہ ہندستان کے واعظانہ حلقہ کی صحیح تصویر ہے۔

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

اخلاص کی کمی اور اخلاق کا فساد

مسلمانوں کے حالات کے اس وسیع مطالعہ اور اپنی زندگی کے اس طویل تجربہ نے آپکو اس نتیجہ پر پہنچا دیا اور آپ کا یہ یقین اور عقیدہ بن گیا کہ مسلمانوں کی پوری زندگی اور اسکے مختلف شعبوں کے فساد کا اصل سبب اخلاص کی کمی اور اخلاق کا بگاڑ ہے، اور وقت کا سب سے بڑا ضروری کام اخلاص و اخلاق کا پیدا کرنا ہے اور اس کا سب سے مؤثر ذریعہ محبت ہے اور اس کا ذریعہ ذکر و صحبت ہے۔

اس اخلاص اور محبت سے ہر دینی کام اور ہر اصلاحی کوشش میں جان پڑتی ہے اور وہ زندہ اور طاقتور بنتا ہے، اسی سے عبادات میں روحانیت، علم میں نورانیت تعلیم و تدریس میں برکت و قوت، وعظ و ارشاد میں تاثیر، تبلیغ و دعوت میں قبولیت و قوت، تصنیف و تالیف میں اثر و مقبولیت، سیاسی و تنظیمی کوششوں میں کامیابی و نتیجہ خیزی، تعلقات میں استواری، جماعتوں میں اتحاد، افراد میں ایثار و محبت پیدا

ہوتی ہے، غرض پوری زندگی کی چول اپنی جگہ آجاتی ہے اور ہر طرح کا ضعف و انتشار ختم ہو جاتا ہے۔ الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب(۱)۔

اسی طرح اخلاق کی درستی کے بغیر کوئی انفرادی زندگی متوازن اور کامیاب اور کوئی اجتماعی کوشش بارآور اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ آپ کے نزدیک ذکر و شغل، صحبت مشائخ اور مجاہدات و ریاضات کا بڑا مقصد اور ثمرہ اخلاق کی اصلاح، صفات رذیلہ کا ازالہ اور صحیح معنیٰ میں تزکیۂ نفس ہے، محض ذکر اذکار کافی نہیں، اخلاق کی اصلاح ضروری ہے۔ ایک روز ایک صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے جو ایک موقع پر مغلوب الغضب ہو گئے تھے فرمایا:۔

"اصلاح کے لئے فقط ذکر کافی نہیں، اخلاق کی درستگی کرنا چاہیئے اور مشائخ سے اخلاق ذمیمہ کا علاج کرانا چاہیئے، اسی واسطے زندہ مشائخ سے بیعت ہوتے ہیں کہ وہ اخلاق کی اصلاح کرتے ہیں، مثلاً غصہ ہے، یہ بہت برا مرض ہے، حدیثوں میں اس کی بہت مذمت فرمائی گئی ہے لیکن جب تک شیخ سے علاج نہیں ہوتا یہ مرض نہیں جاتا"(۲)

لطائف ستہ کے انوار و آثار کا ذکر کرتے ہوئے ایک روز فرمایا:۔

---

(۱) حدیث صحیح (ترجمہ) یاد رکھو، انسان کے جسم میں ایک مضغۂ گوشت ہے، اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارے جسم کا نظام صحیح ہو جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارے جسم کا نظام بگڑ جاتا ہے، وہ انسان کا دل ہے۔

(۲) ملفوظات (قلمی) مرتبہ مولانا علی احمد صاحب مرحوم مجلس ۲۴ رمضان ۱۳۷۵ھ (۲۴ راپریل ۱۹۵۶ء) بمقام لائل پور خالصہ کالج۔

"ان لطائف کے جاری ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ قلب حرکت کرے یا انوار نظر آئیں بلکہ ان کے جاری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے علوم منکشف ہو جائیں، مثلاً قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالےٰ کی طرف خیال رہے، دل سے دُنیا اور ہر چیز کی قیمت نکل جائے، اسی طرح لطیفۂ نفس جاری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ رذائل و صفات رذیلہ نکل جائیں اور صفات حمیدہ پیدا ہو جائیں، اور انکساری و عاجزی پیدا ہو جائے، اپنے آپ کو سب سے حقیر سمجھیں، جب یہ حالت ہو تو سمجھے کہ کچھ چل پڑا ہے اسی طرح دوسرے لطائف، اس میں انوار کا نظر آنا کوئی ضروری نہیں، یہ تو محنت و ریاضت سے غیر مسلموں کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔"(۱)

اخلاص و اخلاق کی جہانگیری اور کیمیاگری

حضرت کے سامنے سب سے پہلے صحابۂ کرامؓ کی زندگی اور ان کے کارنامے تھے جنکے اخلاص و اخلاق کی بدولت اسلام نصف صدی کے اندر نصف دنیا میں پھیل گیا اور ہر طرف خدا طلبی اور آخرت کوشی کی ہوا چل گئی، حضرت نے انکے حالات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا اور اپنی مجالس میں بار بار ان کے اخلاص و ایثار کے تذکرے فرماتے تھے۔

دور آخر میں آپ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور انکی جماعت کی تاریخ کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ فرمایا، فرماتے تھے کہ ان کے حالات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دور میں صحابۂ کرام کا نمونہ تھے، وہی رضائے الٰہی کی دُھن، وہی شہادت کا شوق وہی دنیا سے بے رغبتی وہی ایثار و محبت اور قربانی کا جذبہ

(۱) ملفوظ بتاریخ ۲ رجادی الثانیہ ۱۳۷۶ھ (۱۰ جنوری ۱۹۵۵ء) بمقام کوٹھی صوفی عبدالحمید صاحب (بیاض مولوی علی احمد صاحب مرحوم)

پھر آپ نے اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خادم حضرت خاں صاحب عبدالرحمٰن خاں(۱) کی تبلیغ وصحبت کے اثرات دیکھے کہ کس طرح وہ دشمن کو دوست، پتھر کو موم اور غافلوں اور فاسقوں کو تہجد گزار اور تقوے شعار بنا لیتے تھے، یہ سب ان کے اخلاص اور سوزِ دروں کا نتیجہ تھا۔

---

(۱) خاں صاحب عبدالرحمٰن خاں تھانہ بھون کے رہنے والے تھے، استعداد نہایت عالی اور نسبت عشقیہ جذبیہ تھی، ابتداء میں کرایہ پر بیل گاڑی چلاتے تھے، ایک لطیفۂ غیبی اور ہادی مطلق کی رہبری سے بیعت وسلوک کی طرف توجہ اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی طرف نشان دہی ہوئی بیعت ہوئے اور آثار واحوال عزیبہ کا ورود ہوا۔ حضرت فرماتے تھے کہ پہلے مجھے خیال ہوتا تھا کہ شاید لوگوں نے پہلے بزرگوں کے حالات وکمالات لکھنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے لیکن جب میں نے میاں صاحب (عبدالرحمٰن خاں صاحب) سے ان کے حالات سنے اور اپنی آنکھوں سے دیکھے تو یقین ہوا کہ واقعی پرانے بزرگوں کے حالات بھی جو لوگوں نے لکھے ہیں درست ہوں گے، فرمایا کہ میں اور مولانا اللہ بخش صاحب اور میاں صاحب ایک مرتبہ ایک تقریب میں جمع تھے، وہاں ایک موقع پر ہم نے اصرار کیا کہ آپ اپنی بیعت کا واقعہ سنائیں، انھوں نے واقعہ سنانا شروع کیا، بیعت کا واقعہ سناتے سناتے رونا شروع کر دیا ہم نے دیکھا کہ خون کے آنسو جاری ہیں اور کرتا رنگین ہو رہا ہے۔ ہم بڑے گھبرائے، ہم نے خود کرتا دھویا حضرت ان کی تاثیر وفیض صحبت کے واقعات اکثر سنایا کرتے تھے، برابر دورہ اور تبلیغ فرماتے، مدارس قائم کرتے اور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی خدمت میں روداد پیش کرتے، بڑے بڑے متکبر و فرعون طبیعت رئیسوں کی انکی صحبت میں قلب ماہیت ہو جاتی تھی، فرماتے تھے جس روز انکی وفات کی اطلاع رائے پور آئی ہے حضرت پر سارے دن عجیب اثر وکیف رہا، یہ بھی فرمایا کہ ہمیں امید تھی کہ اگر ایسے صاحب تاثیر اور قوی النسبت لوگ زندہ رہ جائیں تو مخلوق خدا کو بڑا فیض پہونچے اور اسلام کو ترقی ہو۔

ان اہل دل بزرگوں اور دردمندوں کے واقعات بھی آپ کے سامنے تھے جن کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ بجلی کا اثر اور جن کی صحبت کیمیا اور پارس کی تاثیر رکھتی تھی پنجاب کے ایک باخدا عالم مولانا غلام رسول صاحب[1] کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"بڑے عاشق تھے، ع دلا غافل نہ ہو یک دم، یہ انھیں کے اشعار ہیں، پنجابی تھے، ان کی اردو بھی ایسی ہی ہے، رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عشق میں انکے بڑے دردناک اشعار ہیں، صحبت میں یہ اثر تھا کہ جو ایک دفعہ پاس بیٹھ جاتا، ساری عمر اس کی تہجد بھی ناغہ نہ ہوتی چہ جائیکہ (فرض) نماز، ہندوؤں میں جہاں وعظ کر دیتے سب کے سب مسلمان ہو جاتے، ایک دفعہ استنجے کے لئے ہاتھ میں ڈھیلا لئے کھڑے تھے، کچھ ہندو عورتیں قضائے حاجت کیلئے بستی کے باہر جنگل کو جا رہی تھیں، ڈھیلا زور سے زمین پر پھینکا اور فرمایا اِلَّا اللّٰہُ وہ سب ہندو عورتیں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھنے لگیں اور گھر تک پڑھتی گئیں اور مسلمان ہو گئیں، ایک شخص مسجد میں مکان کے اوپر سے کوڑا پھینک دیتا تھا، ایک دفعہ لوگوں نے مولانا سے کہا کہ فلاں شخص ہمیشہ مسجد میں مکان کے اوپر سے کوڑا پھینکتا ہے، فرمایا کہ اب کی پھینکے تو مجھے دکھانا، دکھایا بھی، آپ نے فرمایا کب تک پھینکتا رہے گا؟ وہ وہیں سے نیچے کود پڑا اور تائب ہوا، جو ہندو یا عیسائی ایک دفعہ وعظ سن لیتا تھا مسلمان ہو جاتا تھا اسواسطے انگریزوں نے زبان بندی کر دی

(۱) قلعہ میہاں سنگھ ضلع گوجرانوالہ پنجاب کے رہنے والے تھے، بڑے عالم محدث اور صاحب تاثیر تھے، پہلے مولانا نظام الدین مگوی سے تعلیم حاصل کی، پھر دہلی آکر سید نذیر حسین صاحبؒ کے درس حدیث میں شرکت کی، حضرت مولانا عبداللہ صاحب غزنوی رفیق درس تھے، وعظ و تذکیر میں ایسی تاثیر تھی کہ انگریزی حکومت نے وعظ کہنے اور بلا اجازت سفر کرنے کی ممانعت کر دی تھی، عامل بالحدیث اور صاحب تصنیف تھے، ۱۲۹۱ھ میں وفات پائی (نزہۃ الخواطر جلد ۸) و تاریخ اہل حدیث از مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ۔

تھی اور وعظ سے روک دیا تھا۔[1]

اسی طرح کئی بار مولانا محمد صاحب فاروقی کے عشق و محبت اور درد و سوز اور انکی تاثیر اور انقلاب انگیز صحبت کے واقعات بیان فرمائے، ایک مرتبہ فرمایا :-

" مولانا عبد اللہ صاحب کے والد مولانا محمد صاحب[2] بڑے عاشق تھے، بہت

(۱) ملفوظات (قلمی) مرتبہ مولوی علی احمد صاحب مرحوم، مجلس ۲۴ رجادی الثانیہ ۱۳۷۶ھ (۲۶ رجنوری ۱۹۵۷ء) بمقام لاہور، کوٹھی صوفی عبد الحمید صاحب۔ (۲) مولانا محمد صاحب کوٹ بادل خاں ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے بڑے عالم تھے حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی بانی مظاہر العلوم سہارنپور سے تلمذ تھا اور مولانا عبد الحق صاحب حقانی کے ہم سبق تھے، بڑی عاشقانہ اور دردمند طبیعت پائی تھی، ابتداء میں عشق مجازی میں گرفتار ہوگئے اور اسکی وجہ سے بڑی تکلیفیں برداشت کیں پھر جاذبۂ توفیق الٰہی نے محبوب حقیقی کی طلب و عشق کی طرف متوجہ کیا، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوگئے، حضرت نے انکو ارشاد فرمایا تھا کہ آپ وعظ ہی کہتے پھریں یہی آپ کا وظیفہ ہے، مولانا وعظ کیلئے دیوانہ وار پھرتے تھے، آواز میں اللہ تعالیٰ نے اتنی کشش دی تھی کہ جو بھی آپ سے وعظ یا کوئی شعر سن لیتا گرویدہ ہو جاتا، اکثر وعظ سننے والے تہجد گزار ہو جاتے بڑے بڑے ڈاکو اور چور آپ کے ہاتھ پر تائب ہوئے۔

حضرت فرماتے تھے کہ جب ذکر کرنے بیٹھتے تو پہلے بڑے درد سے یہ شعر پڑھتے اور دل کھینچ لیتے،

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

پھر تھوڑا ذکر کرتے، پھر یہ شعر پڑھتے اور خوب روتے۔

مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ ضلع لاہور میں میرا گزر ایک جھونپڑے کے پاس سے ہوا جو بالکل جنگل میں تھا، سنتا ہوں کہ کوئی عورت جھونپڑے کے اندر بیٹھی ذکر بالجہر کر رہی ہے مگر کچھ زیادہ جہر سے نہیں میں وہاں ٹھہر گیا، پوچھا کہ آپ لوگوں کو کس کی صحبت سے یہ بات حاصل ہوئی، انھوں نے کہا کہ یہاں سے ایک بزرگ سفید ریش گزرے تھے ان کا نام محمد تھا ہم ان سے بیعت ہوگئے ہماری مستورات بھی ذاکرہ اور تہجد گزار ہیں، حلال حرام پہچانتی ہیں، میں سمجھ گیا کہ یہ میرے استاد حضرت مولانا محمد صاحب فاروقی ہیں ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) میں وفات پائی۔

خوش الحان تھے۔ ایک بستی[1] میں تشریف لے گئے، لوگ باہر درختوں کے نیچے اکٹھے تھے، وارث شاہ کی ہیر رانجھا[2] ہو رہی تھی، خادم سے کہا آؤ وہاں چلیں ان سے کہا لاؤ ہم ہیر سنائیں، ایسا پڑھا کہ دل کو کھینچ لیا، لوگوں نے کہا واہ مولوی صاحب پھر ہیر کو چھوڑ کر قرآن شریف پڑھ کر وعظ شروع کر دیا، سب بستی کی بستی مرید ہو گئی۔

"فرماتے تھے کہ اب یوں جی چاہتا ہے کہ ایک لوا "الحمد" بناؤں، ایک اونٹ پر سوار ہوں اور قرآن پڑھ کر وعظ سناؤں اور لوگ پتھراؤ کریں، بس اس کا ذوق آرہا ہے۔[3]"

اسی طرح ایک دوسرے صاحب اخلاص و درد عالم مولانا احمد الدینؒ[4] کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

"جس بستی سے گزر جاتے لوگ ایسا چمٹتے کہ ۱۵، ۱۵ روز تک جانے نہ دیتے ایک دفعہ گنگوہ تشریف لے گئے، حالانکہ وہاں سب پیرزادے تھے، ایسے چمٹے کہ پندرہ دن تک آنے نہیں دیا، پھر بڑی مشکل سے وہاں سے نکلے اور اُن لوگوں نے رو رو کر رخصت کیا۔

ایک دفعہ دیوبند میں بڑا جلسہ ہوا، بڑے بڑے علمائے کرام وہاں موجود تھے، مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے ان کو کھڑا کر دیا، میں نے کہا جی یہ بیچارے ایسے بڑے علماء حضرات کے سامنے کیا کہیں گے؟ مولانا نے

(۱) مولانا محمد ابراہیم صاحب اس بستی کا نام "سنگیاں" بتلاتے ہیں۔ (۲) پنجاب کی مشہور عاشقانہ و عارفانہ مثنوی (۳) ملفوظات قلمی، مجلس ۴ ربجادی الثانیہ ۱۳۷۴ھ (۲۶ جنوری ۱۹۵۵ء) بمقام لاہور، کوٹھی صوفی عبد الحمید صاحب (۴) حضرت کے رفیق درس مولانا فضل احمد صاحب کے بھتیجے، نہایت صاحب استعداد و صاحب صلاح تھے، جوانی میں انتقال ہو گیا۔

فرمایا کہ بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی سے معلوم ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے بڑے کام لیتے ہیں، چنانچہ تین گھنٹے تک تقریر کی اور بڑا اثر ہوا۔[1]

حضرت تمام کامیاب اور انقلاب انگیز دینی تحریکوں اور اصلاحی کوششوں کو ان کے داعیوں اور قائدین کے اخلاص، عشق و محبت اور درد و سوز کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ "ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد" چنانچہ مرکز نظام الدین دہلی کی عالمگیر دینی دعوت اور اس کے محیر العقول اثرات و نتائج کو اس کے داعی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جن کے اخلاص و مقبولیت عند اللہ کے حضرت بیحد معتقد تھے) کی اندرونی کیفیات، جذب دل سوز و دردمندی اور اخلاص و للّٰہیت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔[2]

جماعت کا وجود افراد پر اور اجتماعی اصلاح انفرادی اصلاح پر موقوف ہے

حضرت کی نظر سے یہ بات مخفی نہ تھی کہ سب ایسے صاحب تاثیر اور صاحب نسبت نہیں ہو سکتے جیسے یہ حضرات تھے اور نہ دین کی خدمت اور وعظ و ارشاد کا فریضہ ان غیر اختیاری کیفیات پر منحصر ہے، مگر آپ کا یہ خیال ضرور تھا کہ جماعت کا وجود افراد پر اور اجتماعی اصلاح کا انفرادی اصلاح پر موقوف ہے اور مصلح سے پہلے صالح بننا ضروری ہے۔

---

(۱) ملفوظات قلمی مجلس ۲۴ر جمادی الثانیہ ۱۳۷۶ھ (۲۶ر جنوری ۱۹۵۷ء)

(۲) قائد کا اخلاص جب انتہائی مدارج پر پہونچ جاتا ہے تو وہ اپنے رفقاء اور پیرووں کی کثیر تعداد میں اخلاص و جذبہ عمل اور عشق کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جیسا کہ تبلیغی تحریک میں دیکھا جا رہا ہے، مگر پھر بھی حصول اخلاص و احسان کیلئے ذاتی جد و جہد کی ضرورت رہتی ہے۔

مخلص کیلئے خدا کی توفیق

نیز اس بات پر آپ کو بڑا وثوق تھا اور بکرات و مرات یہ بات فرمائی کہ انسان کو اخلاص و ہمت کے ساتھ اپنی اصلاح اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو جانا چاہیئے اور اپنی طرف سے اپنے لئے کچھ تجویز نہیں کرنا چاہیئے مربی مطلق اور مرشد حقیقی اس کے لئے جس کام کو مناسب سمجھے گا اس کام پر اس کو لگا دیگا اور اس کی طرف اس کی طبیعت میں میلان قوی اور اس کے ساتھ مناسبت تامہ پیدا کر دے گا اور پھر اس کام میں اس کی مدد فرمائے گا،

کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

ایک بار اسی طرح کا سوال کیا گیا تو اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:۔

"میرے خیال میں اصل مقصود تو ہر شخص کو اپنے نفس کی اصلاح ہے فرائض و واجبات و عبادات ادا کرتا رہے اور اللہ اللہ کرتا رہے، اگر اللہ تعالےٰ کو اس سے کوئی کام لینا مقصود ہوتا ہے تو خود ہی اسکی طبیعت کو اس طرف متوجہ کر دیتے ہیں، اور یا بطریق الہام یا بحکم شیخ اسکے کوئی کام سپرد کر دیا جاتا ہے، اس وقت اس کیلئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ جو کام اسکے ذمہ لگایا گیا ہے اس کو انجام دے اور جب تک یہ نہ ہو اس وقت تک انفرادی طور پر اللہ اللہ کرتے رہنا اور عبادات ادا کرتے رہنا ہی اس کیلئے بہتر ہے اور اسی سے انشاء اللہ اسکی نجات ہو جائیگی۔"

"فرمایا دیکھو سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم حالانکہ ازکی نفس ہیں مگر آپ کو بھی جبتک مامور من اللہ نہیں کیا گیا آپ غار حرا میں تشریف لے جاکر انفرادی طور پر اللہ کی عبادت ہی کرتے رہتے تھے حالانکہ قوم کی بے اعتدالیاں بُت پرستی، ظلم اور تعدیاں بہت دیکھتے رہتے تھے مگر کسی سے تعرض نہیں کیا اور غاروں میں اکیلے جاکر خدا کی یاد میں لگے رہتے تھے لیکن آخر جب فرشتہ نازل ہوا

اور فرمایا بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ تو آپ غارِ حرا کو چھوڑ کر کمر باندھ کر کھڑے ہو گئے اور اس فرض کو ادا کیا
بہر حال دیگر حضرات کا جو خیال بھی ہو میں اسکے متعلق کچھ نہیں کہتا میرا تو یہی خیال ہے کہ پہلے انفرادی طور پر اپنی اصلاح کرنی چاہیئے اور اپنی ہی فکر کرنی چاہیئے، اللہ تعالےٰ کو اگر اس سے کوئی کام لینا منظور ہو گا تو خود اسکو اسکی طرف متوجہ کر دیں گے، پھر اس کیلئے وہی بہتر ہے اور تبلیغ میں بھی اپنی ہی اصلاح مقصود ہونی چاہیئے[1]"

ایک دفعہ ذکر کی ترقی اور ذکر کی استقامت کا ذکر کرتے ہوئے اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے ارشاد فرمایا:۔

"پوچھا گیا کہ ذکر کی آخر کوئی انتہا بھی ہے؟ فرمایا یہاں تک ذکر کرے کہ روح ذاکر ہو جائے، پوچھا گیا کہ روح کے ذاکر ہونے کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا یہ کہ دھیان ہر وقت اسی کی طرف لگا رہے، خواہ دنیا کے کام کر رہا ہو، تجارت کرتا ہو، کھیتی کرتا ہو، مگر خیال ہر وقت اسی طرف رہے، جیسا کہ کسی کو سر کا درد یا پیٹ میں درد ہو تو اگرچہ باتیں بھی کرتا رہتا ہے کام بھی کرتا رہتا ہے، لیکن خیال درد کی طرف رہتا ہے۔

پوچھا گیا کہ استقامت کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا اس قدر پختگی حاصل ہو جائے کہ جب تک ذکر پورا نہ کرے سکون نہ ہو، بےچینی و بیقراری سی رہے اور جب ذکر پورا کرلے تو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے، طبیعت میں فرحت و سرور محسوس ہو، فرمایا جب اس درجہ پر پہونچ جائے تو اس کا تمام وجود ہی تبلیغ بن جاتا ہے اور اس سے پہلے مجاہدہ ہوتا ہے فرمایا یہاں پہونچ کر اللہ تعالیٰ کو جو کام اس سے لینا ہوتا ہے اسکی طرف اس کو متوجہ کر دیتے ہیں، تبلیغ یا تدریس یا تصنیف، جس کام کی طرف اسکی طبیعت کا رجحان

(۱) ملفوظات (قلمی) ملفوظہ ۲۵ ر رمضان ۱۳۷۳ھ (۲۸ مئی ۱۹۵۴ء) بمقام گھوڑا گلی کوہ مری۔

ہوتا ہے وہی خدمت اس سے لیتے ہیں بعض اوقات الہام کے ذریعہ سے حکم دیا جاتا ہے بعض اوقات شیخ حکم دیتا ہے اور کبھی خود بخود طبیعت متوجہ ہو جاتی ہے"۔(۱)

اس اصلاح باطن اور اخلاص کی دولت کے حصول کے بعد اس کی دینی خدمتوں اور دینی و علمی اشغال کا عالم دوسرا ہوتا ہے۔ خود امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا اظہار فرمایا ہے کہ حصول یقین و اخلاص کے بعد کے اور اسکے پیشتر کے مشاغل خدمات میں زمین و آسمان کا فرق تھا، پہلے وہ کام تقاضائے نفس یا ضابطہ کی تکمیل کیلئے کرتے تھے اب حکم الٰہی سے"۔(۲)

اجتماعی اور متعدی کام کی اہلیت و صلاحیت

حضرت کا مقصود دینی مشاغل و خدمات سے چھڑانا اور اجتماعی زندگی اور جدوجہد سے نکال کر مستقل طور پر انفرادی اصلاح اور خلوت و عزلت میں بٹھانا نہیں تھا، آپ کا مقصود عوام میں انکے درجہ کا اخلاص، تعلق باللہ اور شریعت کی پابندی پیدا کرنا اور خواص (علماء، مدرسین، مقررین، اہل قلم، اہل سیاست) میں انکے درجہ، انکے کام کی نزاکت و وسعت اور انکے ابتلاء اور فتنوں کے مواقع کے بقدر ان میں اخلاص، تعلق مع اللہ اور ایمان و احتساب و تصحیح نیت کا ملکہ پیدا کرنا تھا، آپ خوب سمجھتے تھے کہ درد و اخلاص کے بعد انکے علم و ذہن کے جوہر زیادہ کھلیں گے اور ان کی تھوڑی کوششیں کہیں زیادہ بارآور ہوں گی۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

قلوب و نفوس کی تربیت کا ایک مرکز

جیسا کہ آپ کا ارشاد گزر چکا ہے، اخلاص کیساتھ مدت تک اللہ کا نام لینے اسکے راستہ

(۱) ملفوظات قلمی، ملفوظ ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ (۲۴ مئی ۱۹۵۴ء) بمقام گھوڑا گلی، کوہ مری۔

(۲) ملاحظہ ہو المنقذ من الضلال ص ۱۵۳۰ و ص ۱۵۴ طبع دمشق۔

میں اپنی ہستی کو فنا کرنے اور ایک صادق و مخلص بندہ کے ساتھ وابستہ رہنے اور اسکی اطاعت وانقیاد و خدمت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے وقت کی ایک اہم ترین خدمت آپکے سپرد فرمائی اور بظاہر ایک گوشہ میں بٹھا کر قلوب و نفوس کی تربیت، حصول اخلاص و اصلاح اخلاق کی دعوت اور معرفت و یقین اور عشق و محبت کی دولت کو عام کرنے کا کام سپرد کیا کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور درد و خلوص والوں سے درد و خلوص ملتا ہے۔

اخلاص عمل مانگ نیا گان کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

عمومی بیعت اور اسکے اثرات

آپ کے اخلاص، وسعت اخلاق، شفقت و محبت اور اپنے کام میں انہماک و یکسوئی کی وجہ سے بہت جلد رائپور کی خانقاہ مرجع خاص و عام بن گئی، سہارنپور کا ضلع خصوصیت کیساتھ اور وہ آبہ عمومیت کے ساتھ بزرگوں کے ساتھ عقیدت رکھنے والا اور خدا کے نام کی چاشنی کا لذت آشنا ہے، رائپور کے اطراف اور کوہ شوالک کے دامن اور جمنا کے کنارے کے دونوں طرف کا علاقہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہٗ کے ساتھ بالعموم عقیدت و ارادت رکھتا تھا، جا بجا ضلع میں، پہاڑ پر، کھادر کے علاقہ اور جمنا کی ترائی میں آپ کے خدام اور آپکے قائم کئے ہوئے مدارس و مکاتب پھیلے ہوئے تھے، حضرت کی وفات کے بعد یہ سب اہل ارادت و تعلق آپ سے مانوس اور متعلق ہوئے، پرانے خدام نے آنا جانا اور ذکر کرنا شروع کیا، ان کی ترغیب یا ان کی صحبت کے اثر سے نئے نئے لوگ بیعت کیلئے آنے لگے اور بڑی تعداد میں داخل سلسلہ ہونے لگے، آپ علماء و خواص کو بیعت کرنے میں جتنے محتاط اور متامل تھے، عوام کو اللہ کا نام سکھانے اور توبہ کرا دینے میں نہیں تھے، بعض مرتبہ فرمایا کہ یہ لوگ نہایت

سادہ طبیعت مخلص اور سچے ہوتے ہیں، ان کی اور کوئی غرض نہیں ہوتی صرف توبہ کرنا چاہتے ہیں، میں بھی اس خیال سے پس وپیش نہیں کرتا کہ شاید ان کے خلوص کی برکت سے میری بھی نجات ہوجائے اور ان کے ساتھ میں بھی توبہ کرلوں، آپ بالعموم بیعت و توبہ کراتے ہوئے حسب ذیل الفاظ میں تلقین فرماتے تھے۔

"کہو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ، یا اللہ ہم توبہ کرتے ہیں کفر سے، شرک سے، بدعت سے، زنا سے چوری سے، غیبت سے، جھوٹ بولنے سے، نماز چھوڑنے سے، اور سب گناہوں سے جو ہم نے اپنی ساری عمر میں کئے، چھوٹے ہوں یا بڑے، اور اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ تیرے سارے حکم مانیں گے، تیرے رسول پاک کی تابعداری کریں گے، یا اللہ تو ہماری توبہ قبول کرلے، ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہمیں توفیق دے اپنی رضامندی کی، اپنے رسول پاک کی تابعداری کی۔"(۱)

توبہ کی تلقین کے بعد خاص طور سے فرماتے تھے کہ نماز با جماعت کی پابندی کرنا، تمام خلاف شریعت کاموں سے بچتے رہنا، موت کو یاد رکھنا، مرنا ہے، یہاں سے چلا جانا ہے، وہاں

(۱) ان الفاظ و معاہدہ کا ماخذ چھٹے کلمہ (رد شرک) کے الفاظ ہیں، ایک مرتبہ آپ نے اپنے ایک خادم کو بیعت لینے کی اجازت دی، انھوں نے کہا مجھے بیعت کرنے کا طریقہ بھی نہیں آتا فرمایا تم نے مجھے کبھی نہیں دیکھا یہی تو ہے کہ چھٹے کلمہ کے الفاظ کے مطابق توبہ کرادی جائے، وہ الفاظ بھی آپ نے پڑھ کر سنائے، اللّٰھمّ انّی اعوذبک من ان اشرک بک شیئا وانا اعلم بہ واستغفرک لما لا اعلم بہ تبت عنہ وتبرات من الکفر والشرک والکذب والغیبۃ والنمیمۃ والبھتان والمعاصی کلھا، اسلمت وآمنت واقول لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (روایت مولوی محمد یحییٰ صاحب بھاول نگری)

عملوں کے سوا کچھ کام نہیں آئے گا، پڑھنے کیلئے تیسرے کلمہ استغفار و درود شریف کی ہدایت فرماتے تھے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ سب اقرار کرنے والے سو فیصدی اس پر قائم رہتے تھے اور سب کی زندگی میں انقلاب عظیم ہوجاتا تھا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسرے مقبول و مخلص مشائخ طریقت اور بزرگان دین کی طرح یہاں بھی بیعت ہونے والوں میں سیکڑوں خدا کے بندوں کو اس بیعت سے فائدہ پہونچا، بڑی تعداد شرک و بدعات سے تائب اور نماز کی پابند ہوگئی اور ان میں سے بہتوں کو اللہ کے ذکر کی توفیق اور اصلاح حال و ترقی کی سعادت نصیب ہوئی، لایحصیهم الا اللہ تعالیٰ۔

بعض مرتبہ ایک ناواقف شخص کو اس سلسلۂ بیعت اور اس کی وسعت وعمومیت کو دیکھ کر شبہ اور خلجان ہوتا کہ اس طرح بیعت سے پیشتر تحقیق و تفتیش اور بیعت بعد تعلیم و تربیت کے مستقل و قابل اطمینان انتظام کے بغیر آپ کیوں اس فراخ دلی اور فراخ دامانی کے ساتھ ہر کس و ناکس کو بیعت میں قبول فرمالیتے ہیں، اور اسکی افادیت کیا ہے؟ یہ شبہ مشائخ طریق کے طرز عمل کی بنا پر پہلے بھی ہوا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی کی زبان مبارک سے اس کا جواب اور اسکی وجہ سن لی جائے، قاضی ضیاء الدین برنی صاحب "تاریخ فیروز شاہی" کے دل میں یہی خطرہ گزرا تھا۔ حضرت خواجہ نے اپنی فراست اور نور باطن سے معلوم کرکے اس طرح تشفی فرمائی۔

"میں مرید کرنے میں کیوں زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیتا اور اپنا اطمینان نہیں کرتا، ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں علی سبیل التواتر سن رہا ہوں کہ بہت سے مرید ہونیوالے معصیت سے تائب ہوجاتے ہیں، نماز با جماعت ادا کرنے لگتے ہیں اور

اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاتے ہیں، اگر میں بھی شروع ہی سے اس بات کی شرط کروں کہ ان میں ارادت کی حقیقت یعنی انقطاع کلی پایا جاتا ہے کہ نہیں، اور ان کو توبہ و ترک کا خرقہ (جو خرقۂ ارادت کی جگہ پر ہے) نہ دوں تو وہ خیر کی اس مقدار سے بھی جو ان اللہ کے بندوں سے وجود میں آرہی ہے محروم ہو جائیں گے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ بغیر اس کے کہ میرے دل میں خیال آئے، یا میں اس کی درخواست اور التماس کروں یا کوئی وسیلہ اور سفارش اختیار کروں شیخ کامل و مکمل (شیخ کبیر) نے مجھے بیعت لینے کی اجازت دی، میں دیکھتا ہوں کہ ایک مسلمان بڑی عاجزی و درماندگی اور بڑی مسکنت اور بیچارگی کے ساتھ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تمام گناہوں سے توبہ کی، میں یہ سمجھ کر کہ شاید اس کی بات سچ ہو اس کو بیعت کر لیتا ہوں، خاص طور پر اس لئے کہ بہت سے معتبر لوگوں سے سنتا ہوں کہ بہت سے بیعت کرنے والے بیعت کی وجہ سے معاصی سے باز آجاتے ہیں۔[1]

اس ارشاد کی تصدیق ان بیعت کرنے والوں کے حالات کو دیکھ کر اور ان کے مقامات پر جا کر ہو سکتی ہے، مولانا ضیاء الدین برنی نے حضرت خواجہ کے فیض عام اور عمومی زندگی پر ان کی محبت و تعلق اور بیعت و ارادت کے گہرے اور وسیع اثرات کا جو نقشہ کھینچا ہے[2] اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خدا کے بندوں کے ہاتھ میں ہاتھ دینے اور انکے مخلص و بابرکت ہاتھوں پر توبہ و اقرار کرنے اور اپنے کو کسی مرکز ہدایت و ارشاد سے فسلک و متعلق سمجھ لینے کے نفسیاتی اثرات اور روحانی برکات کیا ہوتے ہیں، ضلع سہارن پور

(۱) سیر الاولیاء ص ۳۴۶، ۳۴۸ بحوالہ حسرت نامہ تصنیف مولانا ضیاء الدین برنی۔

(۲) ملاحظہ ہو۔ تاریخ فیروز شاہی از مولانا ضیاء الدین برنی یا بزم صوفیہ از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مظفر نگر، میرٹھ، دہلی کا یہ علاقہ جو مدت دراز سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان، پھر سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے متبع سنت وحامی شریعت مشائخ کبار اور تھانہ بھون گنگوہ، رائے پور، دیوبند کے روحانی مرکزوں سے وابستہ ہے اپنے صحت عقائد، نماز روزہ کی پابندی، اسلامی شعائر کے احترام، شرک وبدعات سے اجتناب اور رسوم مروجہ سے علیحدگی میں امتیاز رکھتا ہے، اس امتیاز کا یہی راز ہے۔

خصوصی استفادہ و اصلاح

رائے پور کی خانقاہ چونکہ رسوم وقیود سے بہت آزاد اور حضرت کی طبیعت مبارک بہت جامع، وسیع اور دار وگیر سے دور تھی، نیز مختلف ماحول اور طبقات کے لوگوں کا آپ سے تعلق اور عقیدت اور آپکو ان سے محبت تھی، اسلئے مختلف ذوق اور مکاتب فکر کے صحیح الخیال علماء، سیاسی رہنما، قومی کارکن اہل مدارس، اہل قلم وصاحب تصنیف، جدید تعلیم یافتہ اور قدیم مدارس کے فضلاء اپنی اصلاح و تربیت اور اپنے اپنے خلاء کی تکمیل کیلئے حاضر ہونے لگے[1]۔ ان میں بہت سے ایسے تھے کہ عرصہ سے

(۱) ان آنے والوں میں سیاسی ذوق دینی فکر اور ثقافت وتعلیم کا جو اختلاف وتنوع تھا اس کا کسی قدر اندازہ اس مختصر فہرست سے ہو سکتا ہے جس میں زیادہ استیعاب واستقصاء سے کام نہیں لیا گیا اور بہت سے ممتاز اہل علم وفکر کے نام چھوٹ گئے ہیں۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد صاحب انوری مولانا محمد ابراہیم، مولانا سعید احمد صاحب ڈونگوی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا عبدالرشید نعمانی، مولانا عبدالوہاب خاں رامپوری، خواجہ عبدالحی فاروقی مرحوم، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا سید فخر الحسن استاذ دارالعلوم دیوبند، مولانا زاہد حسن، حاجی عبدالواحد ایم اے، ماسٹر منظور محمد صاحب ایم اے، پروفیسر عبدالمغنی ایم اے صوفی عبدالحمید صاحب سابق صدر مسلم لیگ پنجاب و وزیر حکومت پنجاب، سید محمد جمیل صاحب سابق اکاؤنٹنٹ جنرل حکومت پاکستان، حاجی عبدالحمید صاحب ڈائرکٹر جنرل ٹیلی فون وٹیلیگراف حکومت پاکستان، حاجی ارشد صاحب مرحوم چیف انجینیر ٹیلیفون حکومت حجاز، چودھری عبدالحمید خاں مرحوم کمشنر بحالیات مغربی پنجاب

دین وعلم دین کی خدمت، اصلاح وتبلیغ، تصنیف وتقریر، یا مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی اور قومی خدمت میں مشغول تھے اور ہندستان کی علمی یا سیاسی محفلیں، ان کی علمی لیاقت سحر انگیز خطابت یا مفکرانہ قیادت کی شہرت وآوازہ سے گونج رہی تھیں اور وہ خود ہزاروں مسلمانوں کے مرجع اور مرکز عقیدت بنے ہوئے تھے، لیکن ان کو خود (اس پوری دینی و علمی مشغولیت وافادہ کے ساتھ) اپنے اخلاص واخلاق کی تکمیل کیلئے ایک شیخ کامل اور ایک طبیب حاذق کی تربیت وصحبت کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس ضرورت کا احساس ان کو کشاں کشاں حضرت کے پاس لایا اور انھوں نے رائپور پہونچ کر بصد شوق و بکمال جوش خواجہ حافظ کی زبان میں عرض کیا ؎

تو کہ کیمیا فروشی نظرے بقلب ما کن
کہ بضاعتے نہ داریم وفگندہ ایم دامے

چھٹا باب (۶)

رائے پور کے شب و روز

کہ بر در نبرد شاہان زمن گدا یا مے | کہ بکوئے مے فروشاں دو ہزار جم بجامے
شدہ ام خراب بدنام وہنوز امیدوارم | کہ ز بد خلاص یابم بدعائے نیک نامے (خواجہ حافظ)

انسانیت کی صحت گاہیں

جنھوں نے ہندستان میں فقر و تصوف کی تاریخ پڑھی ہے یا کبھی اس مقصد و ذوق کے ساتھ اس ملک میں سفر کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جس طرح شیر شاہ سوری نے اپنی تاریخی شاہراہ پر دو رویہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے کارواں سرائیں تعمیر کرائی تھیں، جہاں مسافر قیام کرتے، خوراک حفاظت اور آرام کی جگہ پاتے اور راہ کی خستگی و ماندگی دور کرکے تازہ دم ہو کر اپنا سفر شروع کرتے اسی طرح فیاض دل اور فیاض روح درویشوں اور انسانیت کے چارہ سازوں نے زندگی کے تھکے ہارے مسافروں اور مادیت کے تقاضوں اور مطالبوں سے پامال کئے ہوئے انسانوں کیلئے جنکو اپنے دل کی زندگی دم توڑتی اور روح کا شعلہ بجھتا نظر آتا تھا، ایسی پناہ گاہیں اور کارواں سرائیں تعمیر کی تھیں، جہاں کچھ دن ٹھہر کر دل کے چراغ کی لو نیا روغن اور روشنی پاتی، افسردہ قویٰ میں تازگی اور روح میں جلا پیدا ہوتی، غفلت اور معاصی کے مقابلہ کرنے اور اسلام کے پل صراط پر احتیاط و ثبات کے ساتھ چلنے کا عزم اور قوت پیدا ہوتی،

قوی الارادہ اور صاحب عزیمت لوگوں کی ہمت وقوت دیکھ کر اپنے کمزور ارادہ میں قوت اور اپنی ضعیف ومذبذب طبیعت میں ہمت محسوس ہوتی، فرائض کے پابند، سنن وآداب کے پابند بنتے، غافل، ذاکر، نمازوں میں سستی کرنے والے شب بیدار بن جاتے، اسباب کے پرستار اور مادیت کے گرفتار جو مستقبل کے خوف اور فقر وفاقہ کے ڈر سے ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتے اور تدبیر ووسائل کو رازق حقیقی سمجھتے، وہ ایک درویش خدامست کے توکل وتبتل کا منظر اور اللہ تعالیٰ کی مسبب الاسبابی کا تماشہ دیکھ کر توکل کے مفہوم سے آشنا اور یقین کی دولت سے بہرہ یاب ہوتے۔

دہلی، نواح دہلی اور دوآبہ میں متعدد ایسی خانقاہیں اور روحانی تربیت کے مرکز تھے جو پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھے، دہلی کی شہرۂ آفاق خانقاہوں کے دور انقلاب کے بعد اخیر دور میں گنگوہ اور تھانہ بھون کے روحانی وتربیتی مرکز مرجع خاص وعام بنے ہوئے تھے، پھر جب ان پر بھی دور انقلاب آیا اور سنت اللہ کے مطابق رشد وہدایت کی یہ شمعیں بھی (اپنے مشائخ کی وفات کے بعد) خاموش ہوگئیں تو اسی سلسلۂ روحانی کی ایک کڑی رائے پور کی خانقاہ نہ صرف اس نواح بلکہ صوبجات متحدہ سے لے کر پنجاب تک کا روحانی وتربیتی مرکز بن گئی، ملک میں بڑے بڑے انقلاب آئے بڑے بڑے سیاسی طوفان اٹھے، اور آندھیاں چلیں، ملک تقسیم ہوا، لیکن ان تیز وتند ہواؤں میں بھی یہ چراغ جلتا رہا، نہ رائے پور میں ذکر اللہ کی سرگرمی میں کوئی فرق آیا اور نہ یہاں کی دعوت اور موضوع میں کوئی تبدیلی ہوئی۔

رائے پور کی خانقاہ | رائے پور کی بستی[1] اور خانقاہ کے درمیان نہر حائل ہے بستی سے

(۱) رائے پور شہر سہارنپور سے بجانب شمال ۲۲ میل پر واقع ہے، سہارنپور سے چلکر وہ تک جو پختہ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۹ پر)

جانب غرب نہر کے کنارے کچھ فاصلہ پر وہ کوٹھی ہے جس میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس اللہ سرہ العزیز کا قیام تھا، اس سے جانب غرب مسجد اور مدرسہ کی پختہ عمارت ہے، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی حیات تک یہی خانقاہ اور اسی کے گرد و پیش طالبین خدا کا قیام تھا، جب حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کے لئے چودھری محمد صدیق صاحب نے اپنے باغ میں جو مسجد سے مغربی جانب واقع ہے، نئی قیام گاہ تعمیر کرا دی تو نئی خانقاہ وہیں منتقل ہو گئی،[1] اس کے سامنے چند چھپر ڈال دیے گئے سانپوں کی کثرت کی وجہ سے چارپائیوں کا خاص اہتمام کیا گیا، حضرت کی ہمیشہ تاکید ہوا کرتی تھی کہ رات کو لوگ چارپائیوں ہی پر آرام کریں اور نوافل بھی حتی الامکان کسی بلند جگہ پر پڑھیں جانب شمال ٹین کا ایک لمبا سائبان تھا اور ایک بڑا دالان اور برآمدہ، اس طرح کثیر تعداد کے لئے رہائش اور بقدر ضرورت آسائش کا سامان تھا، گرمیوں میں چھپروں میں رات بڑی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی، پہاڑ کے دامن اور جمنا کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے بڑی ٹھنڈی ہوا آتی، خصوصاً شمالی ہوا بڑی خنک اور لطیف ہوتی، جاڑوں میں بستروں اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۸ کا) سڑک جاتی ہے اس کے ۱۰، ۱۹ میل پر گنڈیور کے پل سے جانب شمال چار میل پر دائپور کی بستی آتی ہے یہ مسلمان راجپوتوں اور مسلمان شرفاء کی بستی ہے، نواب زادہ لیاقت علی خاں کا ننھیال یہیں تھا حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہٗ بھی یہیں کے نواسے تھے اور اپنے وطن تیگری (انبالہ) سے آپ یہاں منتقل ہو گئے تھے، اور اسی کو آپ کے روحانی فیوض کا مرکز اور مدفن بننے کا شرف حاصل ہوا۔

(۱) وفات سے قریباً ڈیڑھ سال بیشتر پھر آپ کا قیام حضرت کی سابقہ کوٹھی میں ہو گیا اور مقیمین خانقاہ کی بڑی تعداد اس کے آس پاس مقیم ہو گئی، حضرت دس روپیہ ماہوار کے حساب سے اس کا کرایہ مدرسہ کو ادا فرماتے تھے۔

لحافوں کا خاصا ذخیرہ تھا(۱) جو ایسے مسافروں اور طالبین کے کام آتا جو اپنا بستر نہ لاتے۔

عرصہ تک گنڈیور کے پل سے رائے پور کی خانقاہ تک کسی سواری کا انتظام نہیں تھا طالبین وزائرین عام طور پر نہر کی پٹڑی پر ۳½ میل کی مسافت پیادہ پا طے کرتے، بالکل اخیر زمانہ میں بہٹ سے (جو سہارنپور سے سولہ میل اور رائپور سے چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور ایک مرکزی مقام ہے) رکشے مل جاتے اور خاص اہتمام سے کار بھی آجاتی ایک زمانہ میں سہارنپور سے بہٹ تک بھی آنے کیلئے تانگہ کے علاوہ اور کوئی سواری نہ تھی، بعد میں سہارنپور سے بکثرت لاریاں چلنے لگیں جو بہٹ یا گنڈیور کے پل پر اتار دیتیں سواریوں کی دشواری ونایابی اور سواریوں کی کثرت وسہولت کے ہر دور میں طالبین صادق دُور دُور کی مسافت طے کر کے ذوق وشوق سے آتے اور ایک ایک وقت میں (ذکر وتربیت کی نیت سے طویل قیام کرنے والوں اور مقیمین کے علاوہ) مہمانوں کی بڑی تعداد ہوتی۔

رائے پور کا نظام الاوقات

نظام الاوقات یہ تھا کہ رات کے پچھلے حصہ میں بالعموم سب ہی جاگ جاتے اور طہارت ووضو سے فارغ ہو کر نوافل میں مشغول ہو جاتے، بعض لوگ مسجد چلے جاتے، اکثر وہیں چٹائیوں اور چارپائیوں پر نوافل ادا کرتے، پھر ذکر جہر میں یا مراقبہ میں مشغول ہو جاتے، اس وقت رات کے اس سناٹے میں اور جنگل کی اس خاموش فضا میں خانقاہ اللہ کے نام کی صداؤں اور ذکر کی آوازوں سے گونج جاتی، اور حسب استعداد وتوفیق لوگ اس فضا سے مکیف ہوتے اور سرورومستی کی ایک عام کیفیت ہوتی، اس وقت ہر ایک آزاد اور اپنے حال میں مشغول ہوتا، کوئی کسی سے تعرض نہ کرتا۔

---

(۱) مولانا عبداللہ صاحب دھرم کوٹی فرماتے تھے کہ پہلے سو ڈیڑھ سو اخیر میں ۲۰۔۲ سو مہمانوں کے قیام کا انتظام تھا

صبح صادق کے طلوع کے ساتھ ہی مسجد میں اذان ہو جاتی، اذان وجماعت کے مابین (جو اچھا خاصا وقت ہوتا) چائے آجاتی، خانقاہ کے ناظم مطبخ حاجی ظفرالدین صاحب (جن کا خس پوش مکان یا جھونپڑا خانقاہ ہی میں جانب جنوب واقع ہے) ایسے سویرے کے وقت میں محض اپنے مختصر گھر لانے کی مدد سے چائے کا انتظام کر لیتے اور سب کو فارغ کر دیتے، حضرت بھی جب تک چائے نوش فرماتے تھے اسی وقت چائے سے فارغ ہو جاتے بعد میں چائے کے بجائے دودھ دوا وغیرہ کا معمول اسی وقت پورا ہو جاتا اخیر زمانہ کے تین چار سال مستثنیٰ کر کے حضرت ہمیشہ نماز کے لئے مسجد جاتے، اکثر خدام اور حاضرین خانقاہ ساتھ ہوتے، نماز سے فارغ ہو کر (جب تک آپ میں قوت تھی) پابندی کے ساتھ سیر کو تشریف لے جاتے، بالعموم نہر کی پٹری پر گنڈ لپور کی طرف اور دومونہی تک (جو دو میل کے قریب ہے) تشریف لے جاتے، مجموعی طور پر چار میل کی سیر ہو جاتی، ایک عرصہ تک خصوصی مہمانوں کو حضرت یہاں تک پہنچانے بھی تشریف لاتے، کبھی میدان میں اس رَد کے کنارے جو خانقاہ کے محاذی مشرق سے مغرب کو گئی ہے، تشریف لے جاتے، اس سیر میں بالعموم مجمع نہ ہوتا، شروع میں تنہا تشریف لے جاتے، بعد میں جب کسی قدر ضعف ہو گیا تھا ایک دو خادم ساتھ ہوتے اور کوئی ایسے صاحب جو اپنا کوئی حال یا کیفیات سنانا چاہتے یا جن کو جلد رخصت ہونا ہوتا، اس میں ہمیشہ معمول قرآن پڑھنے کا رہا۔

واپسی پر ابتدا میں مزار پر کچھ دیر بیٹھتے، بعد میں یہ معمول جاتا رہا، کچھ دیر موسم کے مطابق باہر تشریف رکھتے، پھر اندر تشریف لے جاتے، کوئی موسم ہو اور مہمان کم ہوں یا زیادہ، اچانک اسی وقت آگئے ہوں، یا پہلے سے ٹھہرے ہوں ۱۰ ½، ۱۱ بجے کھانا

آجاتا، بالعموم وہی وقت باہر کے لوگوں کے آنے کا ہوتا تھا اور پہلے سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ کتنے مہمان آرہے ہیں بلا توقف وانتظار دستر خوان لگادیا جاتا، کھانا عموماً نہایت سادہ اور بالعموم دال روٹی ہوتی، جب تک حضرت کی صحت اجازت دیتی رہی، مہمانوں کے ساتھ ہی کھانا تناول فرماتے تھے، اخیر زمانہ میں خاص مہمانوں کی رعایت سے حضرت کے مخصوص خدام راؤ (عطاء الرحمٰن خاں اور حاجی فضل الرحمٰن خاں) اپنا اپنا کھانا بھی لے آتے تھے اور مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر نشست ہوتی اس کا بھی کوئی خاص موضوع مقرر نہیں تھا، کبھی بزرگوں کے تذکرے ہوتے کبھی کوئی اور مضمون، ۱۲ بجے کے قریب آرام فرماتے لوگ بھی آرام کرتے، ظہر کی اذان سے پیشتر یا اذان پر (حسب ضرورت ومعمول) لوگ اٹھ جاتے اور مسجد میں جاکر نماز پڑھتے، نماز ظہر کے بعد حضرت تخلیہ میں چلے جاتے، سفر حضر یہ قدیمی و دائمی معمول تھا، صرف رائے پور میں کوٹھی کے قیام کے آخری ایام میں اسکی پابندی نہیں رہی تھی، اس تخلیہ میں حضرت کا کیا معمول تھا؟ مراقبہ میں مشغول رہتے یا تلاوت ونوافل میں اس کا تعین نہیں ہوسکا، عام طور پر صلوٰۃ التسبیح یا ذکر جہر کا معمول تھا، اس تخلیہ کا بڑا اہتمام والتزام تھا عصر کی نماز سے کچھ پیشتر باہر تشریف لاتے بعض مرتبہ باہر تشریف لانے سے پہلے کسی کو اگر خصوصی گفتگو کرنی ہوتی یا عرض حال کرنا ہوتا تو اندر طلب فرمالیتے، ابتداء میں خدام کا بیان ہے کہ چہرۂ مبارک پر ایسا جلال اور مستی کی کیفیت ہوتی کہ نظر روبرو کرنا مشکل ہوتا اس وقفہ میں خاص مہمانوں اور علماء وخواص کی پذیرائی بھی فرماتے اور انکی طرف خصوصی التفات فرماتے، اسی اثناء میں چاء اور اخبار آجاتے، بعض حضرات اخبار کی اہم خبریں پڑھ کر سناتے، یہ کام اخیر زمانہ میں حاجی فضل الرحمٰن خاں کے سپرد تھا،

وہ خبروں پر پہلے سرخی سے نشان لگا لیتے بعض بعض اہم مضامین بھی پڑھ کر سنائے جاتے حضرت کبھی کبھی کچھ ارشاد بھی فرما دیتے، اخبارات کا انتظار رہتا اور پابندی سے وہ پڑھے جاتے بعض زمانہ میں یہ سلسلہ عصر کے بعد رہتا۔

عصر کی نماز کے لئے مسجد جاتے، فارغ ہو کر مغرب تک موسم کے تغیرات کے مطابق کمرہ کے اندر یا باہر صحن میں عام نشست ہوتی، اسی موقع پر بستی کے حضرات اور گاؤں کے لوگ اور مقیمین خانقاہ جو اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوتے تھے، آجاتے تھے، اخیر کے ۴، ۵ سال چھوڑ کر (جس میں اس وقت پابندی سے کتاب سنائی جاتی تھی) اس مجلس کا کوئی مقرر و خاص موضوع نہ تھا، موسم، سیاسیات، حالات واقعات بزرگان دین کے تذکرے، کوئی استفسار کیا جائے تو اس کا جواب، غرض ہر طرح کی مباح و جائز گفتگو ہوتی، اس مجلس میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (جو اکثر تشریف لایا کرتے اور کئی کئی دن قیام فرماتے) تشریف رکھتے تو اس کا کیف رونق اور شگفتگی دوبالا ہو جاتی، حضرت (جب فرش پر نشست ہوتی) تو اپنے برابر ان کے لئے مسند رکھواتے، چارپائیوں پر نشست ہوتی تو اپنے برابر کی چارپائی پر فرش کروا کے اور تکیہ رکھوا کر بٹھاتے، کوئی استفسار ہوتا تو اکثر اس کا جواب شیخ پر محول فرماتے اور فرماتے کہ حضرت کیا ارشاد ہے؟ ان دونوں حضرات کی موجودگی کے زمانہ کی یہ محفلیں چشم فلک کو عرصہ تک یاد رہیں گی۔

حاضرین میں سے بڑے علماء اور قابل احترام حضرات کے لئے بھی خصوصی نشست اور آرام دہ جگہ کا اہتمام ہوتا خاص طور پر حضرت مولانا فضل احمد[1] صاحب کیلئے اسی اہتمام

(۱) حضرت مولانا فضل احمد صاحب نہایت جید الاستعداد، مخلص اور شفیق استاد تھے (باقی حاشیہ صفحہ ۱۱۵ پر)

کا معمول تھا، وہ الگ ایک چارپائی پر فروکش ہوتے اور ہمیشہ خاموشی کے ساتھ مجلس میں شریک رہتے۔

غروب کے ٹھیک وقت کا اور گھڑی کو اس کے مطابق صحیح کرنے کا بڑا اہتمام تھا، اس کیلئے کئی اصحاب کھلے میدان میں سورج کے غروب ہونے کو دیکھنے کیلئے جاتے اور آکر صحیح صحیح وقت بتلاتے۔

مغرب کے بعد اہل خانقاہ نوافل و ذکر میں مشغول ہو جاتے، مغرب کے بعد کا یہ وقت زیادہ تر ان طالبین و سالکین کے لئے مخصوص تھا، جن کو اپنے ذکر و سلوک کے سلسلہ میں کچھ دریافت کرنا یا اپنی کسی خاص کیفیت و حالت کو عرض کرنا ہوتا بالعموم ایسے حضرات پہلے سے عرض کر کے وقت مقرر کروا لیتے، اس وقت کسی دوسرے کی آمد پسند نہیں فرماتے تھے، نہایت شفقت و کرم کے ساتھ حال دریافت فرماتے بڑی توجہ سے بات سنتے اور بڑے اہتمام سے اس کا جواب دیتے اور رہنمائی فرماتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ یہاں کے قیام و اہتمام کا خاص موضوع اور حضرت کی مبارک زندگی کا خاص مقصد ہے اسی وقت میں اکثر لوگ بیعت و توبہ سے مشرف ہوتے۔

عشا کی اذان اول وقت ہو جاتی، معذوری اور ضعف کے زمانہ میں اس کا اہتمام اور بھی بڑھ گیا تھا، عشاء کا وقت ہوتے ہی اذان ہو جاتی، اخیر زمانہ میں اذان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳ کا) حضرت کے ہم سبق اور قدیم رفیق اور مشرقی پنجاب کے اکثر علماء و مدرسین کے استاد تھے اخیر عمر میں تدریسی مشاغل ترک ہو گئے تھے اور بڑا وقت حضرت ہی کی خدمت میں رائے پور میں، اور زمانۂ قیام پاکستان میں لاہور لائل پور وغیرہ میں گزرتا تھا، حضرت کو ان کا بڑا خیال رہتا تھا، اور بہت تعلق خاطر تھا ۶ رجب ۱۳۸۲ھ (مطابق ۱۱ نومبر ۱۹۶۲ء بروز بدھ) منٹگمری (مغربی پنجاب) میں انتقال ہوا۔ رحمۃ اللہ علیہ

وجماعت میں بہت کم فصل ہوتا، نماز کے بعد ہی کھانا آجاتا، معذوری کے آخر زمانہ میں حضرت نماز مغرب کے بعد ہی کھانے سے فارغ ہو جاتے، عام مقیمین خانقاہ اور مہمان عشاء کے بعد متصل کھانا کھاتے، کھانے کے بعد جلد سونے کا اہتمام اور کوشش ہوتی تاکہ رات کو اٹھنے میں آسانی ہو،

حضرت کا نظام الاوقات بیان کرتے ہوئے حضرت کے ایک خاص متوسل لکھتے ہیں

"میں بیس پچیس مرتبہ خانقاہ شریف میں حاضر ہوا، زیادہ سے زیادہ ایک مرتبہ ۲۵ دن کے قریب وہاں رہا، حضرت کا پروگرام حسب ذیل تھا۔

رات کو تقریباً دو بجے اٹھتے تھے، تہجد، ذکر (نفی، اثبات) مراقبہ وغیرہ میں فجر تک مشغول رہتے، فجر کی سنتیں خانقاہ شریف میں پڑھ کر مسجد تشریف لے جاتے تھے، وہاں فرض فجر پڑھ کر سیر کے لئے (۳ میل۔ ڈیڑھ میل جانا ڈیڑھ میل واپسی) نہر جمن غربی کے کنارے تشریف لے جاتے تھے واپسی پر وضو کر کے پھر ذکر و مراقبہ وغیرہ میں مصروف رہتے حتی کہ تقریباً ½ ۱۰ بج جاتے، پھر باہر تشریف لاتے تقریباً ½ ۱۱ بجے تک طعام سے فراغت ہوتی، تقریباً ۱۲ بجے حضرت آرام فرماتے اور ڈیڑھ دو بجے کے قریب بعد دوپہر حضرت پھر اٹھ بیٹھتے استنجا، طہارت، وضو سے فارغ ہو کر ظہر کی سنتیں خانقاہ شریف میں پڑھتے اور فرض مسجد میں ادا کر کے واپس تشریف لاتے اور ، اور پھر ذکر و مراقبہ میں مصروف ہو جاتے، بعض خدام نے حضرت کے کمرہ کے باہر کان لگا کر سنا تو حضرت کو نفی اثبات کا ذکر آہستہ آواز سے کرتے ہوئے سنا اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ ذکر لسانی صرف ایک

ذریعہ ہے، مقصود نہیں ہے، مقصود محض یاد ہے، اگر یاد نصیب ہوجائے تو ذکر لسانی چھڑا دیا جاتا ہے لیکن ایک دفعہ یہ بھی فرمایا تھا کہ بقا کے بعد بھی ترقی عبادات سے ہی ہے، یعنی قرآن پاک کا پڑھنا ذکر آلہی کرنا اس سے ہی ترقی ہے، خاموش بیٹھنے اور محض تدبر سے نہیں، غرضکہ حضرت عصر کے وقت تک اسی طرح مصروف رہتے عصر کی نماز کے بعد عام مجلس ہوتی، حضرت عموماً خاموش رہتے لیکن جب کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب مفصل اور مکمل بسط سے عنایت فرماتے جس سے سامعین کی اور سائل کی مکمل تسلی ہوجاتی، مجھے ایک بھی واقعہ ایسا یاد نہیں جس میں کسی سائل نے سوال کیا ہو اور حضرتؒ کے جواب سے اس کی یا دیگر سامعین کی تسلی نہ ہوئی ہو، مغرب کی نماز کے بعد عشاء تک کا وقت ان سالکین کے لئے مخصوص تھا جو علیحدگی میں کچھ عرض کرنا چاہیں، عشاء کے بعد کھانا تناول فرما کر حضرت آرام فرماتے تھے اور تقریباً چار پانچ گھنٹے آرام کے بعد اٹھ بیٹھتے تھے۔ حضرت کی مجلس کا رنگ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ چھوٹے پیمانہ پر انبیاء کرام علیہم السلام کا رنگ ہے "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" والی حدیث صاف چسپاں ہوتی تھی زہد و توکل، اخلاص، بات بات سے عیاں تھا کوئی چاہے کتنا ہی امیر ہو حضرتؒ کے دربار میں بچھی ہوئی چارپائیوں کے سرہانے کی طرف نہیں بیٹھ سکتا تھا، امراء پائنتی کی طرف ہی بیٹھتے تھے اور علماء کرام کے لئے سرہانے کی طرف مخصوص تھی[1]۔

(۱) مضمون ماسٹر منظور محمد صاحب ایم۔ اے۔

کتابوں کی خواندگی کا سلسلہ

رائے پور کی خانقاہ کی ایک بڑی خصوصیت جو باہر کے آنے جانے والے کو محسوس ہوتی اور جو حضرت کے ایک خاص ذوق اور تقاضائے قلبی کا نتیجہ تھا، مجلس عام میں ان مفید منتخب دینی کتابوں اور مواعظ پڑھنے کا سلسلہ تھا جو زندگی کے آخری برسوں میں حضرت کے یہاں کا ایک ضروری معمول اور ایک وظیفہ اور خانقاہ کی زندگی کا نصاب سا بن گیا تھا، اس پابندی تسلسل اور اہتمام کے ساتھ کسی خانقاہ یا دینی مرکز میں کتابوں کے سننے اور پڑھے جانے کا رواج نہیں دیکھا۔

کئی برس سے یہ معمول ہوگیا تھا کہ عصر کی مجلس میں (جو خانقاہ اور حضرت کے یہاں کی سب سے بڑی عمومی اور وسیع مجلس ہوتی تھی) کوئی ایک قابل اعتماد منتخب دینی کتاب پڑھ کر سنائی جاتی۔ سردی گرمی، تندرستی، بیماری، کسی معزز و ممتاز مہمان، یا کسی جلیل القدر عالم کی آمد کے موقع پر بھی اس میں تخلف نہ ہوتا، جو کتابیں اس مجلس میں زیادہ تر پڑھی گئیں وہ حسب ذیل ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی تصنیفات عام طور پر خصوصیت کے ساتھ خصائل نبوی (ترجمہ شمائل ترمذی) اور کتب فضائل بار بار اور مکرر سہ کرر پڑھی گئیں، حضرت نے کئی بار فرمایا کہ ان کتابوں میں بڑی نورانیت ہے۔

واقدی کی فتوح الشام کا ترجمہ، تاریخ دعوت و عزیمت کا پہلا حصہ بار بار اور دوسرا حصہ ایک دو بار، اور تذکرہ مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کئی بار پڑھا گیا، سیرت سید احمد شہیدؒ بھی (مطبوعہ و قلمی[1]) لاہور و لائل پور کے قیام

(۱) یہ جلد لاہور میں زیر طبع ہے۔

میں پڑھی گئی، قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری کی مقبول کتاب سیرۃ رحمۃ للعالمین کے تینوں حصے بڑے ذوق اور توجہ سے سنے اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

شیخ کی کتابوں کے علاوہ سب سے زیادہ جو کتابیں پڑھی گئیں وہ دو تھیں، مکتوبات حضرت خواجہ محمد معصوم تلخیص و ترجمہ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی (مطبوعہ مکتبہ الفرقان لکھنؤ) اور حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ ترجمہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی، اول الذکر کتاب بار بار رائپور میں مولانا عبدالمنان[1] صاحب نے سنائی اور آخر الذکر مسلسل مہینوں رائپور اور لاہور کے آخری قیام اور مرض وفات میں آزاد صاحب[2] نے پڑھی اور حضرت نے بار بار بڑے جوش کے ساتھ اس پر اپنے تاثر کا اظہار فرمایا، اس کی تصدیق فرمائی اور لوگوں کو متوجہ کیا، اور آپ پر رقت طاری ہوئی۔

ان کتابوں کے علاوہ (جن کے متعلق کہنا مشکل ہے کہ کتنے بار پڑھی گئیں) دار المصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی کی تاریخ و سیر کی کتابیں سیر صحابہ کے مختلف مجموعے، مولانا محمد منظور نعمانی کی کتابیں جو ردّ اہل بدعت اور مسلک دیوبندی کے دفاع میں ہیں، بڑے شوق اور دلچسپی سے سنی گئیں اور مولانا کو اس سلسلہ کے جاری رکھنے کی ہدایت بھی فرمائی۔

---

(۱) حضرت کے خادم خاص دوا غذا ڈاک کے مہتمم اور سفروں کے رفیق خاص، تقریباً ۱۹ سال حضرت کی خدمت میں رہے اور اسی خدمت کے لئے ہندوستان کی شہریت اختیار کی، گوجرانوالہ پنجاب کے رہنے والے اور مدرسہ مظاہر العلوم کے فارغ ہیں۔

(۲) سید مسعود علی نام، حکیم سید محمود علی صاحب فتحپوری کے فرزند، اخیر زمانہ میں (جب سے حضرت کو مسجد تشریف لیجانے سے معذوری ہوئی) خانقاہ اور حضرت کے امام صلوٰۃ تھے۔

عصر کی نماز کے بعد سے مغرب کی اذان تک یہ سلسلہ جاری رہتا، بعض اوقات اذان سے چند منٹ قبل بند ہوتا، بعض مرتبہ بند ہونے پر دریافت فرماتے کہ کیوں خاموش ہو گئے؟ قاری پھر پڑھنا شروع کر دیتا، کتاب شروع ہونے کے بعد حضرتؒ ایسا معلوم ہوتا عالم استغراق میں چلے جاتے، کبھی کبھی متوجہ ہو کر فرماتے کیا فرمایا؟ یا پھر پڑھو، ورنہ بالعموم آپ پر سکوت واستغراق طاری رہتا، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوگوں کے نفع اور ان کو مشغول رکھنے کے لئے اور ان کی مشغولیت کی حالت میں خود مشغول ہونے کے لئے یہ سلسلہ جاری فرماتے تھے،

کسی زمانہ میں اس معمول میں اتنی ترقی اور انہماک ہو جاتا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو کتاب سنے بغیر چین نہیں آتا، بہٹ ہاؤس سہارنپور کے قیام میں اکثر دیکھا گیا کہ نماز فجر کے بعد جو آرام فرمانے کا معمول تھا اس سے بیدار ہو کر فوراً آزاد صاحب کی طلبی ہوتی، فتوح الشام یا صحابہ کرام کے حالات کی کوئی کتاب پڑھنے کا حکم ہوتا آزاد صاحب کسی ضرورت سے اٹھتے تو دوبارہ ان کی طلبی اور تلاش ہوتی خاموش ہوتے تو فرمایا جاتا کہ کیوں خاموش ہوئے؟ کھانا آنے تک (جو ہمیشہ ½ ۹ بجے آجاتا) یہ سلسلہ جاری رہتا اس میں انقطاع یا توقف یا ناغہ آپ کو گوارا نہ تھا، ان کتابوں کے ذوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ راقم سطور نے اکتوبر ۱۹۶۰ء میں اپنے وطن رائے بریلی سے اطلاع دی کہ "تاریخ دعوت وعزیمت" کے تیسرے حصہ کے سلسلہ میں حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ مرتب ہو گیا ہے، اس خط کے کچھ عرصہ بعد رائے پور حاضری ہوئی مصافحہ کے ساتھ ہی کتاب کا مسودہ طلب فرمایا اور اسی وقت پڑھنے کا حکم ہوا، ظہر کے بعد سے عصر تک اور عصر کے بعد مغرب تک

برابر یہ سلسلہ جاری رہتا، کبھی کبھی کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے لالٹین جلاکر کتاب پڑھی جاتی، جبتک کتاب ختم نہیں ہوگئی کوئی دوسرا کام ان وقتوں میں نہیں ہوا،

ڈاک اخیر زمانۂ حیات میں ظہر کے بعد (جب تخلیہ کا معمول تھا تو تخلیہ کے بعد اور جب یہ معمول نہیں رہا تو ظہر کے بعد) ڈاک سنی جاتی، اخیر زمانہ میں اسی وقت اخبارات کے سننے کا بھی معمول ہوگیا تھا۔

بیعت کا سلسلہ آرام وطعام اور نماز وغیرہ کے علاوہ بیعت کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا، بالعموم جانے والے فجر کی نماز یا ظہر کی نماز کے بعد بیعت ہوجاتے، اسی وقت مسافر رخصت ہوتے، مغرب کے بعد بالعموم بیعت کا سلسلہ شروع ہوجاتا، اکثر بیعت کرنے والوں کی کثرت سے کسی چادر یا دستار کو تھام کر بیعت ہونے کی نوبت آتی اخیر دنوں میں تو یہ سلسلہ بہت وسیع اور طویل ہوگیا تھا اور ایک ایک وقت سیکڑوں آدمی بیعت ہوتے اور کئی کئی آدمی بیچ بیچ میں کھڑے ہو کر مکبرین کی طرح توبہ کے الفاظ دہراتے اور بیعت کرنے والے ان کو ادا کرتے۔(۱)

ختم خواجگان حضرتؒ کی زندگی کے آخری ۵، ۶ سال ختم خواجگان کی بڑی پابندی رہی۔ رائے پور قیام ہو یا پاکستان یا کہیں اور، بالعموم فجر یا ظہر کی نماز کے بعد آزاد صاحب کے اہتمام میں ختم خواجگان ہوتا۔(۲)

---

(۱) پاکستان کے آخری سفر کے موقع پر اس میں بہت زیادہ وسعت اور بیعت کرنے والوں کا ہجوم ہوگیا تھا اسکی تفصیل (پاکستان کا آخری سفر) کے ذیل میں ملاحظہ ہو۔ (۲) یہ ختم حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری قدس سرہٗ کے زمانہ سے معمول ہے، ترکیب یہ ہے کہ پہلے تمام شرکا ختم دس دس مرتبہ درود شریف پڑھیں، اس کے بعد مجموعی طور پر تین سو ساٹھ بار لاملجأ ولا منجا من اللّٰہ الا الیہ پھر ۳۶۰ بار سورۂ الم نشرح مع بسم اللّٰہ پھر لاملجأ ولا منجا من اللّٰہ الا الیہ ۳۶۰ مرتبہ، پھر تمام شرکا دس دس بار درود شریف پڑھ کر دعا کریں۔

ختم کے آخر میں آزاد صاحب طویل دعا کرتے جس میں تعلق والے مرحومین کیلئے دعائے مغفرت اور جن لوگوں نے فرمائش کی ہوتی ان کی کاربرآری اور مقاصد کے لئے اجتماعی دعا ہوتی۔

رائے پور کی فضا رائے پور میں ہر وارد و صادر کو سب سے پہلے جو چیز متوجہ کرتی تھی وہ ذکر کی کثرت ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پتہ پتہ سے اللہ کے نام کی آواز اور ذکر کی صدا آرہی ہے، دن اور رات کے کم اوقات ذکر کی آواز سے خالی نظر آتے، رائپور کی فضا اور حضرت کے دامنِ عاطفت میں کم استعداد آدمی کو بھی یہ بات محسوس ہوتی تھی کہ سکون و اطمینان کی ایک چادر پوری فضا اور ماحول پر تنی ہوئی ہے، وہاں پہونچ کر ہر غم غلط اور ہر تردد اور فکر فراموش ہو جاتی تھی، اہل نظر و اصحابِ بصیرت کو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرات نقشبندیہ کی نسبت سکینت ہے جو پورے ماحول پر محیط اور غالب ہے، اس میں حضرت سے جتنا قرب ہوتا اتنا ہی اس کیفیت و احساس میں قوت پیدا ہوتی، گویا مرکز "سکینت" وہ ذات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نفس مطمئنۃ اور یقین و رضا کی دولت سے نوازا ہے۔

رائے پور کے پورے ماحول اور گردوپیش پر ضبط و تحمل و وقار و سکینت اور خاموشی کی فضا طاری رہتی، اور یہ آپ کے ضبط و تحمل، عالی ظرفی اور نسبت کا رنگ تھا لیکن کبھی کبھی وجد و شوق اور سرور و سرمستی کی وہ کیفیت جس کو ضبط و تحمل اور تمکین نے مغلوب کر رکھا تھا اپنے وجود کا احساس دلادیتی اور پروقار اور عالی ظرف دریا کی کوئی کوئی موج ساحل سے آکر ٹکراجاتی اور نسبت چشتیہ اپنا رنگ دکھاتی کبھی کبھی آپ خود مولوی عبد المنان دہلوی کو (جن کو اللہ نے درد و سوز و خوش الحانی بھی عطا فرمائی ہے اور ان کو عربی، فارسی اردو

کے بکثرت شعر یاد ہیں) یا آزاد صاحب کو جو سخن شناس بھی ہیں اور سخن سنج بھی اور ان کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی ہے طلب فرماتے اور خواجہ حافظ، امیر خسرو، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی کوئی عاشقانہ یا عارفانہ غزل پڑھوا کر سنتے اور عجب کیف و سرور پیدا ہو جاتا، مولوی عبدالمنان صاحب سے اکثر حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے ؎

بے کارم و باکارم چوں مد بحساب اندر گویانم و خاموشم چوں خط بکتاب اندر

اور قصیدہ بانت سعاد وغیرہ عربی، فارسی اردو کے اشعار سنتے، نیز خواجہ حافظؒ اور امیر خسروؒ کی متعدد غزلیں پڑھی گئیں،

کبھی کبھی طلوع صبح سے پہلے کسی ذکر کرنے والے نے ذوق و شوق میں آکر خواجہ حافظؒ کی یہ غزل پڑھنی شروع کردی تو مناسب حال ہونے کی وجہ سے اس میں خاص معنویت اور تازگی پیدا ہو گئی۔

من کہ باشم کہ دراں خاطر عاطر گزرم لطفہا می کنی اے خاک درت تاج سرم
اے نسیم سحری بندگی ما برساں کہ فراموش مکن وقت دعائے سحرم
ہمتم بدرقہ راہ کن اے طائر قدس کہ دراز است رہ مقصد ومن نوسفرم

لیکن بہت جلد پھر محفل او ماحول پر ضبط و تحمل اور سکینت کی فضا طاری ہو جاتی اور سب اپنے اپنے کام میں لگ جاتے اور معلوم ہوتا کہ جام شریعت کے ساتھ سندان عشق کی عارضی کارفرمائی تھی پھر دور جام چلنے لگا۔

درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

ایک حاضر خانقاہ اپنا ایک واقعہ سناتے ہیں:۔

"ایک دفعہ خیال آیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ بزرگوں کی مجلس میں حال ہوجاتا ہے مگر میں نے تو کچھ نہیں دیکھا یہ (میرے قیام کا) اخیر دن تھا، دوسرے روز واپسی تھی، مغرب کے بعد جب ذکر میں بیٹھا تو بیٹھتے ہی عجب حالت شروع ہوگئی گریہ اور محویت اور توجہ الی اللہ ایسی کہ اللہ تعالٰی سامنے ہے اور حضرت میرے جانب ہیں اور تسلی فرما رہے ہیں، تمام ذاکرین پر عجب حالت طاری تھی، اس حالت میں میں نے ذکر بڑی دقت سے پورا کیا اور آخر مجبوراً چھوڑ کر حاضر خدمت ہوا۔"

راؤ عطاء الرحمٰن خاں نے عرض کیا کہ حضرت آج تو عجب حالت تھی، آزاد صاحب نے تو قوالی ہی شروع کر رکھی تھی[1]۔ آپ نے فرمایا او ہو لاحول ولاقوۃ الا باللہ بس تمام حالت دگرگوں ہوگئی[2]۔

آزاد صاحب سے اکثر ان کے والد کی نظم فرمائش کر کے سنتے اور جب آزاد صاحب اپنے مخصوص انداز میں پڑھتے تو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا اور سناٹا سا چھا جاتا، نظم کا مطلع یہ ہے۔

یہ سرائے دہر مسافرو! بخدا کسی کا مکاں نہیں
جو مقیم اس میں تھے کل یہاں کہیں آج انکا نشاں نہیں

رائے پور کا رمضان

رمضان مبارک میں خاص بہار ہوتی، لوگ بہت پہلے سے اسکے منتظر ہوتے اور تیاریاں کرتے، ملازمین چھٹیاں لے کر

(۱) یعنی ذکر کے ساتھ شوق انگیز اشعار پڑھ رہے تھے (۲) تحریر صوفی غلام فرید صاحب ساکن بھادریاں

آتے: مدارس دینیہ کے اساتذہ اس موقع کو غنیمت جان کر اہتمام سے آتے علماء و حفاظ کی خاصی تعداد جمع ہو جاتی، تقسیم سے پہلے مشرقی پنجاب کے اہل تعلق و خدام اور وہاں کے مدارس کے علماء کی تعداد غالب ہوتی، اہل رائے پور اور اطراف کے اہل تعلق اولوالعزمی اور عالی ہمتی سے مہمانوں اور مقیمین خانقاہ کے افطار، طعام و سحر کا انتظام کرتے، رمضان مبارک میں اپنے شیخ کی اتباع میں مجلسیں سب ختم ہو جاتیں، باتوں کے لئے کوئی خاص وقت نہ تھا، ڈاک بھی بند رہتی، تخلیہ نماز کے وقت کے علاوہ تقریباً ۲۴ گھنٹے کسی ایسے شخص کے آنے سے گرانی ہوتی جس کے لئے وقت صرف کرنا پڑتا، افطار علالت سے پیشتر مجمع کے ساتھ ہوتا، جس میں کھجور اور زمزم کا خاص اہتمام ہوتا، مغرب کے متصل کھانا، علالت سے پہلے مجمع کے ساتھ، اس کے بعد چائے عشاء کی اذان تک یہی وقت ۲۴ گھنٹے میں مجلس کا تھا، اذان کے بعد نماز کی تیاری، اس درمیان میں حضرات علماء جن کا مجمع اگلی صف میں رہتا، بعض اہم اہم سوالات کرتے اور حضرت ان کا جواب دیتے، عشاء کے بعد تقریباً آدھ گھنٹہ کبھی نشست، اور کبھی لیٹ جاتے، خدام بدن دبانا شروع کرتے، مسجد و خانقاہ میں تراویح ہوتی، مسجد میں بھی قرآن مجید ہوتا اور خانقاہ میں بھی۔

یوں تو حفاظ کی کثرت ہوتی مگر حضرت اچھے پڑھنے والے بہتر حافظ کو پسند کرتے۔

حضرت نے ایک سال ۱۹۵۳ء میں منصوری پر رمضان مبارک کیا، ۵۰، ۶۰ خدام ساتھ تھے، مولوی عبدالمنان صاحب نے قرآن مجید سنایا، تراویح کے بعد حضرت کے تشریف رکھنے اور مجلس کا معمول تھا، طبیعت میں بڑی شگفتگی اور انبساط تھا، متعدد حضرات رات بھر بیدار اور مشغول رہتے، غرض دن اور رات ایک کیف محسوس ہوتا تھا، ضعفاء و

کم ہمت بھی سمجھتے تھے کہ:-

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

ایک حاضر خدمت خادم نے جس کو آخری عشرہ گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور جو اپنی صحت کی کمزوری اور ہمت کی پستی کی وجہ سے مجاہدہ سے قاصر رہا اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا تھا۔

دکانِ مے فروش پہ سالک پڑا رہا
اچھا گزر گیا رمضان بادہ خوار کا

ساتواں باب (۷)

سفر اور اصلاحی و تبلیغی دورے

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

مشرقی پنجاب کے دورے رجوع و استفادہ

مشرقی پنجاب کے ساتھ تعلق اور آمد و رفت کے آغاز کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری[1] تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت مرحوم پنجاب علاقہ جالندھر میں طالب علمی کے وقت سے رائپور گوجران مولانا فضل احمد صاحب کے بڑے بھائی مولوی مولا بخش صاحب کے تعلق کی وجہ سے آیا کرتے تھے۔ حضرت عالی رائے پوری کے وصال کے بعد زیادہ تر آمد و رفت ہوئی۔ حضرت منشی رحمت علی صاحبؒ اکثر حضرت کو لوگوں کے تقاضے سے باہر دوسرے گاؤں لے جاتے مگر حضرت کسی کو بیعت

---

(۱) آپ حضرت حافظ محمد صالح صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے (جو حضرت گنگوہیؒ کے مجازین میں سے تھے) صاحبزادہ اور حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کے مجازین و خلفاء میں سے ہیں پہلے رائپور گوجران کے مدرسہ کے مہتمم و روح رواں تھے اب چک ۵۱ چھپو وطنی ضلع منٹگمری میں مقیم ہیں، بہت سے علماء و مدرسین کے استاد اور مرجع طالبین ہیں،
(سبا پور اللہ)

نہ کرتے، جو شخص آتا اس کو حضرت منشی صاحب ؒ کی طرف متوجہ کر دیتے، جو بالکل ہی پیچھے پڑا اور سفارش حضرت منشی صاحب نے کی اس کو بیعت کر لیتے، حضرت کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی تعداد اس وقت بہت کم تھی، میرے والد (حضرت حافظ محمد صالح صاحب) کے مرض الموت میں حضرت خود بخود تشریف لے آئے، جنازہ بھی پڑھایا، پھر حضرت منشی صاحب کے مرض الموت میں تشریف لائے اور علاج کے واسطے شہر جالندھر ان کو لے گئے، وہیں ان کا انتقال ہوا، وہیں دفن ہوئے، جنازہ حضرت کے حکم سے مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی نے پڑھایا حضرت منشی صاحب کے انتقال کے بعد عام مخلوق کا دھیان حضرت کی طرف ہوا ہے، ان دنوں حضرت منشی صاحب کے ساتھ مختلف دیہات میں حضرت کا دورہ ہوتا تھا، بندہ کو ساتھ جانے کی فرصت نہ تھی، بجز رخصت کے روز حاضری ہوتی،

حضرت منشی صاحب کی وفات کے بعد حضرت کا ایک سفر رائے پور گوجران سے شروع ہوا، بندہ اس سفر میں ساتھ تھا، حضرت رائے پور گوجران سے سلیم پور (ماسٹر منظور محمد صاحب کا گاؤں ملیان. لودی وال تہاڑہ، کشن پور، کوٹ محمد خاں، بڈووال، دھرم کوٹ، جلال آباد، موگا سے گزرتے ہوئے جگراؤں تشریف لائے، ان سب مقامات پر بہت لوگ حضرت سے بیعت ہوئے چنانچہ اسی سفر میں ماسٹر منظور صاحب کو تہاڑہ اور لودی وال کے درمیان ایک جگہ بیٹھ کر بیعت فرمایا۔"[1]

اس کے بعد تو مشرقی پنجاب کے دورے بکثرت اور تقریباً سالانہ ہونے لگے

---

(۱) مکتوب مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری۔

یہ دورہ بعض اوقات سات آٹھ مہینے تک کھنچ جاتا تھا، اس سفر کی پہلی منزل انبالہ ہوتی تھی جو متصل ضلع ہے۔ قیام عموماً حافظ صدیق صاحب کے پاس ہوتا تھا، لدھیانہ میں بن والی مسجد میں اسی طرح جالندھر میں اہل تعلق کے اصرار سے مضافات اور ان مرکزی قصبات میں بھی تشریف لے جاتے تھے جہاں مخلصین کا مجمع ہوتا، حضرت کے مزاج میں احباب و خدام کی دلداری، ناز برداری کی حد تک تھی، خلوص و محبت کے ساتھ کوئی اپنے گاؤں یا قصبہ لے جانے کے لئے اصرار کرتا، یا دینی نفع متصور ہوتا تو تکلیف اٹھا کر بھی تشریف لے جاتے اور سفر میں سفر نکلتے رہتے، جہاں دینی مدارس یا ذکر شغل کرنے والوں کا اجتماع ہوتا، وہاں اور شوق و رغبت سے تشریف لے جاتے اور آپ کا سفر اصلاحی و تبلیغی دورہ بن جاتا جس میں صدہا اشخاص بیعت و توبہ سے مشرف اور ذکر کی لذت سے آشنا ہوتے، چونکہ یہ سفر بڑے طویل اور بار بار ہوتے تھے اسلئے قدرے تفصیل سے ان کی روداد پیش کی جاتی ہے تاکہ کسی قدر ان کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہو سکے۔

حضرت کے ایک خاص خادم مولانا عبد اللہ صاحب[1] مرحوم کوئی ایک قدیم سفر کی روداد اپنے حافظہ کی مدد سے اس طرح لکھتے ہیں، اس سے حضرت کے اصلاحی ذوق احباب و خدام کی دل جوئی اور ان دینی مقاصد کے لئے جفاکشی کے تحمل کا بھی کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

"بندہ تقریباً ۱۹۳۰ء میں حضرت الاستاد مولانا محمد ابراہیم صاحب سلیم پوری کے

---

(۱) افسوس ہے کہ ۶ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ مطابق ۲۲ جنوری ۱۹۶۴ء بروز بدھ آپ کا لاہور میں انتقال ہوگیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

مدرسہ میں جگراؤں بسلسلۂ تدریس مقرر ہوا، کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ حضرت اقدس تشریف لا رہے ہیں، اس دفعہ حضرت بھاول نگری ؒ سے ملاقات کر کے فیروز پور موگا اور جلال آباد شرقی ہوتے ہوئے بندہ کے سکونتی قصبہ دھرم کوٹ پہنچے اور وہاں سے حضرت الاستاذ مولانا قمر الدین صاحب جو کہ حضرت گنگوہی ؒ سے بیعت اور حضرت شیخ الہند کے شاگردوں میں سے تھے اور اس وقت حضرت رائپوری کی طرف رجوع فرمایا تھا، ان کے گاؤں بھنڈر کلاں تشریف لیگئے اور یہ سارا سفر بھاول نگر سے چل کر فیروز پور اور موگا ہوتے ہوئے جلال آباد عصر دھرم کوٹ، مغرب لوہ گڑھ اور نماز عشاء اور کھانا بھنڈر کلاں میں ہوا، اور رات حضرت مولانا کے ہاں ٹھہر کر صبح سویرے وہاں سے چلے، کوکری ہوتے ہوئے، چائے جتوال میں میاں غلام رسول کے ہاں نوش فرمائی، تقریباً دس بجے جگراؤں پہونچے اور معاً ہی فرمایا کہ صرف ایک گھنٹہ ہی ٹھہرنا ہے، پھر گیارہ بجے کی گاڑی سے لدھیانہ چلے جانا ہے طالب علموں نے بندہ کے اس حجرہ میں جو بظاہر قبر کا نمونہ تھا، نہایت نیچی چھت، ایک چارپائی سے زیادہ کی گنجائش نہیں اور چھت بھی کالی سیاہ، حضرت کے لئے چارپائی بچھا کر عرض کیا کہ حضرت تھوڑی دیر لیٹ جائیں تو ہم ہاتھ پاؤں ہی دبا دیں، بندہ نے بھی عرض کیا کہ اگر قیام ایک ہی گھنٹہ رہنا ہے تو بہتر ہے کہ حضرت آرام فرمالیں اور طالب علموں کو بھی خدمت کی کچھ سعادت نصیب ہو جائیگی، چلے تو بہر حال جانا ہی ہے، اور ویسے بھی کل سے مسلسل سفر ہو رہا ہے، حضرت نے منظور فرمالیا اور چارپائی پر کھڑے ہو کر جب چادر اتارنے کا ارادہ فرمایا تو حجرہ کی تنگی کی وجہ سے دونوں ہاتھ ہر دو

طرف کی دیوار سے لگ گئے، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی جن کو
احباب اس وقت صاحبزادہ صاحب کہا کرتے تھے، حضرت نے ان کو آواز دی
اور فرمایا کہ عبداللہ کا یہ حجرہ ہمیں پسند آگیا ہے اس لئے خیال ہے کہ رات یہیں
قیام کرلیں، حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی نے میری دلداری یا
اپنی طبعی ذرہ نوازی کے پیش نظر نہایت ہی خوشی سے آمادگی کا اظہار فرمایا۔
میں نے عرض کیا کہ پھر اجازت ہو تو میں رائے پور گوجران کے حضرات کو بھی
اس کی اطلاع کردوں تاکہ وہ بھی زیارت سے مشرف ہوجائیں، فرمایا کہ
ہاں یہ تیری ہمت ہے۔ لبعد از منظوری بندہ نے اپنے ایک طالب علم حافظ
محمد دین سے کہا کہ یہ میری سائیکل لے لو اور جلد از جلد رائے پور گوجران پہونچو۔
جگراؤں سے تقریباً اٹھارہ میل کا سفر اور درمیان میں ستلج کا پاٹ بھی تھا
حضرت شام کے کھانے پر قبل از مغرب بیٹھے ہی تھے کہ حضرت مولانا عبدالعزیز
صاحب، مولانا قمرالدین صاحب، مولانا فضل احمد صاحب اور دیگر حضرات
تشریف لے آئے، رات جگراؤں میں قیام فرمایا۔ صبح تقریباً آٹھ بجے
لدھیانہ کا قصد تھا چائے وغیرہ سے فارغ ہو اسٹیشن پر تشریف لائے تو
حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری نے بندہ سے فرمایا اگر تو
حضرت سے اجازت لے لے تو یہاں تو کچھ وقت ملا نہیں ہم سب خدام لدھیانہ
چلے چلیں وہاں حضرت کا دو تین دن قیام ہے کچھ استفادہ کر سکیں گے
میری عرض پر حضرت نے فرمایا کہ ساتھ چلنے میں تو کچھ حرج نہیں مگر ایک
شرط ہے کہ اپنے قیام و طعام کا انتظام خود کرنا ہوگا، یہ نہیں کہ جس غریب

کے ہاں میں ٹھہروں وہاں بن بلائی ایک بارات کی بارات اس کے سر پڑ جائے چنانچہ ہمارے ان شرائط کو قبول کر لینے پر حضرت نے اجازت فرما دی، بندہ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب، پیر جی عبداللطیف صاحب گڑ منڈی میں مدرسہ بستان الاسلام والے قاری احمد حسن صاحب کے ہاں ٹھہرے اور انھیں کے ہاں کھانا کھاتے رہے، حضرت مولانا فضل احمد صاحب منشی محمد شفیع صاحب کے ہاں ٹھہرے، مولانا قمرالدین صاحب اپنی برادری گوجروں میں جاکر ٹھہرے، میاں صدرالدین صاحب برادر اخیافی حضرت پیر جی عبداللطیف صاحب نے کہا کہ میں تو حضرت کے ساتھ ہی ٹھہروں گا اور ساتھ ہی کھانا کھاؤں گا، کیونکہ حضرت کا سامان بستر وغیرہ بھی سنبھالوں گا، تو حضرت نے فرمایا کہ ہاں آپ کو ساتھ ہی رکھیں گے، اس سفر میں حضرت کا قیام ملّا عبدالرحمٰن سبزی والوں کی بیٹھک (جو کہ ہمارے حجرہ قبریہ سے کچھ زیادہ وسیع نہ تھی) میں رہا، جاتے ہی لدھیانہ والے دوستوں سے فرمایا کہ دیکھو ہم دعوت تو کسی کی کھائیں گے نہیں مگر جو دوست ملنے والے ہیں وہ اپنا کھانا لاکر میرے ساتھ کھائیں اور ایک ایک چپاتی میرے حصہ کی بھی لیتے آویں سب کی طرف سے دعوت بھی ہو جائے گی اور خصوصی دعوت کا بار بھی کسی ایک پر نہیں پڑے گا، چنانچہ تین چار روز کے قیام میں یہی سلسلہ رہا کہ خصوصی دعوت کسی کی قبول نہیں فرمائی اور بعد میں بھی مدتوں تک لدھیانہ میں یہی معمول رہا کہ حاجی علی محمد صاحب اپنے گھر سے، حاجی ولی محمد اپنے ہاں سے، حاجی ابراہیم اپنے ہاں سے اور حاجی قادر بخش اپنے ہاں سے پانچ پانچ سات سات، دس دس

آدمیوں کا کھانا پکوا کر لے آتے اور حضرت کے ساتھیوں کو کھلاتے، بعد میں جو کچھ بچا کھچا ہوتا وہیں بیٹھ کر کھا لیتے اور کسی پر خاص بار بھی نہ ہوتا، چارپائیاں بستر اور دوسرا ضروری سامان اکثر حافظ احمد حسن صاحب ام المدارس والوں کے ہاں سے آجاتا۔ حافظ صاحب کے صاحبزادگان قاری عبدالرشید اور مولوی عبدالحمید صاحب یہ خدمت نہایت بشاشت سے انجام دیتے۔

ایک دوسرے سفر میں بندہ نے لدھیانہ سے اپنے گاؤں دھرم کوٹ تشریف لیجانے کیلئے عرض کیا بعد از منظوری رات کو عرض کیا گیا کہ حضرت اجازت فرمادیں تو مولوی عبدالرحیم صاحب کو رات کی گاڑی پر بھیج دیا جائے تاکہ حضرت کے کھانے کا صبح کو بسہولت انتظام ہو سکے، کھانے میں کوئی تکلف تو ہوتا نہیں تھا مگر ان دنوں بالخصوص تھوے کا ساگ دسترخوان کا خصوصی جزرہا جو کہ تبرک خوروں کے لئے بڑا ابتلا ہو جاتا تھا، رات کو تو حضرت نے اجازت نہ دی صبح چار بجے تقریباً جب حضرت وضو کے لئے اٹھے تو میں نے دوبارہ عرض کیا تب مولوی عبدالرحیم کو اس گاڑی پر بھیجنے کی اجازت فرمادی مگر اپنا سفر پہلی گاڑی پر ملتوی فرمادیا، وضو سے فارغ ہو کر جب حضرت اندر حجرہ میں تشریف لے گئے تو بندہ کو آواز دی گئی، حاضری پر فرمایا کہ آج ہم نے ارادہ یہ کیا ہے کہ جو کچھ آئے گا وہ اس سفر کے کرایہ کی مدمیں تیرے حوالہ کیا جائے گا اور یہ لے لو اب سوائے قبول کرنے کے چارہ نہ تھا مگر اسی طرح دوبارہ سہ بارہ آواز پڑتی رہی حتی کہ میری ساری جیبیں پر ہو گئیں، گیارہ بجے والی گاڑی پر تشریف لیجانا طے ہوا تھا، چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی اسٹیشن

پر تشریف لے آئے اور حضرت مع پچیس تیس خدام کے گیارہ والی گاڑی پر سوار ہو کر تقریباً ایک بجے موگا اسٹیشن پہنچے، اسٹیشن سے لاری پر دھرم کوٹ مدرسہ کی مسجد میں نماز پڑھی، حاجی علی محمد صاحب، بھائی الطاف صاحب غالباً مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رائے پوری ساتھ تھے، رات کو قیام ہوا صبح چائے کے بعد وہاں سے چل کر جلال آباد تشریف لانا ہوا، جہاں پر بہت سے مرد اور کثیر تعداد میں عورتیں بیعت بھی ہوئیں اور جو پہلے سے بیعت تھیں اپنے اپنے حالات عرض کر کے ذکر وغیرہ کے سلسلہ میں حضرت سے ہدایات حاصل کیں، چونکہ جلال آباد حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری کے ننھیال کا گاؤں تھا، اس لئے اکثر عورتیں اور مرد حضرت سے بیعت اور ہدایت یافتہ تھے اور تقریباً سارا گاؤں راجپوتوں کا تھا، اور ہر سال حضرت کا دورہ بھی ہوتا تھا، حضرت کے توسل کی وجہ سے وہاں طبقہ مستورات میں خاص طور پر ذکر و شغل اور دینداری کا شوق تھا،

ایک دفعہ لدھیانہ حاضر ہو کر بندہ نے جگراؤں تشریف لانے کے لئے عرض کیا، منظوری ہو جانے کے بعد حضرت مولانا محمد صاحب پہنچ گئے، اور انھوں نے پہلے رائے کوٹ تشریف لانے کی منظوری حاصل کر لی، بندہ دوبارہ حاضر ہوا، چونکہ دوستوں کو کھٹکا تھا، خاص کر عبدالرحمٰن صاحب لودھی والے اور سلیم پور تہاڑہ والے احباب کو کہ اس طرح کہیں ہمارا نمبر حذف نہ ہو جائے کیونکہ ان کا خیال جگراؤں کے بعد سلیم پور لودھی وال کا تھا حضرت لیٹ چکے تھے، میں نے عرض کیا کہ حضرت اس طرح جگراؤں رہ نہ جائے، تو حضرت لیٹے ہوئے خوب

ہنسے اور نہایت شفقت کے لہجہ میں فرمایا کہ نہیں نہیں جگراؤں رہے گا نہیں چنانچہ رائے کوٹ کے دوروزہ قیام کے بعد جگراؤں تشریف لائے اور وہاں سے سلیم پور لودیوال تہاڑہ، دانووال ایک ایک دن قیام کرتے ہوئے جب لودیوال سے روانہ ہوئے تو ماسٹر منظور صاحب نے بیعت کے لئے بندہ سے فرمائش کی میرے گزارش کرنے پر ایک کھیت ہی میں بیٹھ کر جہاں بندہ نے اپنی چادر بچھادی تھی اور ماسٹر صاحب کو دیکھ کر کچھ ساتھی اور بھی آگئے تھے منظور صاحب کو مع ساتھیوں کے منظور فرمالیا، ماسٹر منظور صاحب اور ان کے ساتھیوں کو توبہ کرانے کے بعد کہ بیل گاڑیاں راستہ پر آچکی تھیں، اس لئے آگے روانگی ہوئی، غالباً دانووال ہوتے ہوئے بڑے کشن پور میں کچھ دیر قیام فرمایا، جہاں حضرت نے مع اپنے ساتھیوں کے کھانا تناول فرمایا، منشی ابراہیم اور ان کی اہلیہ محترمہ جو وہاں زنانہ اسکول میں ملازم تھیں، کے اصرار کی وجہ سے وہاں قیام ہوا مگر دوپہر ہی وہاں سے روانگی ہوئی، مولانا عبدالعزیز صاحب ملیانی اور حضرت مولانا غلام رسول صاحب جالندھری حضرت کے ساتھ گاڑی پر بیٹھے ہوئے تھے، بندہ بھی اسی گاڑی پر تھا، مولانا غلام رسول صاحب کچھ پنجابی اشعار حضرت کو سناتے رہے، کبھی کبھی حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب کی بھی باری آجاتی تھی، گرمی خوب تھی، کوٹ محمد خاں پہنچکر، چونکہ ان لوگوں نے پہلے ہی سے لسی وغیرہ کا انتظام کر رکھا تھا، اور تکیہ میں چارپائی بھی بچھوا رکھی تھی، اس لئے حضرت نے تھوڑی دیر وہاں برگد کی چھاؤں میں آرام کیا اور حضرت کے ساتھیوں نے لسی پانی نوش کیا، ہمارے دھرم کوٹ

کے بعض قدیم طالب علم سید احمد علی اور سید ہدایت اللہ اور خوش محمد گاڑی کے ساتھ چل رہے تھے اور رخصتی مصافحہ کے وقت دعا کے لئے عرض گزار ہوئے، چونکہ وہ میرے بچپن کے ساتھی تھے، اس لئے میں نے خصوصی طور پر ان کی طرف متوجہ کرنے کے لئے چند ایک تعارفی کلمات کہہ دیئے حضرت نے فرمایا کہ بھئی میرے پاس کوئی پمپ تو ہے نہیں کہ چلتے چلاتے بھردوں یہ کام تو محنت کا ہے، بہر حال بڈووال جو ایک سکھوں کا گاؤں تھا، اور اپنے عزیز و اقارب بھی وہاں کافی رہتے تھے، وہ سب چشم براہ اور استقبال کے لئے باہر نکلے کھڑے تھے اس لئے وہاں حضرت مسجد میں تشریف لے گئے ویسے تو ہر جگہ ہی بیعت ہونے والوں کا تانتا یدخلون فی دین اللہ افواجا کا منظر پیش کیا کرتا تھا مگر یہاں بالکل سکھوں کی آبادی میں رہنے والی لڑکیوں کی فرمائش پر حضرت ان کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں جاکر انکو بیعت فرمایا۔

نماز ظہر مسجد میں با جماعت ادا کرنے کے بعد پھر دھرم کوٹ کی طرف روانگی ہوئی، سلیم پور سے دھرم کوٹ بارہ کوس کے فاصلہ پر ہے، بڈووال سے نکلنے کے بعد غالباً حضرت چھکڑے پر سوار نہیں ہوئے، پیدل ہی چلتے رہے اور دھرم کوٹ مدرسہ کی مسجد میں رونق افروز ہوئے، عصر کی نماز سے پہلے شہر کے اکثر لوگ زمیندار اور رئیس قسم کے زیارت کے لئے حاضر ہوئے پہلے نماز عصر کھڑی ہونے سے پہلے بندہ کو فرمایا کہ آج تو نے سارا دن دھوپ اور گرمی میں رکھا، لیکن اب تک نہ کچھ کھلایا نہ پلایا، جیسے اپنے ادنیٰ ترین خدام

پر محض شفقت ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ نماز سے فارغ ہو کر گھر چلیں گے اور جو کچھ غریبانہ ماحضر چائے وغیرہ ہو گا پیش کر دیا جائے گا، رات جلال آباد ٹھہرنا تھا اور جلال آباد سے مولوی حبیب اللہ اور دوسرے خاں صاحبان حضرت کو لینے کے لئے آئے ہوئے تھے، گھر کی طرف جانا ان کے لئے بہت ناگوار تھا مگر حضرت اقدس بے تکلف تشریف لے گئے اور چائے مٹھائی، بادام، کشمش وغیرہ پیش کی گئی تھیں تناول فرمائیں اور باداموں کے متعلق فرمایا کہ بھئی یہ چیز تو توڑ کر ہی کھائی جا سکتی ہے، اس لئے بچوں نے توڑ کر خود پیش کر دیئے، بچوں کے سلام کرنے کے وقت چونکہ محلوں کے بچے بھی ساتھ شامل ہو گئے تھے، اس لئے مزاحاً فرمایا کہ سب تیرے ہی بچے ہیں، احباب حضرت کا جملہ سن کر بہت محظوظ ہوئے، اٹھتے وقت گھر کے اندر بھی تشریف لے گئے مولوی عبدالرحیم کی والدہ اور بڑی خالہ سے احوال دریافت کرتے رہے وہاں سے چل کر جلال آباد رات کو قیام ہوا اور غالباً اگلا دن بھی وہاں ٹھہرے چونکہ وہاں کی اکثر عورتیں اور لڑکیاں پہلے سے حضرت مولانا حافظ محمد صالح صاحب سے بیعت تھیں اور حضرت کو بھی بسا اوقات یاد کرتی تھیں، اسلئے حضرتؒ نے وہاں ان کی دلداری کے لئے زیادہ قیام فرمایا تھا، واپسی پر کچھ دیر جگراؤں ٹھہرے مگر شام کا کھانا کھانے کے بعد موٹر پر سوار ہو کر عشاء کی نماز لدھیانہ شاہی مسجد میں ادا فرمائی۔

اور ایک سفر حضرت نے اس طرح فرمایا تھا کہ دھرم کوٹ سے پنڈوری اور وہاں سے بڈووال اور وہاں سے جلال آباد، یہ سب گاؤں دو دو تین تین

میل کے فاصلہ پر تھے (۱)۔

مشرقی پنجاب کے ایک سفر کا حال بیان کرتے ہوئے مولانا محمد صاحب الوری فرماتے ہیں:۔

"ایک دفعہ لدھیانہ (مشرقی پنجاب) تشریف لائے، حافظ عبدالقدیر صاحب منصوری والے بھی ہمراہ تھے اور مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی بھی تھے، میں بھی رائے کوٹ سے حاضر ہوا تبلیغی جماعت کے مولوی نور محمد صاحب میواتی اور ان کے دو اور ساتھی تھے، اس وقت فقط حافظ مولوی عبدالمجید صاحب مدرسہ ام المدارس والے تبلیغ کا کام کرتے تھے حضرت کے اسفار جو مختلف سمتوں میں ہوتے تھے وہ تبلیغ کی غرض سے ہوتے تھے ان سے غرض علماء دین میں تبلیغی روح پیدا کرنا اور روحانی ترقی اور اخلاق فاضلہ سے خلق اللہ کو نمائش کرنا ہوتا تھا اور حکمت عملی سے دین کی باتیں ان کے اذہان میں بٹھانا کہ باتوں ہی باتوں میں ان میں سے اخلاق رذیلہ نکال دیے جائیں اور اخلاق فاضلہ بھر دیئے جائیں، اس پر مزید یہ کہ ذکر کی کثرت سے ان میں جلا آجائے تاآنکہ پختگی پیدا ہو جائے اس طرح کوفت بھی محسوس نہیں ہوتی اور کام بھی ہو جاتا ہے، مناظرانہ شکل کو حضرت اقدس پسند نہ فرماتے تھے، مولانا امین الدین صاحب کے صاحبزادے مولوی سعیدالدین صاحب مرحوم بھی اس سفر میں تھے ان سے حضرت فرماتے تھے کہ فجر کے بعد وعظ کہیں، وہ چالیس اسباق تبلیغی جو انھوں نے

(۱) مکتوب مولانا عبداللہ صاحب دھرم کوٹی۔

مرتب کئے تھے سناتے تھے مگر ایسے مؤثر پیرایہ میں کہ خود حضرت اقدس بھی سنتے تھے اور حاضرین بھی سنتے تھے، پھر لوگ نوافل میں لگ جاتے تھے، پھر کھانا آجاتا پھر آرام، پھر نماز ظہر اول وقت ہو جاتی تھی، پھر حضرت اقدسؒ تو پڑھنے بیٹھ جاتے اور ہم لوگ شہر میں گشت کے لئے جاتے، مولوی نور محمد صاحب میواتی، بھائی صمد خاں میواتی اور تبلیغی جماعت کے لوگ بھی ہمراہ جاتے اور شہر کا گشت کر کے آتے، احقر جب ساتھ ہوتا تو مختلف محلوں میں بیان ہوتا، مولوی نور محمد صاحب احقر سے بیان کراتے، دین کی اہمیت کے متعلق بیان ہوتا مولوی نور محمد صاحب خوب محظوظ ہوتے اور واپس آکر حضرت سے بیان کرتے تو حضرت اقدس بہت خوش ہوتے، پھر حضرت رائے کوٹ تشریف لے گئے، مولوی نور محمد صاحب میواتی وہاں آکر بہت خوش ہوئے، گشت کے بعد آکر کہتے کہ یہاں تو مولانا کی برکت سے مسائل دین سے سب لوگ واقف ہیں، حضرت جتنے دن رہے نہایت خوش رہے، خوب ذکر ہوا اور لوگوں نے خوب بیعت کی اور پیدل حاضری دی، پھر چار کوس پر تلونڈی رائے سے راہ میں ایک گاؤں[1] پڑتا ہے، عرض کیا کہ یہ لوگ بیچارے غریب ہیں، لیکن یہ مخلصین کی جماعت ہے، یہ بھی چاہتے ہیں کہ حضرت ایک گھنٹہ ہمارے یہاں ٹھہر کر جائیں، میں ان سے وعدہ کر لوں؟ فرمایا ضرور ٹھہریں گے، نماز عصر ان کے ہاں پڑھیں گے اور چائے پئیں گے، وہ لوگ خوش و خرم اپنے گاؤں کو چلے گئے، گاؤں کے پاس آکر بیل گاڑی والے کو فرمایا کہ یہیں برج میں

---

(۱) اس کا نام برج گوجراں بتایا گیا ہے۔

لے چلو نماز عصر پڑھنا ہے ذرا ٹھہرنا بھی ہے ، مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب ساتھ تھے ، حضرت اقدس ؒ والے چھکڑا بس میں بھی بیٹھا تھا ، حضرت ہشاش بشاش تشریف لے گئے ، نماز کے بعد چائے لائی گئی ، پی کر تلونڈی (۱) رائے پہنچے برج والے چودھری مولیٰ بخش کہنے لگے کہ ہمارے ساتھ ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالےٰ عنہ والا معاملہ ہوا کہ خود ہی نظر فرمائی ورنہ ہم غریب کہاں اور حضرت کا مجمع کہاں ؟!

رات تلونڈی رائے رہ کر دوسرے دن پھر برج میں سے ہوتے ہوئے رائے کوٹ تشریف لائے ، بہت سے حضرات بیعت ہوئے ، فرمایا کہ اب بس پر چلیں گے ، میں نے عرض کیا کہ بس یہیں آجائے گی تو بہت خوش ہوئے . شام کو لدھیانہ پہنچ کر حضرت اقدس ؒ نے میواتیوں کے سامنے پھر رائے کوٹ کے علاقہ کی دینداری کی کیفیت خود سنائی . الحمدللہ ثم الحمدللہ ؕ (۲)

مغربی پنجاب مشرقی پنجاب سے آگے بھی تشریف لے جانا ہوتا ، بھاول نگر (ریاست بھاول پور) میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا اللہ بخش صاحب تشریف رکھتے تھے ، وہیں ریاست میں مولانا سر رحیم بخش صدر کونسل ریاست بھاول پور اور ان کے بھائی چودھری عالم علیخاں صاحب جج بھاول پور (۳) کا بھی قیام تھا ، یہ سب حضرات حضرت

(۱) ضلع لدھیانہ میں مسلمان راجپوتوں کا ایک معروف گاؤں تھا ۔ (۲) تحریر مولانا محمد صاحب انوری ، (۳) چودھری عالم علی خاں صاحب ٹھسکہ میراں صاحب تحصیل تھانیسر ضلع کرنال کے ایک زمیندار اور راجپوت خاندان کے ایک فرد اور مولانا سر رحیم بخش صاحب مرحوم پریسیڈنٹ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۴۰ پر)

شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہ کے جاں نثار خادم اور عاشق صادق تھے حضرت
کو ان حضرات سے بڑا ربط اور موانست تھی، ان حضرات کے ہاں بھی طویل قیام رہتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹ کا) کونسل ریاست بہاول پور کے چچازاد بھائی تھے، مولانا ہی کی سرپرستی میں
تعلیم و تربیت پائی، ریاست بہاول پور میں ملازم ہوئے اور ڈسٹرکٹ جج تک ترقی کی، انگریزی تعلیم کا
پورا اثر تھا، صرف بھائی کی موجودگی میں انکی خوشنودی کیلئے نماز پڑھ لیا کرتے تھے اور صاف کہتے تھے کہ میں
تو اپنے بڑے بھائی کے ڈر سے نماز پڑھتا ہوں، مولوی صاحب کو ان کی اصلاح و دین داری کی بڑی
فکر رہتی تھی ۱۹۱۲ء میں ایک شادی کے موقع پر تمام اہل خاندان موضع میں موجود تھے، چودھری
صاحب نے بڑے بھائی سے اجازت لی کہ بقیہ رخصت وہ کشمیر گزاریں، مولوی صاحب کی بڑی خواہش
تھی کہ چودھری صاحب ایک مرتبہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی خدمت میں رائے پور حاضر
ہوں شاید اللہ تعالیٰ قلب ماہیت فرما دے، آپ نے اپنی برادری کے ایک صاحب ملاں اللہ داد
سے فرمایا کہ اگر تم میرے بھائی کو کشمیر کے بجائے رائے پور جانے پر راضی کر لو تو تمہارا مجھ پر بڑا
احسان ہوگا، ملاں صاحب نے ایک پرفضا جگہ کی لالچ میں رائے پور چلنے پر راضی کر لیا لیکن
انھوں نے کہا کہ میں چلتا تو ہوں لیکن آپ مجھے مولویوں وغیرہ کے پاس نہ لے جائیے گا۔
میں صرف سیر و تفریح کی غرض سے جا رہا ہوں، غرض چودھری صاحب رائے پور گئے
حضرت بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے اور بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، مجلس برخواست
ہونے کے بعد چودھری صاحب نے شکایتاً کہا کہ آخر تم نے مولویوں میں مجھے پھنسا دیا لیکن دوسرے
ہی دن بیعت کی درخواست کی، حضرت نے فرمایا کہ جلدی کیا ہے ابھی ٹھہرو، دوسرے روز
وہاں زیادہ تقاضا ہوا اور بیعت ہو گئے، اس کے بعد ہی طبیعت یک لخت پلٹی، اسی وقت سے
داڑھی رکھ لی اور نماز کی پابندی شروع کر دی، انگریزی لباس بالکل ترک کر دیا اور معمولی سیدھے سادے

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۴۱ پر)

ضلع سہارنپور کے دورے

پنجاب کے دوروں کے علاوہ ضلع سہارنپور کے بکثرت تبلیغی، تنظیمی اور اصلاحی دورے ہوتے رہتے تھے جن میں اکثر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور اہل تعلق اور خدام کی ایک بڑی جماعت ساتھ ہوتی، ایک دورہ کی مختصر یادداشت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے کاغذات میں اس طرح درج ہے:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۰ کا) کپڑے پہننے شروع کر دیے، جہاں تقرر تھا وہیں تھوڑی سی آراضی پڑی ہوئی تھی اسکی کاشت کا اہتمام شروع کر دیا، اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے، روئی گھر میں کاتی جاتی تھی اس کے کپڑے استعمال کرتے تھے، انگریزی تمدن اور معاشرت سے سخت نفرت ہو گئی، اکثر رخصت لے کر رائے پور حاضر ہوتے تھے، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کے خلیفہ حضرت بہاول نگری کی طرف رجوع ہوئے پنشن پانے کے بعد ضلع بہاول نگر میں ایک جگہ جو اب ٹبہ عالمگیر کے نام سے مشہور ہے قیام اختیار فرمایا اور ایسی سادہ جفاکش اور درویشانہ زندگی اختیار کی جس کی ہمت اچھے اچھے مرتاض اور جفاکش صوفیوں کو بھی مشکل ہے ۱۹۴۳ء میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے، حضرتؒ ان کے متعلق بڑے بلند کلمات فرماتے تھے اور ان اطراف کے اہل تعلق کو ان سے ملتے رہنے کی ہدایت فرماتے رہتے تھے، صوفی عبدالحمید صاحب جو وزیر زراعت پنجاب و صدر مسلم لیگ تھے ان کے فرزند ارجمند ہیں۔

چودھری صاحب کا خصوصی ذوق اور مشغلہ کلام پاک کی ترویج و اشاعت تھی اور یہ ذوق ان کو اپنے شیخ کی تقلید میں ملا تھا، ان اطراف میں ریاست کے علاقہ میں ان کے شوق و ہمت سے قرآن مجید کی تعلیم و تجوید کی بڑی اشاعت ہوئی اور بہت سے مدرسے قائم ہوئے،

"دورہ وتنظیم دیہات حضرت اقدس مع زکریا مولوی احمد الدین ومولانا اشفاق صاحب وغیرہ ۱۰ نفر ۲ صفر ۵۵ھ کو نودھی پور، ۳ صفر شنبہ کو ڈیکورہ، یکشنبہ ٹوڈرپور، دوشنبہ کو نھن پور، سہ شنبہ کو دودھ گڑھ، چہارشنبہ کو دبھیرہ) پنجشنبہ کو چلکانہ، واپسی سہارنپور شب جمعہ ۹ صفر"

اس طرح کے بکثرت دورے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے تھے جن میں صدہا اشخاص کو توبہ اور بیعت کا موقع ملتا، ہزاروں بندگان خدا علماء وصلحاء کی زیارت اور کسی نہ کسی حد تک ان کی صحبت سے مشرف ہوتے، نماز کی بڑی بڑی جماعتیں ہوتی تھیں، عوام اتباع سنت کا اہتمام دیکھتے، بیسیوں آدمیوں کو رات کو اٹھنے کی توفیق ملتی اور وہ دعا وعبادت کی لذت پاتے، فضا ذکر کی صداؤں سے گونجتی، دینی مکاتب اور مدارس کے قیام کا لوگوں کو خیال پیدا ہوتا، اس کا ذوق اور اس کی اہمیت آپ کو اپنے شیخ کی وراثت میں ملی تھی، خود اسکی بے حد تاکید فرماتے، ضلع سہارنپور میں بکثرت مکاتب و مدارس آپ کی ترغیب وتحریض سے قائم ہوئے، یہاں صرف ایک مدرسہ کے افتتاح کا منظر اور ان دوروں سے جو دینی فائدہ پہنچتا تھا اس کا ایک ہلکا سا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

چھٹمل پور ضلع سہارنپور کا مدرسہ کاشف العلوم آپ ہی کی تحریک سے قائم ہوا تھا، ۵ ذیقعدہ ۱۳۶۵ھ (۱۱ اکتوبر ۱۹۴۶ء) کو خود آپ ہی نے اس کا سنگ بنیاد رکھا مدرسہ کے ایک ذمہ دار اس کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"گرمی کا موسم تھا اور ان دنوں حضرت کا قیام منصوری تھا، اراکین مدرسہ کا ایک وفد اس سلسلہ میں وہیں حاضر ہوا اور منصوری سے ہی سنگ بنیاد رکھنے کے لئے آپ چھٹمل پور تشریف لائے، ظہر عصر کے مابین ایک مجمع کی موجودگی میں آپ نے

مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا، توبہ کرنے والے لوگ جماعت در جماعت آتے تھے
آنے والے صافے، چادریں وغیرہ پکڑ کر صف بستہ بیٹھتے تھے اور توبہ کرتے
جاتے تھے، ایک مجمع اٹھتا تھا، دوسرا مجمع آتا تھا، اندازہ ہے کہ کئی سو کی
تعداد میں لوگ بیعت ہوئے۔"

(مکتوب شریف احمد صاحب مہتمم مدرسہ)

آٹھواں باب (۸)

سیاسی رجحان، ملک کی تقسیم، فسادات، آبادی کا تبادلہ اور حضرت کے دلی جذبات و تاثرات

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

حضرت کا سیاسی مسلک و ذوق

حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ اپنے شیخ و مربی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری قدس سرہ کے نقش قدم پر تھے حضرت عالیؒ اپنے سیاسی خیالات، جذبۂ جہاد اور انگریز دشمنی میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تھے آپکو بھی وصیت فرمائی تھی کہ مولانا محمود حسن صاحبؒ کا ساتھ دیتے رہنا[1] سیاسیات میں انہیں سے رجوع اور مشورہ کی ہدایت بھی فرمائی تھی،

جب تک حضرت شیخ الہندؒ حیات رہے، حضرت اگرچہ عملی سیاسیات سے کنارہ کش اور رائے پور میں اپنے کام میں ہمہ تن مشغول و یکسو رہے لیکن حضرت شیخ الہندؒ ہی کو اپنا سیاسی مقتدیٰ مانتے رہے اور مخصوص ذہنی و روحانی تربیت اور اپنی افتاد طبع کی وجہ سے آپ کا ذہن و رجحان اس گروہ کے ساتھ رہا جو ملک کی آزادی کے لئے کوشش

(۱) تحریر مولانا محمد علی جالندھری (۲) افادہ حضرت شیخ الحدیث۔

کررہا تھا،[1] اور جس کے نزدیک اسلام کی وسعت اور اشاعت اور اس کے اخلاقی غلبہ و تسخیر کے وسیع امکانات، آبادی کے مختلف عناصر میں باہمی اعتماد و اتحاد میں مضمر تھے، آپ کے نزدیک ہندستان میں مسلمانوں کے بقا اور ارتقا اور اسلام کی عزت و غلبہ کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ مسلمان اس ملک میں اپنی صلاحیت و افادیت اور اپنے اخلاقی و روحانی تفوق کا نقش قائم کردیں اور اپنی بے لوث و بے غرض محبت و خدمت روحانی عظمت اور ذکر اللہ کی کثرت سے اپنے برادران اور ہندستان کی قدیم آبادی کا (جو زمانہ قدیم سے محبت و روحانیت کے تیر سے گھائل ہونے والی ہے) دل جیت لیں اور محبوبیت و اعتماد کا مقام حاصل کرلیں اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے کہ یہ ملک متحد ہو، ہندو مسلمان کو آزادانہ طریقہ پر ایک دوسرے سے ملنے اور دیکھنے کے مواقع حاصل ہوں، آپس میں سیاسی رقابت، تلخی و نفرت اور تقابل کی صورت نہ ہو،

تقسیم سے اختلاف

آپ کو اس حقیقت پر پورا الیقین تھا کہ ہندستان میں اشاعت اسلام اور مسلمانوں کیلئے مقبولیت و محبوبیت کے مقام کا اب بھی وہی راستہ ہے جو ساتویں صدی میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور صوفیائے کرام نے اختیار کیا اور وہ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرنے اور سیاسی طور پر ایک دوسرے سے بیزار اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہونے سے حاصل نہیں ہوسکتا،

(۱) ۱۹۳۵ء میں جب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رائے پوری (نومسلم) نے حزب الانصار کے نام سے ایک سیاسی تبلیغی جماعت قائم کی جس کے سیاسی مقاصد اور دستور العمل میں ملک کے لئے آزادی کامل کے حصول کی جدوجہد شامل تھی تو آپ نے اسکی سرپرستی فرمائی اور اس کے مطبوعہ دستور العمل میں آپ کا نام عرصہ تک بحیثیت سرپرست کے موجود رہا۔

اپنے اس ذہنی رجحان اور قلبی اذعان کی بنا پر نیز دینی جذبات، عملی اسلامی زندگی اور اخلاص و سرفروشی کی روح کی بنا پر آپ کا کھلا ہوا رجحان جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کی طرف تھا خاص طور پر جانشین شیخ الہندؒ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے تو آپ کو عشق و شیفتگی کی حد تک محبت و عقیدت تھی، آپ کو ان کے اخلاص و للّٰہیت و مقبولیت عند اللہ پر اعتقاد کامل تھا، اپنے خاص علم و احساس کی بنا پر اس میں ایک لمحہ کے لئے تردد نہیں پیدا ہوتا تھا دوسری طرف سیاسی بصیرت اور بالغ نظری میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے قائل تھے، مجلس احرار کا بھی یہی بنیادی فکر تھا، اور اس کے بانی و روح رواں مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ آپ سے بیعت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے اور آپ کو بھی ان دونوں سے گہرا اور عزیزانہ و سرپرستانہ تعلق تھا، اس سب کا نتیجہ تھا کہ آپ فکری و ذوقی طریقہ پر تقسیم کو مسلمانوں کیلئے مضر، اسلام کی اشاعت و ترقی کی راہ میں رکاوٹ اور نئی نئی مشکلات پیدا ہونے کا ذریعہ سمجھتے تھے،

تقسیم کے کمزور و مضر پہلو

پھر تقسیم کا جو نقشہ سامنے آیا تھا، جس میں مشرقی پنجاب ہندستان کے حصہ میں آرہا تھا اور عملاً اسکے نتیجہ میں مسلمانوں کا انخلاء ضروری تھا، اسکی بنا پر آپ تقسیم کو اور بھی مسلمانوں کیلئے خسارہ کا باعث اور گھاٹے کا سودا سمجھتے تھے، یہ علاقہ مغربی شمالی ہندستان کا اہم علاقہ تھا، پورے علاقہ میں مدارس اور خانقاہوں کا جال بچھا ہوا تھا، مسلمانوں کی قدیم علمی و تہذیبی تاریخ کا بھی ایک بڑا حصہ اس سے وابستہ تھا، بڑے بڑے مدارس سرہند، کوٹ عبدالخالق اور انبالہ کے بہت سے روحانی مرکز اس علاقہ میں تھے، اس کا چپہ چپہ آپ کا دیکھا اور پھرا ہوا تھا، آپ خود پنجاب کے رہنے والے تھے، وہاں کے حالات اور اس ملک کی صلاحیتوں اور کمزوریوں سے

واقف تھے۔ آپ کو معلوم تھا کہ وہاں کے دریاؤں کے (جن پر ملک کی شادابی و زرخیزی اور اہل ملک کی زندگی کا دارومدار ہے) دہانے اس علاقہ میں ہیں جو ہندستان کے حصہ میں آنے والا ہے، غرض آپ اس منصوبہ کے کمزور پہلوؤں اور آئندہ اس سے پیدا ہونے والی مشکلات اور الجھنوں سے خوب واقف تھے اور آپ کو حیرت تھی کہ مسلمانوں کے سیاسی رہنما کس طرح اس ناقص و مفلوج منصوبہ کو قبول کریں گے؟ ایک روز ۶ جمادی الثانیہ ۱۳۷۶ھ (۸ جنوری ۱۹۵۷ء) کو لاہور کی ایک مجلس میں تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"ہمیں تو تقسیم سے پہلے ہی معلوم تھا کہ تقسیم مسلمانوں کے لئے سراسر مضر ہے، کیونکہ میرا تو یہ ملک دیکھا ہوا تھا اور تمام نقشہ میرے ذہن میں تھا ہمارے قائد بیچارے صرف جغرافیائی حیثیت سے کچھ معلومات رکھتے تھے(۱) ملک کا دورہ نہیں کیا تھا، ان کو کیا معلوم کہ تقسیم کس طرح صحیح ہوگی؟ نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ جب دو بھائی مشترکہ چیز کو آپس میں تقسیم کرتے ہیں تو ہر ایک کو دوسرے سے نزاع ہی رہتا ہے کہ ہماری یہ چیز وہ لے گیا (اور دوسرا سمجھتا ہے) کہ ہماری یہ چیز وہ لے گیا، چنانچہ اب کشمیر کے متعلق بھی یہی نزاع ہو رہا ہے(۲)"

اسی زمانہ میں ایک دوسری مجلس میں فرمایا:۔

"انگریز مسلمانوں کے سخت دشمن ہیں، انھوں نے قصداً تقسیم میں مسلمانوں کو نقصان پہنچایا، لیکن ہمارے مسلمان ایسے سیدھے ہیں کہ اسی انگریز سے جو

(۱) یعنی جتنا جغرافیہ کے نصاب کی کتابوں میں پڑھا تھا اس سے زیادہ ان کی معلومات نہ تھیں۔

(۲) بیاض مولوی علی احمد صاحب مرحوم،

دشمن ہے تقسیم کرائی[1]:

مولانا مدنیؒ کی تائید

مولانا مدنیؒ چونکہ تقسیم کی مخالف جماعت (جمعیۃ العلماء) اور قوم پرور مسلمانوں کے رہنما تھے اور پورے خلوص و جانفروشی کے ساتھ اپنے نظریہ کی اشاعت و تبلیغ کے لئے میدان میں سینہ سپر تھے اور اسکے لئے طوفانی دورے فرما رہے تھے، مسلمانوں کی اکثریت پاکستان کے نعرہ سے مسحور اور ملک کی اکثریت کی تنگ دلی، کم حوصلگی اور تعصب کے مسلسل تجربہ کی بنا پر ایسی بیخود اور از خود رفتہ ہو رہی تھی کہ وہ مولانا کے مقام و احترام کا بھی لحاظ نہ رکھ سکی اور سید پور اور جالندھر میں نہایت نامناسب و ناخوشگوار واقعات پیش آئے، حضرت کی نظر مولانا کے اخلاص مسلمانوں کے ساتھ ان کے جذبۂ خیر خواہی، اور عنداللہ ان کی مقبولیت پر تھی آپ کو ان واقعات سے سخت ملال اور قلق ہوا، اور آپ نے بڑے جوش کے ساتھ علانیہ مولانا کی حمایت و تائید فرمانی شروع کی، اس وقت مسلمانوں کے جذبات اس رجحان کا ساتھ دینے سے قاصر تھے اور آپ کے بڑے مخلص و معتقد خدام کیلئے بھی یہ بڑے مجاہدہ اور امتحان کا وقت تھا، آپ کو ان کے اس رجحان کا خوب علم تھا، لیکن آپ نے اسکی بالکل پرواہ نہیں کی اور کھل کر مولانا کی تعریف و توصیف اور ان کی ذات کے ساتھ اپنی عقیدت و محبت کا اظہار فرمایا،

اسی زمانہ میں ۱۹۴۶ء کا الکشن آیا، آپ نے مولانا کے ساتھ اپنے تعلق قلبی کا برملا اظہار فرمایا اور اپنے مخصوص مخلصین کو ان کی حمایت کی ہدایت کی ۱۹۴۵ء میں الکشن کی تیاریاں اور رہنماؤں کے دورے شروع ہو گئے تھے، ۷ر نومبر ۱۹۴۵ء کو مولانا

---

(۱) ۸ر جمادی الثانی ۱۳۷۰ھ (۱۰ر جنوری ۱۹۵۱ء) بمقام لاہور، کوٹھی صوفی عبدالحمید صاحب۔

رائے پور تشریف لے گئے تو آپ نے اپنے ایک بڑے مجمع کے ساتھ قصبہ سے باہر نصف میل پر آکر مولانا کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ جائے قیام پر لے گئے اور چونکہ آپ تکلیف و ضعف کے باعث جلسہ میں دیر تک بیٹھ نہیں سکتے تھے، اس لئے جلسہ کی صدارت کیلئے اپنی جانب سے مولانا اشفاق احمد صاحب متولی مدرسہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کو مقرر فرما کر بھیجا، اور ایک پیغام اپنے خادم و معتمد خاص مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نومسلم مقیم خانقاہ کے ذریعہ حاضرین جلسہ کو بھیجا کہ "اگرچہ میں ۱۹۲۱ء کے خلافت اور کانگرس کے دور کے بعد اپنے دیگر مشاغل کی وجہ سے کسی سیاسی جماعت میں شامل نہ تھا مگر اب پورے شرح صدر کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ میں حضرت مولانا مدنی کے ساتھ ہوں میں اپنے دوستوں کو مجبور تو نہیں کرتا مگر میں اپنے متعلق کہتا ہوں کہ اگر میرا ووٹ ہو تو میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہ کو دوں اور ہر اس شخص کو ووٹ دوں جس کی مولانا مدنی سفارش کریں"[1]

تقسیم کا نفاذ اور اسکے نتائج

لیکن آپ مولانا مدنی اور اس گروہ کے نظریے کے خلاف جو تقسیم کا مخالف تھا بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان میں اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان میں تقسیم کا اعلان ہوگیا اور اسکا عملی نفاذ کر دیا گیا، اس موقع پر ایک طرف دہلی اور اطراف دہلی اور مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال میں، دوسری طرف مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب میں جو قیامت برپا ہوئی، دونوں طرف کے باشندوں کو جن لرزہ خیز مصائب سے گزرنا پڑا، جسطرح بستیاں نذر آتش اور لاکھوں انسانی جانیں لقمہ اجل بنیں، ٹرینوں میں اور اسٹیشنوں پر قتل عام ہوا، قافلے لٹے، اور انسان بھیڑ بکریوں کیطرح

(۱) مضمون اشتہار مطبوعہ بعنوان "ارشاد گرامی" شائع کردہ راؤ عبدالحمید خاں ولد راؤ عبدالرشید خاں ساکن قصبہ رائے پور ضلع سہارنپور۔

ذبح اور گاجر مولی کی طرح کاٹے گئے، جس طرح ننگ و ناموس بے قیمت و پامال اور انسان کا خون ارزاں ہوا وہ ایک تلخ ترین داستان ہے جو انسانیت کی پیشانی کا داغ اور حساس و دردمند انسان کے سینہ کا زخم ہے۔

دل کا زخم اس حادثۂ عالم آشوب سے ہر صاحب دل و صاحب بصیرت انسان کو اپنے اپنے احساس و علم اور اپنے اپنے درد و تعلق کے مطابق تکلیف پہنچی لیکن حضرت کو دہری تکلیف تھی، ایک طرف مشرقی پنجاب مسلمانوں کے وجود سے (جس کو قدرت الٰہی نے صدیوں سے اس حصہ کی قسمت میں رکھا تھا) خالی ہو گیا اور وہاں کی سرزمین مسلمانوں سے اور فضائیں اذانوں سے محروم ہو گئیں۔

مدارس آیات خلت من تلاوۃ

ومنزل "علم" مقفر العرصات[1]

آپ کی آنکھوں کے سامنے پنجاب میں آپ کے شیخ اور آپ کا لگایا ہوا باغ اجڑ گیا، اور جہاں ہر وقت اللہ کے نام کی صدا اور ذکر کے نغمے گونجتے تھے وہاں کی فضا پانچ وقت اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کی صدا کو ترسنے لگی، یہ آپ کے دل کا ایسا داغ تھا جو کبھی مندمل نہیں ہوا۔

دوسری طرف مغربی پاکستان میں نہتی ہندو آبادی کے ساتھ جو ظلم اور سفاکی ہوئی اس نے آپکے دردمند اور انسان دوست دل کو تڑپا دیا، آپکے نزدیک ان ناکردہ گناہ انسانوں کو دوسری جگہ کے مجرموں اور قاتلوں کے جرم اور مسلمانوں کے انتقام میں قتل کرنے کا کوئی شرعی و

(۱) جہاں آیات قرآنی کا دن رات درس ہوتا تھا وہ مقامات تلاوت تک سے محروم ہیں اور جہاں علم کا شب و روز تذکرہ تھا وہاں خاک اڑ رہی ہے۔

اخلاقی جواز نہ تھا۔

عرصہ تک رائے پور کی مبارک مجلسوں میں ذکر کے اوقات کے علاوہ دونوں طرف انسانوں کی مظلومیت اور انکے بھائیوں کی سفاکی کے واقعات کا تذکرہ ہوتا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت کے قلب حزیں کو اتنے تذکرہ سے بھی تسلی نہیں ہوتی اور سینہ کے داغ اندر اندر جل رہے ہیں آپ بار بار فرماتے تھے کہ ان نادانوں نے اشاعت اسلام کا ایک وسیع میدان اور اتنی انسانی روحوں کے مشرف باسلام ہونے کا نادر روزریں موقع کھودیا، اگر غیر مسلم آبادی وہاں رہ جاتی تو وہ خود یا ان کی اولاد اسلامی تہذیب و اخلاق سے متأثر ہوتی اور اللہ تعالےٰ انکا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا اور اسلام کی آغوش نئے نئے فرزندوں سے معمور ہوتی۔

مشرقی پنجاب سے جو مسلمان پاکستان ریلوں کے ذریعہ گئے تھے اور جن میں بہت سے آپ سے تعلق رکھتے تھے بڑے ہولناک مصائب سے گزر کر پہنچے، انکے بہت سے ساتھی ان کی آنکھوں کے سامنے تہہ تیغ ہوئے جو کسی نہ کسی طرح بچ کر پہونچے انکے بڑے دلدوز اور جگر خراش خطوط آئے، ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۸ء) میں سفر حج کے بعد جب راقم سطور رائے پور حاضر ہوا تو ان کے خطوط کا سلسلہ جاری تھا اور وہ مجلس میں پڑھے جاتے تھے اور ایک سناٹا چھا جاتا تھا۔

خود رائے پور میں مشرقی پنجاب کے بہت سے خدام و اہل تعلق جو رائے پور رمضان کرنے آئے ہوئے تھے مقیم تھے، پناہ گزینوں کی ٹرینیں برابر سہارنپور سے گزر رہی تھیں قدرتی طور پر ان غریب الوطن مسلمانوں کو اپنے وطن پہونچنے اور اپنے اہل وعیال اور خویش و اقارب سے ملنے کا اشتیاق و اضطراب تھا لیکن اس کا کوئی اطمینان نہ تھا کہ یہ لوگ صحیح سلامت پہنچ جائیں گے، اس لئے آپ متردد تھے اور اجازت نہیں دیتے تھے، بالآخر عرصہ کے انتظار

کے بعد آپ نے ایک روز اجازت دی، مولانا محمد علی صاحب جالندھری اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"جب ملک تقسیم ہوا پنجاب کے اکثر خدام رمضان گزارتے آئے ہوئے تھے مشرقی پنجاب کے مسلمان گھروں سے اجاڑ دیے گئے، یہ سب خدام بہت پریشان تھے، جب پتہ چلتا کہ کوئی ٹرین لاہور جائے گی، خدام اجازت طلب کرتے مگر حضرت اجازت نہ دیتے، خدام بے حد پریشان تھے، خبریں پڑھتے تھے، آخر ایک ٹرین کی اطلاع ملی کہ لاہور جائے گی، حضرت نے فرمایا جو جانا چاہتے ہیں تیار ہو جائیں، یہ پہلی ٹرین تھی جو صحیح سالم لاہور پہونچی، پہلی ٹرینیں جانی و مالی نقصان کرا کے آئیں۔"(۱)

یہ سب نتائج (خواہ اتنی مہیب اور واضح شکل میں نہ ہوں) حضرت کی دوربیں نگاہ اور اہل بصیرت کی نگاہوں کے سامنے تھے، جو ہوا وہ اندیشہ اور توقع سے بہت زیادہ اور قیاس سے بہت افزوں تھا، مگر ایسا نہیں کہ بالکل خلاف توقع ہوا اور نہ صرف فراست مومن بلکہ سیاسی بصیرت بھی اسکی پہلے ہی پیش گوئی کر چکی تھی،

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت ۔۔۔ سخن نازک تراز برگ سمن گفت
مگر با من بگو آں دیدہ در کیست ۔۔۔ کہ خارے دید و احوال چمن گفت

نقصان کی تلافی اور اصلاح حال کی صورت

حضرت کے نزدیک اس نقصان کی تلافی اور اصلاح حال کی صورت یہی تھی کہ تعلقات میں خوشگواری پیدا کی جائے اور کچھ اللہ کے بندے جو خدا کے نام کی حلاوت سے آشنا ہوں جان کی ہلاکت سے بے خطر

---

(۱) مکتوب مولانا محمد علی جالندھری بنام مؤلف کتاب۔

اور فقر و فاقہ کے خوف سے بے فکر و نڈر ہوں، مشرقی پنجاب کی خالی مسجدوں اور گوشوں میں توکلاً علی اللہ بیٹھ جائیں اور اخلاص اور درد کے ساتھ اللہ کا ذکر کریں، اگر کوئی ان سے بیمار پر دم کرانا چاہے یا کسی جائز ضرورت کیلئے تعویذ کی درخواست کرے اللہ تعالیٰ کے اعتماد و یقین پر اپنے کو محض بے اثر و بے بضاعت سمجھتے ہوئے تبلیغ وہدایت کی غرض سے کر دیا کریں، اگر اللہ تعالیٰ کو اس علاقہ میں پھر اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی سکونت منظور ہے تو ان کے "انفاس و نقوش" میں اثر و مسیحائی پیدا کرے گا اور لوگ ان کے معتقد ہو کر ان کا دین قبول کریں گے اور کم سے کم اسلام سے نفرت اور مسلمان سے وحشت دور ہوگی، لیکن افسوس ہے کہ کسی نے اس کی ہمت نہ کی اور حضرت کی آرزو پوری نہ ہوئی، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نومسلم نے البتہ مشرقی پنجاب اور خاص طور پر اپنے وطن قدیم پٹیالہ کے دورہ میں اس پر کہیں کہیں عمل کیا اور بعض حاجتمندوں کو تعویذ لکھ کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے آداب و شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ ایک نمازی مسلمان کو اتنے روز تک کھانا کھلایا جائے۔ "صاحب الغرض مجنون" کے مطابق بعض اہل ضرورت غیر مسلموں نے ایسے مسلمان کو دور سے "درآمد" کیا اور اس کو اپنے گھر رکھ کر روٹی کھلائی(۱) اللہ تعالیٰ نے عمل میں اثر دیا اور اس کا کام بھی ہو گیا، لیکن یہ سلسلہ مستقل طریقہ پر چلانے والا کوئی نہ ملا۔

(۱) اس سلسلہ میں یہ لطیفہ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے خود سنایا کہ ایک سکھ یا ہندو اس شرط کو پورا کرنے کے لئے کہیں سے ایک مسلمان لے آیا، لیکن بدقسمتی سے وہ بے نمازی تھا چونکہ عمل میں نمازی ہونے کی شرط تھی، اس لئے اسی غیر مسلم نے اس مسلمان سے مار مار کر نماز پڑھائی تاکہ عمل اور تعویذ میں اثر پیدا ہو۔

مسلمانوں کو جمانے اور تھامنے کا عظیم الشان کام

ایک بڑا مسئلہ جو تقسیم نے کھڑا کردیا تھا یہ تھا کہ

پاکستان کے بن جانے اور ہندستان کے حالات کے غیر یقینی ہونے کی بنا پر مسلمانوں کے قدم ہندستان میں ڈگمگا گئے اور بڑے بڑے پہاڑ تزلزل میں آگئے اور پاکستان ہجرت کر جانے کا ایک ایسا وسیع اور طاقتور رجحان بلکہ نشہ سب پر چھا گیا جس کو تھامنا اور مسلمانوں کو اس ملک میں مقیم رہنے پر آمادہ کرنا مجددانہ عزیمت و بصیرت کا طالب تھا اس کیلئے غیر متزلزل یقین اعتماد علی اللہ اور زبردست روحانیت اور قوت ایمانی کی ضرورت تھی یہ مسئلہ اگرچہ سارے ہندستان کا تھا اور ضلع سہارنپور میں جمنا کے مشرقی کنارے سے لیکر دریائے ہگلی تک اسکی لہر پھیلی ہوئی تھی، مگر سب سے بڑھ کر یہ سہارنپور کے سرحدی ضلع کا مسئلہ تھا اور درحقیقت یہی ضلع ہندستان میں مسلمانوں کے مستقبل کیلئے فیصلہ کن بنا ہوا تھا، اگر ضلع سہارنپور اکھڑتا اور وہاں سے مسلمانوں کا عمومی انخلا شروع ہو جاتا تو پھر ضلع مظفر نگر، میرٹھ اور ضلع بجنور کی باری تھی جو اس سے ملحق تھے، اس کے بعد مراد آباد کا بھی اعتبار نہ تھا اور اس کے معنی یہ تھے کہ یو۔پی جو مسلمانوں کا تہذیبی اور دماغی مرکز ہے مشرقی پنجاب بن جاتا اور ہندستان خدانخواستہ دوسرا اسپین بن کر رہتا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص اور اسکی کارسازی تھی کہ اس سرحدی ضلع میں مسلمانوں کے اندر استقلال و ثبات پیدا کرنے حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم اور سارے ہندستان کے مسلمانوں کیلئے سینہ سپر ہو جانے کا حوصلہ پیدا کرنے کیلئے اور اکھڑے ہوئے قدموں اور ڈگمگائے ہوئے دلوں کو جمانے کیلئے اس نے تین شخصیتیں عطا فرمائیں جنھوں نے ہندستان کے مسلمانوں کی اس گرتی ہوئی عمارت کو تھامنے کیلئے تین ستونوں کا کام کیا۔

ایک حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ جو بالکل جمنا کے مشرقی کنارے اور یو۔پی کی آخری سرحدی لکیر پر بیٹھے ہوئے تھے، اور دوسرے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب جو سہارنپور میں تشریف رکھتے تھے، تیسرے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جو دیوبند کے رکن رکین اور پورے صوبہ بلکہ ملک کے مسلمانوں کے اس وقت پشتیبان بنے ہوئے تھے۔

تقسیم کا نفاذ ہوا تو حضرت رائے پور ہی میں تھے، رائے پور والوں کے تعلقات مشرقی پنجاب، نیز مغربی پنجاب سے پہلے سے تھے ان میں سے بعض کی زمینیں اور بعض کے اعزا وہاں موجود تھے، سیاسی ذوق ورجحان کے اعتبار سے مسلمانوں کی اکثریت کی طرح وہ بھی تقسیم کے حامی تھے، ان کے اور مشرقی پنجاب کے درمیان صرف جمنا حائل تھی، پنجاب کی سرحد رائے پور کی بستی اور خانقاہ سے صرف چار میل پر واقع ہے، دریا کے اس پار جو بم یا گولے گرائے جاتے ان کی آوازیں اور دھماکے صاف رائے پور میں محسوس ہوتے افواہوں نے اور اطراف کے لٹے پھنکے قافلوں نے خوف وہراس اور افسردگی ویاس کی فضا پیدا کر دی تھی اور اس ملک کے مسلمانوں کا مستقبل نہایت تاریک نظر آ رہا تھا، جائدادوں اور زمینداریوں کا کچھ بھروسہ نہ تھا، ان کا انجام مشرقی پنجاب میں اچھی طرح دیکھ لیا گیا تھا، مسلمانوں کی عزت وناموس بظاہر ایک قصۂ ماضی تھا، رائے پور اور یو۔پی کے زمیندار حکومت کے عادی رہے ہیں، اب ان کو صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کی رعایا اور ان کے زیردست ان سے باغی ہو جائیں گے اور ان سے برسوں کا انتقام لیں گے غرض سارے حالات اور آثار اور علامات وقرائن ہجرت کے حق میں تھے اور ہندستان میں رہنا خلاف عقل، خلاف مصلحت اور بہت سے حضرات کے نزدیک خلاف حمیت اور مخالف اسلام نظر آ رہا تھا، نقشہ یہ تھا کہ جوالا پور، دہرہ دون اور جمنا پار کے

مواضعات کی آبادی اپنے ہم قوم وہم مذہب بھائیوں کے پاس رائے پور ٹھہری ہوئی تھی، دوسری طرف سے حملہ کی افواہیں پھیلتی رہتی تھیں، تین مرتبہ تو باقاعدہ حملہ کی اطلاع ملی جس کی نوبت خدا کے فضل سے نہیں آنے پائی، اہل رائے پور رات بھر پہرہ دیتے تھے اور چوکنا رہتے تھے، باغ (خانقاہ رائے پور) میں مشرقی پنجاب سے ماہ رمضان گزارنے کے ارادہ سے آنے والوں کا مجمع تھا، یہ سب بھی ایک اضطراب اور اشتباہ کی حالت میں تھے، اس سراسیمہ و مضطرب فضا میں آپ کا وجود، آپ کا اطمینان قلب و یقین اور آپ کی طرف سے تسکین و تلقین اہل رائے پور اور نواح و اطراف کے مسلمانوں کیلئے اطمینان قلب اور سکون خاطر کا واحد ذریعہ اور سرچشمہ تھا۔

مسئلہ نہ صرف رائے پور کے جانے کا تھا بلکہ سہارنپور کے مسلمانوں کی تقویت اور ان کو مطمئن کرنے کا بھی تھا جو ہندستان میں دینداری اور علم دین کا مرکز ہے اور جس کے اکھڑ جانے کے بعد قریبی اضلاع کا جمانا ناممکن ہو جاتا۔

"سہارنپور میں ہر وقت فساد کا خطرہ تھا، آتش زنی، غارت گری، دہشت انگیزی کی فضا چھائی ہوئی تھی، مسلمان ایک دائمی خوف اور بے چینی کی حالت میں تھے، راتوں کو محلوں میں پہرہ دیتے، جا بجا آگ لگائی جا رہی تھی، شہر کے مختلف گوشوں سے شور و غل کی آوازیں آتی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ حملہ ہو گیا، مسلمان اہل ثروت اور ذی حیثیت لوگوں کے گھر باہر سے آنے والے مسلمانوں کے کیمپ بنے ہوئے تھے، مسلمانوں نے اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے شہر کے ناکوں پر پہرے مقرر کر رکھے تھے۔"[1]

(۱) روایت حاجی یعقوب علیخاں و میر آل علی اور شاہ مسعود صاحب وغیرہ رؤسا سہارنپور۔

مسلمانوں کے سیاسی لیڈر پاکستان جا چکے تھے، یا رخت سفر باندھ رہے تھے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اس وقت نظام الدین دہلی میں محصور تھے، حضرت مولانا مدنیؒ دیوبند میں تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل وحرکت مشکل ہو رہی تھی دہلی اور سہارنپور کا راستہ بالکل غیر محفوظ اور خطرناک تھا، اس حالت میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ رائے پور سے بار بار سہارنپور تشریف لاتے، مسلمانوں کی ڈھارس بندھاتے اور ان کو قیام کرنے پر پختہ کرتے۔

"اس زمانہ میں معمول تھا کہ تقریباً ہر ہفتہ عشرہ سہارنپور ضرور تشریف لاتے اور مسلمانوں کو تسلی وتشفی دیتے، آپ کی تشریف آوری سے مسلمانوں کو اطمینان ہو جاتا، ستمبر ۴۷ء (۱۳۶۶ھ) میں ایک بار آپ خاص اسی مقصد کے لئے تشریف لائے اور سہارنپور کے مسلمانوں کو سمجھایا کہ وہ تشدد سے بالکل پرہیز کریں، فسادات کے موقع پر مار کھالیں مگر مقابلہ نہ کریں، ورنہ وہی حشر ہوگا جو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا ہوا"[1]

"ایک مرتبہ بڑے اہتمام سے تشریف لائے، خبر تھی کہ سہارنپور کے مسلمان حملہ کا ارادہ کر رہے ہیں اور کچھ کیمپ میں جا رہے ہیں، آپ نے سمجھایا اور فرمایا کہ تم حملہ تو کر دو گے اور کچھ لوگوں کو مار بھی دو گے مگر اس کے بعد اس کا جو نتیجہ نکلے گا اور مسلمانوں کا جو حشر ہوگا وہ بہت سخت ہوگا فرمایا کہ ہم نے دہلی کے حالات سے یہ سبق لیا ہے"[2]

غرض حضرت کی اس تلقین وہدایت اور بار بار کی مساعی سے ضلع سہارنپور کی مسلمان بستیاں

(۱) روایت حاجی یعقوب علیخاں اور میر آل علی (۲) روایت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رائپوری

وموا ضعات جن کے قدم اکھڑ چکے تھے یا ڈگمگا رہے تھے دوبارہ جم گئے اور انھوں نے اپنی جگہ رہنے اور حالات و مشکلات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا، آپ نے اسی زمانہ میں ایک مرتبہ فرمایا "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنٍ" اب یہ بے اطمینانی اور بے بسی کے دن نہیں رہیں گے۔(۱)

۵۔محرم ۶۷ھ (۱۹ نومبر ۴۷ء) کو حضرت شیخ الحدیث مولانا مدنیؒ کی معیت میں (جو اتفاقاً) دہلی گئے ہوئے تھے اور ایک فوجی لاری پر جس پر مسلح گارڈ تھی دیوبند تشریف لے جا رہے تھے، سہارنپور تشریف لائے۔ ۱۱ محرم ۶۷ھ (۲۵ نومبر ۴۷ء) یکشنبہ کو سہارنپور میں حضرت شیخ الحدیث کے دولت خانہ پر تینوں حضرات نے تخلیہ میں مشورہ کیا اور اس مشورہ میں اجتماعی طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ ہمیں ہندستان ہی میں رہنا ہے، حضرت رائے پوری کا وطن (جیسا کہ سوانح کے ابتدائی صفحات سے معلوم ہو چکا ہے) اور سارا خاندان نیز اہل ارادت و تعلق کی بڑی تعداد (جو مشرقی پنجاب سے اب پاکستان پہونچ چکی تھی اور سارے عزیزانہ تعلقات اسی حصہ میں تھے جو اب پاکستان کا قلب اور مرکز تھا) ان سب باتوں کا تقاضا یہی تھا کہ آپ پاکستان منتقل ہو جائیں لیکن ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو سامنے رکھ کر آپ نے بھی اپنے بارہ میں ہندستان ہی میں رہنے کا فیصلہ فرمایا۔ یقیناً بڑی سعید ساعت تھی جب ان حضرات نے جن سے لاکھوں مسلمانوں کا قلبی اطمینان وابستہ تھا یہاں رہنے کا یہ اجتماعی فیصلہ کیا، اگر خدانخواستہ اس وقت کے غیر یقینی حالات میں یہ حضرات اپنے بارہ میں دوسرا فیصلہ کرتے تو ہندستانی مسلمانوں میں سخت انتشار پیدا ہوتا اور پھر کوئی طاقت ہندستان کے مسلمانوں کو ہندستان

(۱) روایت حاجی فضل الرحمٰن خاں رائے پوری و دیگر حضرات۔

میں رہنے اور اپنے تعلیمی و تہذیبی مرکزوں کی حفاظت اور اس سرزمین سے وابستگی پر آمادہ نہ کر سکتی جس کے ہر چپہ پر ان کی صلاحیت اور ان کی قوت عملی کے نشان اور تاریخی یادگاریں ہیں۔

تائید غیبی اور حضرت کا جذبۂ تشکر

اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید انسانوں کی عزیمت کی منتظر رہتی ہے یَزِدْکُمْ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمْ جب ان حضرات نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا اور خاص طور پر سہارنپور کے مسلمانوں کو ثابت قدم رہنے اور حالات کا پامردی اور ہمت سے مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا اور ہمت قلبی اور دعا سے پوری طرح اس مقصد کی طرف متوجہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا غیبی سامان فرمانا شروع کیا وَلِلّٰہِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اس وقت یو۔پی میں پنڈت گووند بلبھ پنت وزیر اعلیٰ تھے، یو۔پی (بالخصوص مغربی شمالی اضلاع) کی فضا اس قدر مسموم ہو چکی تھی اور فرقہ وارانہ عناصر اس قدر حاوی اور آزاد تھے کہ ان پر غالب آنا اور مسلمانوں کو محفوظ و مطمئن کر کے ان کو انخلار سے روکنا اور فرقہ پرست و دہشت انگیز جماعتوں اور افراد کو کنٹرول میں رکھنا معمولی حاکم ضلع اور پولیس افسر کا کام نہ تھا، اس کے لئے حکومت کی واضح اور طاقتور پالیسی اور فیصلہ اور حکام کی بے داغ دیانت و خلوص اور اعلیٰ انتظامی قابلیت کی ضرورت تھی، کانگریس کے ہائی کمانڈ کے فیصلہ اور حکومت کی پالیسی کے مطابق بقیہ مسلمان آبادی کا ہندوستان میں رکھنا اور اس کے لئے پرامن فضا اور معتدل حالات پیدا کرنا طے شدہ تھا، گاندھی جی زندہ تھے اور روزانہ کی عبادتی تقریروں میں صاف طریقہ پر اسی کی تلقین کر رہے تھے، سہارنپور میں متعدد حکام ضلع (کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) آئے لیکن کوئی نظم و نسق کو قائم رکھنے اور مسلمانوں کی حفاظت میں کامیاب نہ ہو سکا، خود حکام

فضا اور جذبات سے متاثر تھے اور صاف دماغ سے کام نہیں کرتے تھے، بالآخر حکومت یو۔پی نے رامیشور دیال صاحب کو کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بنا کر بھیجا، پنتھ جی نے ان کی تعریف کی اور ان پر اعتماد ظاہر کیا، رامیشور دیال صاحب نے صاف طریقہ پر حکومت کے ذمہ داروں سے پوچھا کہ مسلمانوں کو ملک میں رکھنا منظور ہے یا نہیں؟ جواب اثبات میں ملا[۱]۔ وہ یہ فیصلہ کر کے آئے کہ اس مقصد میں کامیاب ہونا ہے، وہ بہت صاف دماغ کے انسان اور قوی الارادہ اور جری حاکم تھے، انھوں نے آتے ہی اکثر فرقہ پرست لیڈروں اور شر انگیز عناصر کو جیل بھیج دیا، توازن برقرار رکھنے اور سیاسی مصلحت کی بنا پر چند مسلمانوں کو بھی حراست میں لے لیا، شہر کا گشت اور ضلع کا دورہ کیا اور صاف اعلان کیا کہ اگر کہیں فساد کا خطرہ محسوس ہوا یا کسی نے کسی پر دست درازی کی تو بے تکلف گولی چلادی جائیگی اور فساد انگیز عناصر کو سخت سزا دی جائے گی، ان کی بیدار مغزی، غیر جانبداری اور جرارت سے فضا میں فوراً سکون پیدا ہو گیا اور دہشت انگیزی کا سلسلہ ختم ہو گیا، مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے اور مسلمان اپنے کو اس ضلع میں محفوظ محسوس کرنے لگے، رفتہ رفتہ سارے ملک میں حالات تبدیل اور پرسکون ہو گئے، سہارنپور کے مسلمانوں کے جم جانے نے پورے صوبہ کے لئے ایک مضبوط پشتہ کا کام کیا جو فوری طور پر کسی زبردست سیلاب کو روکنے اور اس کے پانی کو باندھنے کے لئے بنایا جاتا ہے، مظفر نگر، میرٹھ، بجنور، مرادآباد یہاں تک کہ یو۔پی کے وسطی اور مشرقی اضلاع کے صاحبِ بصیرت اور باخبر مسلمانوں نے اعتراف کیا کہ سہارنپور کے مسلمانوں کے عزم و ثبات نے (جس کا مرکز اور منبع انھیں شیوخ ثلثہ کی عزیمت و قوت ایمانی تھی) آہنی حصار کا کام کیا اور ہم سب اسکی

(۱) اس واقعہ کو حضرت بکثرت بیان کرتے تھے۔

بدولت محفوظ رہے۔

احسان مندی و ممنونیت (احسان کا ماننا) اور اس کا اعتراف و تذکرہ کرنا حضرتؒ کے خمیر میں تھا، اس میں مسلم و غیر مسلم کی حضرت کے یہاں قید نہ تھی، کوئی راستہ چلتے بھی احسان کر دیتا تو اس کو ہمیشہ یاد رکھتے اور اس کا اتنا تذکرہ کرتے کہ محسن خود شرمندہ ہو جاتا مسلمانوں کا سہارنپور میں اور پھر اسکے نتیجہ میں پورے یو۔پی میں رہ جانا حضرت کے نزدیک ایسا اہم واقعہ اور مسلمانوں کی زندگی میں ایک ایسی فیصلہ کن اور انقلاب انگیز بات تھی کہ اس میں جس نے جتنا حصہ لیا اس کا احسان حضرت کے نزدیک ناقابل فراموش تھا "مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ" کی تعلیم کے مطابق محسن کا شکریہ ضروری اور شرافت و ایمان کا تقاضہ تھا حضرت ہمیشہ بھری مجلس میں (جس میں اکثر ایسے حضرات بھی ہوتے تھے جو غیر مسلم کو کسی حالت میں شکریہ کا مستحق اور تعریف کے قابل نہیں سمجھتے تھے، بہت سے اس خیال کے ہوتے تھے کہ یہ سب سیاسی مصلحت اور نفاق تھا) پنڈت پنت کی اس پالیسی کی تعریف اور امیشور دیال صاحب کا شکریہ اور ان کے کارنامہ کا تذکرہ فرماتے اور بعض اوقات بہت سے حضرات کے لئے جو آپ سے تصوف کے نکات اور عارفانہ ارشادات سننے کے شوق میں آتے تھے، ان باتوں کا سننا (جو ان کے نزدیک بزرگی اور مشیخت کے خلاف تھیں) بڑا مجاہدہ اور امتحان تھا لیکن حضرت لوگوں کی عقیدت اور بد اعتقادی اور مدح و ذم سے بالکل مستغنی اور یکسو ہو کر بلا تکلف یہ تذکرہ فرماتے۔

راقم سطور کو خوب یاد ہے کہ جب حضرت ۱۹۴۷ء میں اس ناچیز اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی دعوت پر لکھنؤ تشریف لائے تو صبح و شام کی عمومی مجلسوں میں شہر کے بعض سربرآوردہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اور بعض اونچے عہدہ دار تشریف لاتے

ان میں سے اکثر حضرات ذہنی طور پر پچھلے اثرات سے متأثر تھے اور بعض محض اس شوق میں آتے تھے کہ آپ سے سلوک و معرفت کی باتیں اور وعظ و نصائح سنیں گے، حضرت اکثر اس احسان کا تذکرہ فرماتے، یہ وقت ہم دونوں کے لئے بھی بڑے مجاہدہ کا تھا بعض اوقات قصداً کوئی دوسرا دینی موضوع چھیڑ دیتے کہ حضرت کی توجہ اس پر مرکوز ہو جائے لیکن ہم لوگوں کی تربیت و اصلاح کے پیش نظر بھی حضرت قصداً اس تذکرہ کو چھیڑتے کہ وہ عقیدت جو اپنے ذوق کی تابع اور کسی ایسی بات سے متزلزل ہو جائے جو اپنے ذوق و نظریات کی سو فی صدی مطابق نہ ہو وہ قابل اعتماد نہیں، دوسرے یہ کہ اللہ کے وہ بندے جن کو دولت اخلاص و یقین سے نوازا جاتا ہے ان کے نزدیک لوگوں کی عقیدت و پسندیدگی اور مدح و تعریف پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتی۔

فلیتک تحلو والحیاۃ مریرۃ   ولیتک ترضی والانام غضاب
ولیت الذی بینی وبینک عامر   وبینی وبین العالمین خراب (۱)

۱۹۴۹ء اور شاید ۱۹۵۰ء تک بھی یہی سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سمجھ اور توفیق عطا فرمائی کہ مخلص و عارف کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں،

---

(۱) شاعر ابو فراس حمدانی کہتا ہے کہ کاش آپ میرے لئے شیریں ہو جائیں پھر چاہے پوری زندگی تلخ ہو اور کاش آپ مجھ سے راضی ہوں پھر خواہ سب انسان ناراض ہو جائیں، میرے اور آپ کے درمیان کا رشتہ قوی اور شاداب ہو، چاہے ساری دنیا کے تعلقات شکستہ اور ویران ہو جائیں،

مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے خوب فرمایا ہے ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے   یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

لیکن باوجود اس علانیہ تعریف واعتراف اور اظہار تشکر واحسان مندی کے جب بعض مخلصین نے جو ان اہل حکومت سے تعلقات اور بے تکلفی رکھتے تھے، ان اہل حکومت میں سے (جن کی حضرت تعریف فرماتے تھے) کسی سے ملاقات کی درخواست کی، یا ان کا اشتیاق ظاہر کیا، تو آپ نے سختی سے منع فرمایا اور صاف انکار کردیا یہاں تک کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم نے کئی بار پنڈت جواہر لال نہرو سے آپ کا نہایت بلند الفاظ میں تذکرہ کیا اور غائبانہ تعارف کرایا، حضرت سے بھی عرض کیا کہ کبھی ملاقات فرمائیں، حضرت نے صاف معذرت فرمادی اور کبھی کسی سے نہیں ملے، گویا یہ جو کچھ تھا محض شرافت نفس اور اسلام کی اخلاقی تعلیم واحسان مندی کے جذبہ سے تھا ورنہ اپنا حال وعمل تو یہی تھا کہ

من ولق خود بافسر شاہاں نمی دہم

کارنامہ کی عظمت

تقسیم ہند کے بعد کے پُرآشوب، ہوش رُبا اور زلزلہ انگیز سال گزر گئے، اس کی کیفیات بھی بہت سے لوگوں کے حافظہ سے فراموش ہوگئی ہوں گی، جنھوں نے نہیں دیکھا، ان کو اس کا نقشہ دکھانا اور اس کا صحیح تصور کرانا بھی مشکل ہے، ہندستان کے مسلمان اب اس ملک میں باعزت، آزاد اور شریک حکومت کی حیثیت سے رہنے اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے اور اپنی تہذیب، تعلیم اور مستقبل کی حفاظت کرنے کا عزم کرچکے ہیں لیکن بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اس صورت حال کے پیدا کرنے اور اس فضا کے قائم کرنے میں اس بوریہ نشین درویش اور اس کے عالی مقام رفیقوں کا کیا بنیادی حصہ ہے، جنھوں نے اشک صبح گاہی اور خون جگر سے اس حصار کی

تعمیر کی جس کے اندر ہندوستان کے مسلمان آج زندگی گزار رہے ہیں اور مسجدوں کے میناروں سے اذان کی صدائیں اور مدارس کے ایوانوں میں قال اللہ وقال الرسول کی آوازیں بلند ہیں

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخونِ دل
قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

نواں باب (۹)

یو۔پی اور دہلی کے سفر، مشرقی پاکستان کا ایک سفر، اور آخری سفر حج

خوشا وقت شوریدگان غمش　　اگر ریش بینند و گر مرہمش
ومادم شراب الم درکشند　　وگر تلخ بینند دم درکشند

(شیخ سعدی)

یو۔پی کے سفر مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا انخلاء اور اس پورے علاقہ کا یکسر مسلمانوں سے خالی ہو جانا حضرت کے حساس دردمند و آشنا پرور دل کے لئے بڑا سانحہ تھا جس کو صرف قوت ایمانی اور تسلیم ورضا کے جذبہ اور ملکہ نے برداشت کیا، اب حضرت کے ارشاد و تربیت کا میدان یا تو سہارنپور، اسکے اطراف و نواح اور قریبی اضلاع تھے یا پاکستان جہاں کا سفر قانونی مراحل طے کئے بغیر ممکن نہ تھا، ایسی حالت میں اللہ تعالٰے نے آپ کے فیوض و برکات اور ارشاد و تربیت کے لئے ایک دوسرا میدان مہیا فرما دیا، جو اگرچہ پہلے سے موجود تھا، مگر اس کا تعلق و انس آپ کی ذات گرامی سے تقسیم کے بعد سے ہوا، گویا وہ مشرقی پنجاب کے انقطاع کی تلافی تھی یہ یو۔پی کے وسطی اور مشرقی اضلاع تھے،

لکھنؤ کے سفر

یوں تو لکھنؤ کے بعض خدام کا تعلق اور ان کی آمد و رفت تقسیم سے پہلے سے شروع ہو چکی تھی، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" (جو اس وقت بریلی میں رہتے تھے) اور راقم سطور ۱۹۳۹ء کے آخر میں پہلی بار رائے پور حاضر ہوئے، اس کے بعد بھی یہ سعادت حاصل ہوتی رہی، لیکن حضرت کا پہلا سفر لکھنؤ ۱۹۴۶ء کی اخیر سردیوں میں ہوا، آپ دہلی سے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے، دوسرے دن مولانا محمد یوسف صاحب بھی تشریف لے آئے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں قیام رہا، وہیں سے چوبیس[۲۴] گھنٹے کے لئے (راقم سطور کے وطن) رائے بریلی تشریف لائے، علماء و عمائد کی ایک بڑی جماعت ساتھ تھی جن میں حضرت شیخ الحدیث اور مولانا محمد یوسف کے علاوہ (جو حضرت کے ساتھ ہی تھے) پیر ہاشم جان صاحب مجددی، مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی، مولوی ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی مرحوم، محمد شفیع قریشی صاحب (حال مقیم راولپنڈی) مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی بھی تھے، حضرت شاہ علم اللہ (جد امجد حضرت سید احمد شہیدؒ) کی مسجد کے سامنے دریا کے دوسرے کنارے یہ مبارک قافلہ اترا اور کشتی سے دریا عبور کر کے شاہ علم اللہ صاحبؒ کے دائرہ میں داخل ہوا۔ یہ ایک شب و روز کا قیام عجب کیف و سرور کا تھا، جس کی لذت شرکاء سفر کو اور اہل شہر کو ابھی تک یاد ہے، دوسرے روز صبح لکھنؤ واپسی ہو گئی۔

یہ حضرت کی لکھنؤ کی پہلی آمد ہے، بیعت کا سلسلہ اسی وقت شروع ہوا۔

۱۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۶۶ھ (۲۲ر اپریل ۱۹۴۷ء) کو دوبارہ تشریف آوری ہوئی، گرمیوں کا

زمانہ تھا، حضرت نے چند گھنٹے ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ[1] کے مکان پر آرام فرمایا، پھر مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے مکان واقع احاطہ سلیمان قدر میں منتقل ہو گئے، صبح شام بڑی پُرکیف مجلسیں ہوتی تھیں، شہر کے جن عمائد و اہل علم کو اطلاع ہو سکی وہ اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے تھے، اس سفر میں بھی متعدد خصوصی احبابؒ[2] داخل سلسلہ ہوئے۔

۱۶ ر جمادی الثانیہ (۲۶ ر اپریل) کو حضرت ڈیڑھ دن کے لئے رائے بریلی تشریف لے گئے یہ رائے بریلی کا دوسرا سفر تھا، وہاں کے قیام میں طبیعت بہت شگفتہ اور بشاش رہی، مسجد میں خاندان کے بعض نوجوانوں کے سامنے دیر تک یقین و توکل کا مضمون بیان فرماتے رہے، واپسی میں بھی پیادہ پا اسٹیشن تک تشریف لائے، جن مقامات یا قبور کا تعلق حضرت سید صاحبؒ یا حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کی تاریخ اور زندگی سے تھا ان کو خود جا کر ملاحظہ فرمایا۔ اس سفر میں حکیم صدیق احمد صاحب بریلوی اور بعض رامپوری احباب بھی ساتھ تھے۔

اس کے بعد لکھنؤ کے پانچ سفر اور ہوئے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک ہر سال حضرت ازراہ شفقت و کرم و تعلق خصوصی لکھنؤ تشریف لاتے رہے، پہلے دو سفروں (۱۹۴۹ء ۱۹۵۰ء)

---

(۱) مصنف کے بڑے بھائی اور مربی ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء نے عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے ننہیال قصبہ ہنسوہ ضلع فتحپور کے مدرسہ عربیہ میں مولانا عبدالحکیم صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (ضلع مظفر نگر) سے حاصل فرمائی۔ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ سے بھی تعلیم پائی پھر حضرت شیخ الہندؒ کے درس حدیث میں باقاعدہ شریک ہو کر دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کی۔ طب کی تعلیم اپنے والد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ نیز مسیح الملک حکیم اجمل خاں سے حاصل کی، پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے انیانز کے ساتھ بی۔ ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور میڈیکل کالج لکھنؤ سے ایم۔ بی بی ایس کی بیعت کا تعلق حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تھا مولانا کو آپ سے خصوصی تعلق تھا اور مولانا ہمیشہ لکھنؤ کی آمد پر آپ ہی کے مکان پر قیام فرماتے تھے تقریباً تیس برس ندوۃ العلماء کی نظامت کے عہدہ پر فائز رہے، مئی ۱۹۶۱ء کو وفات پائی اور حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ رائے بریلی میں مدفون ہوئے (۲) سید و علی صاحب آنا عامی بغرض بیعت پہنچے

میں قیام دارالعلوم میں رہا، دونوں مرتبہ پندرہ[15] بیس[20] روز قیام فرمایا، احباب کی ایک بڑی تعداد (جن میں اکثر کا تعلق لکھنؤ کی تبلیغی جماعت سے تھا) بیعت سے مشرف ہوئی شہر کے بہت سے احباب شب میں وہیں قیام کرتے اور رات کا پچھلا حصہ دارالعلوم کا مہمان خانہ اور مسجد ذکر سے گونجتے، حضرت اس منظر کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے،

اس کے بعد کے تین مسلسل سفروں (۵۱-۵۲-۵۳ء) میں قیام شہر کے تبلیغی مرکز مسجد واقع کچہری روڈ میں ہوا، یہ مرکز نیا نیا تعمیر ہوا تھا اور ابھی عمارت نامکمل تھی کہ حضرت کے قیام نے اسکو رونق بخشی اور صحیح معنی میں مرکز بنا دیا اور لکھنؤ کی فضا (جو شیعیت و بدعات سے متاثر ہے) ذکر کی صداؤں سے اس قدر منور و معمور ہوئی جتنی شاید عرصہ سے نہ ہوئی ہو گی،

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی

ہر سفر میں بہت سے احباب و مخلصین توبہ و بیعت سے مشرف اور ذکر سے مانوس ہوئے لکھنؤ میں حضرتؒ کا نظام الاوقات یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد سیر کو تشریف لے جاتے ہر سیر میں دریائے گومتی کے کنارے والی سڑک پر ہوا خوری فرماتے، کم سے کم دو میل ہو جاتا، اس ہوا خوری میں خدام و محبین کی ایک جماعت ساتھ ہوتی، عموماً چودھری نعیم اللہ صاحب مرحوم[(1)] ساتھ ہوتے اور جدید معلومات و تحقیقات اور اپنے سفر یورپ کے حالات سناتے چلتے، حضرت نہایت دلچسپی سے سنتے اور اپنے تاثرات بھی ظاہر فرماتے، بعض حضرات جو اس سیر میں خود حضرت کی زبان سے کچھ سننا پسند کرتے تھے اور ان کو چودھری صاحب کا مسلسل گفتگو فرمانا ناگوار تھا اس پر

(۱) ہندوستان کے مشہور قانون داں چودھری نعمت اللہ صاحب مرحوم (سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ) کے چھوٹے بھائی جو لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور عرصہ تک لکھنؤ یونیورسٹی میں قانون کے استاد بھی رہ چکے تھے حضرت سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے اور نہایت محبت و خلوص کے آدمی تھے، کراچی میں وفات پائی: رحمہ اللہ

معترض ہوتے، حضرت فرماتے کہ مجھے ان باتوں سے فائدہ اور میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے حضرت انکی دلداری فرماتے اور سلسلۂ گفتگو جاری رہتا، واپسی پر ڈاکٹر زین العابدین قدوائی صاحب کے مکان پر (جو مرکز کے قریب ہی ہے) تشریف لاتے اور انکے لائق فرزند ڈاکٹر محمد آصف قدوائی (ایم اے، پی ایچ ڈی) جو اردو انگریزی کے اچھے ادیب و صاحب قلم ہیں اور جن کے بعض انگریزی تراجم اور اردو تصنیفات سامنے آچکی ہیں) کے پاس تھوڑی دیر بیٹھتے، حضرت کو ایسے لائق و ذہین نوجوان مسلمان فاضل کی مستقل بیماری و معذوری سے بڑا رنج تھا، آپ ان کی بڑی دلداری فرماتے اور قریب قریب روزانہ ان کو وقت دیتے۔

مرکز میں عصر کی نماز کے بعد مستقل مجلس ہوتی جس میں شہر کے بڑے چیدہ و ممتاز اصحاب اہل علم اور اعلیٰ عہدہ دار تشریف لاتے، بالعموم یہ راقم سطور یا مولانا محمد منظور صاحب نعمانی سلوک و تربیت کے سلسلہ یا اہل اللہ کے حالات کے متعلق کوئی سوال کرتے اور حضرت بڑے انبساط و بشاشت کے ساتھ اس کا جواب دیتے، اپنے سلسلہ کے مشائخ یا دوسرے اہل اللہ کے بڑے مؤثر و کیف آور واقعات ارشاد فرماتے، اس مجلس میں ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم، شیخ ظہور الحسن صاحب (سابق ریونیو سکریٹری حکومت یو۔پی) مولانا عبدالباری صاحب ندوی، مولانا محمد اویس صاحب ندوی اور دوسرے علماء و مدرسین دارالعلوم ندوۃ العلماء بالعموم شریک ہوتے اور لطف اندوز ہوتے، اور بڑا فائدہ محسوس کرتے، لکھنؤ کی ایسی مفید و پرکیف مجلسیں دوسرے مقامات پر کم دیکھیں، حضرت نے بھی ان کا بعض دوسرے مقامات پر ذکر فرمایا، عشاء کے بعد بھی دیر تک مجلس رہتی، جن میں اکثر اوقات مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی اپنے قوی حافظہ اور غزل سرائی سے حضرت کو بھی اور حاضرین مجلس کو بھی محظوظ کرتے، ایک دو مرتبہ جگر صاحب بھی تشریف لائے اور حضرت نے ان سے کچھ سنانے کی فرمائش کی،

جب انھوں نے تکلف اور آہستہ آواز سے پڑھا تو فرمایا کہ کھل کر بے تکلف پڑھئے، ان مجلسوں میں حضرت کی بے تکلفی، سادگی اور رسوم و تکلفات اور لوازم مشیخت سے دوری کا اظہار ہوتا تھا، ہنسی کی کوئی بات ہوتی تو بے تکلف ہنستے، کوئی لطیفہ سنایا جاتا تو اس کا لطف لیتے، اچھے اشعار پڑھے جاتے تو ان کا ذوق لیتے اور تعریف فرماتے، غرض یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ آپ اس محفل سے الگ اور اس سطح سے بالاتر کوئی ہستی ہیں جو عروج میں محو اور نزول سے ناآشنا ہے۔

لکھنؤ کا قیام طویل ہوتا چلا جاتا تھا اور تعلق و عقیدت کا دائرہ بھی اسی طرح وسیع، آخری قیام ایک مہینہ رہا، ہر مرتبہ لکھنؤ سے پاکستان کے قصد سے روانگی ہوتی، اور یہیں سے اس کی تیاری شروع ہو جاتی۔

بریلی، رام پور، مرادآباد

لکھنؤ سے واپسی پر اکثر بریلی، رام پور ٹھہر کر جانا ہوتا، ایک دو مرتبہ مرادآباد ٹھہرنا ہوا، بریلی میں حضرت کی طالب علمی اور ملازمت کا زمانہ گزرا تھا، اگرچہ فرماتے تھے کہ وہاں میرا کچھ جی نہیں لگا، مگر وہاں سے خوب واقف تھے اور وہاں آپ کے کئی مخلص موجود تھے، جن میں حکیم صدیق احمد صاحب، حکیم عبدالرشید صاحب اور سید محمد یوسف صاحب منصورپوری مرحوم (جو وہاں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، حکیم صدیق احمد صاحب کے والد ماجد جناب حکیم مختار احمد صاحب امروہی آپ کے طب میں استاد رہ چکے تھے، قیام اکثر حکیم عبدالرشید صاحب کے یہاں رہتا، جن کو حضرت سے نہایت درجہ کا اخلاص و محبت ہے، رام پور میں مولانا ذوالفقار احمد صاحب اور ان کے بھائی صاحبان میزبان ہوتے یہ سب بھائی جو تاجر اور شرفاء شہر میں سے ہیں اور رامپور کے قدیم باشندے ہیں حضرت سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے، آپ کا اور ہمراہی خدام کا قیام زیادہ تر گھیر مردان خاں مدرسہ مطلع العلوم کے سامنے رہتا، مولانا عبدالوہاب خاں فاضل رام پوری بھی آپ سے منسلک تھے

اور برابر شریک مجلس رہتے رائپور میں جماعت اسلامی کا بھی مرکز تھا، اس جماعت کے خواص بھی کبھی کبھی زیارت کے لئے آتے اور مجلس میں شریک ہوتے،

صبح ہواخوری میں اکثر رامپور کے پرانے حالات اور نوابی عہد کا تذکرہ ہوتا، حضرت اپنی طالب علمی اور رام پور کے قیام کا تذکرہ فرماتے اور بعض واقعات سناتے،

مراد آباد ایک دو بار قیام رہا، وہاں سے سیدھے سہارنپور تشریف لے جاتے اور اکثر چند روز ٹھہر کر پاکستان روانہ ہو جاتے،

دہلی کا قیام

یوں تو دہلی کا سفر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہٗ کے خدام اور اہل تعلق کی درخواست پر اور پھر آخر میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات کیلئے بار بار ہوا، حضرت کی وفات کے بعد بھی اکثر حضرت شیخ الحدیث کے ساتھ نظام الدین مولانا محمد یوسف صاحب کے پاس ٹھہرنا ہوا، مگر تقسیم کے بعد کئی مرتبہ قصاب پورہ کے محبین و خدام کی درخواست پر نواب والی مسجد میں کئی کئی ہفتے قیام ہوا اور متعدد بار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کے مکان پر اس خصوصی تعلق کی بنا پر جو مولانا کو حضرت سے اور حضرت کو مولانا سے تھا، کئی کئی روز قیام رہا اور اہل شہر نے فائدہ اٹھایا، آپ کا قیام اہل دہلی کی (جو تقسیم کا زخم کھائے ہوئے تھے اور حالات سے اکثر پریشان رہتے تھے) تقویت کا باعث ہوا، نواب والی مسجد میں مولانا عبدالسبحان صاحب نے تقسیم کے بعد سے مدرسہ سبحانیہ جو پہلے قرول باغ میں تھا منتقل فرما دیا تھا، ان کی وجہ سے اہل محلہ میں اچھا دینی ذوق اور محلہ میں اسلامی رونق پیدا ہو گئی تھی، حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب کے متعلق بڑے بلند کلمات فرماتے تھے، اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے، مولانا بھی حضرت کو اپنے شیخ کی طرح سمجھتے تھے، اور بیحد عقیدت مند تھے، انکے صاحبزادوں، مولوی عبدالمنان

مولوی عبدالرحمٰن، مولوی عبدالحنان اور مولوی عبدالغفار صاحب سے حضرت کو بہت تعلق تھا، اہل محلہ میں حلیم الدین، رحیم الدین اور بدرالدین صاحبان بھی بڑا تعلق رکھتے تھے اور خدمت و میزبانی میں پیش پیش تھے، حاجی عبدالمجید صاحب موتی والے اور ان کے صاحبزادے حافظ عبدالجلیل صاحب پرانے تعلق کے لوگ تھے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ لدھیانوی بھی روزانہ تشریف لاتے رہتے تھے اور دیر تک رہتے تھے، حضرت حافظ فخرالدین صاحبؒ اور حافظ مقبول حسن صاحب اور دوسرے صلحاء تشریف لاتے، ان سب کی وجہ سے حضرت کو یہاں بہت انبساط اور بے تکلفی تھی، آپ خود بھی وقتاً فوقتاً نظام الدین تشریف لے جاتے اور حضرات نظام الدین بھی برابر تشریف لایا کرتے، ۱۳۶۹ھ (۱۹۵۰ء) کا رمضان بھی نواب والی مسجد میں گزرا، مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے قرآن مجید سنایا، حضرت بہت محظوظ ہوئے، اس وقت طاقت تھی تراویح پوری کھڑے ہو کر پڑھتے اور بڑے ذوق و شوق سے ان کا قرآن مجید سنتے، ان کے بعد مولوی عبدالمنان صاحب یا کوئی دوسرے بھائی نوافل میں قرآن مجید پڑھتے، حضرت چارپائی پر آرام فرماتے ہوئے سنتے رہتے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کو سہارنپور میں جب اس کی اطلاع ہوئی کہ رات کا بڑا حصہ اس طرح بیداری میں گزر جاتا ہے اور آرام کا موقع نہیں ملتا، تو حکماً بعد کے سلسلہ کو رکوایا اور تاکید بلیغ کی کہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے حضرت کی نیند میں خلل پڑے اور رات کو کچھ بھی آرام کا موقع نہ ملے۔

۱۳۷۲ھ (۱۹۵۳ء) کا رمضان منصوری پر ہوا، شاہ محمد مسعود صاحب نے ایک کوٹھی تھیلنٹ لاج (کلھڑی محلہ) کرایہ پر لے رکھی تھی، پچاس ساٹھ خدام کا قیام تھا، مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی نے قرآن مجید سنایا، تراویح کے بعد دیر تک مجلس

رہتی اوراس میں حضرت کو بہت انبساط رہتا، عید کی نماز حافظ عبدالقدیر صاحب کی مسجد کلھڑی میں پڑھی، عید کے دو چار روز بعد سہارنپور تشریف لے آئے۔

مشرقی پاکستان کا ایک سفر

حضرت نے مشرقی پاکستان کا بھی ایک سفر فرمایا، سید محمد جمیل صاحب جو حضرتؒ سے خادمانہ اور مخلصانہ تعلق رکھتے تھے ۱۹۵۳ء میں مشرقی پاکستان میں اکاؤنٹنٹ جنرل تھے، انھوں نے حضرت سے مشرقی پاکستان تشریف لانے کی درخواست کی اور نیازمندانہ اصرار کیا، حضرت نے انکے پاس خاطر سے منظور فرمالیا، دسمبر ۱۹۵۳ء میں یہ سفر ہوا۔ دہلی سے کلکتہ تشریف لے گئے، اور کلکتہ دو ایک دن قیام کرکے ہوائی جہاز سے ڈھاکہ تشریف لائے، مغرب کی نماز کے بالکل قریب جہاز ڈھاکہ پہنچا، ہوائی جہاز سے اترتے ہی جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، اور سید محمد جمیل صاحب کی قیام گاہ پر تشریف لے آئے۔

ڈھاکہ میں خان بہادر حاجی شیخ رشید احمد صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے حاجی متین احمد صاحب کا قیام تھا اور حضرت کے ڈھاکہ تشریف لے جانے کے بعد انھوں نے بیعت بھی کرلی تھی[1]۔ انھوں نے حضرتؒ سے درخواست کی کہ حضرت چاٹگام تشریف لے چلیں، اگرچہ ضعف بہت تھا لیکن تعلقات قدیم اور کمال شفقت

---

(۱) حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۹۴۶ء میں جب میں زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوا تو والد بزرگوار (حاجی رشید احمد صاحب مرحوم) نے دہلی میں مجھ سے فرمایا کہ اب تجھ کو رائپور حضرت رائے پوری کی خدمت میں جانا ہے لیکن حالات نے اس کا موقع نہیں دیا اور تقسیم ہوگئی، یہی بات شیخ صاحب مرحوم نے ۱۹۴۵ء میں حاجی امین الدین صاحب سے (جو حاجی متین صاحب کے عزیز دوست ہیں اور شیخ صاحب کے ساتھ سفر حج میں تھے) فرمائی تھی کہ تم کو اور متین کو رائپور بھیجیں گے بالآخر ڈھاکہ میں دونوں صاحب ایک وقت میں بیعت سے مشرف ہوئے۔

کی بناپر آپ نے اس کو قبول فرمالیا، حضرت ایک مختصر قافلہ کے ساتھ جو بھائی الطاف، مولوی عبدالمنان صاحب، سید جمیل صاحب، حاجی متین صاحب اور چند رفقاء پر مشتمل تھا، چاٹگام کے لئے روانہ ہوگئے، وہاں شیخ صاحب مرحوم کی سابق قیام گاہ "آشیانہ" میں قیام ہوا خاندان کے دیگر افراد بیعت ہوئے، حضرت کی تشریف آوری کی خبر وہاں کچھ اس طرح پھیلی کہ قرب وجوار کے اور وہاں کے حضرات کی آمد کا تانتا بندھا رہا، جن میں علمائے کرام، سرکاری افسران اور تجارت پیشہ لوگ کثرت سے تھے، چاٹگام تین روز قیام رہا۔ مولانا عبدالوہاب صاحب مہتمم مدرسہ ہاٹ ہزاری کی درخواست پر انکے مدرسہ میں تشریف لے گئے، یہ سفر کار کے ذریعہ ہوا تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ آنے جانے میں صرف ہوا، دو گھنٹے وہاں لگے، فاصلہ ایک طرف کا چودہ (۱۴) میل کے قریب ہے، اس کے بعد حضرت مفتی عزیزالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی درخواست پر ان کے مدرسہ پٹیہ بذریعہ ریل تشریف لے گئے، تقریباً تین گھنٹے وہاں قیام رہا، پورا دن آنے جانے میں صرف ہوا، صبح گئے تھے جمعہ کی نماز پڑھ کر وہاں سے روانہ ہوئے، مغرب کے وقت واپس آگئے، دونوں مدرسوں میں طلباء کی تعداد، تعلیم و رہائش کے بندوبست کو دیکھ کر حضرت کو بہت مسرت ہوئی۔

چاٹگام میں حضرت حاجی رشید احمد صاحب(۱) کے مزار پر تشریف لے گئے، مزار پر بہت دیر تک قیام کیا، واپس آکر اپنے مجمع میں فرمایا کہ ہم حضرت شیخ صاحب کو ان کی زندگی میں اتنا اونچا نہیں سمجھتے تھے الحمدللہ مزار پر آکر طبیعت بہت خوش ہوئی۔

(۱) خان بہادر حاجی شیخ رشید احمد صاحب موجودہ صدی کی ایک عجیب جامع شخصیت تھی جو "دست بکار و دل بیار" اور "دنیا خورد و عقبیٰ برد" کے اس زمانہ میں مصداق تھے، بیعت کا تعلق حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے تھا، اصلاح و تربیت اور صحبت و محبت بہت زیادہ مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ سے

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۷۵ پر)

مشرقی بنگال میں حضرت کا قیام پندرہ دن رہا، وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور واپسی ہوئی، ڈھاکہ اور چاٹگام میں لوگوں کی بڑی کثرت رہی[1]۔

آخری سفر حج

رائے پور کے بعض راؤ صاحبان اور روُساجن پر حج فرض تھا، حج کا ارادہ کر رہے تھے اور حضرت سے انھوں نے درخواست کی تھی کہ حضرت بھی تشریف لے چلیں، حضرت کو یہ اندیشہ ہوا کہ میرے عذر کر دینے سے شاید اس سفر ہی کا التوا ہو جائے اور فرض ان کے ذمہ رہ جائے، حضرت نے حج کا ارادہ فرما لیا۔

راقم سطور ۱۰ ر شوال ۱۳۶۹ھ کو رائے پور جا رہا تھا حضرت رائے پور سے سہارنپور تشریف لا رہے تھے، راستہ میں ملاقات ہوگئی، فرمایا کہ ہم حج کو جا رہے ہیں، میں نے تم کو خط لکھوایا تھا کہ تم بھی ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ، سہارنپور پہنچکر قانونی مراحل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۴) تھی اور اس سلسلہ میں تمام اکابر حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، پھر حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے بہت گہرے روابط تھے، دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تینوں کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے، دونوں مدرسوں کے اجلاس میں اردو میں اور علی گڑھ یونیورسٹی کے اجلاس میں انگریزی میں برجستہ تقریر فرماتے اور نہایت پابندی سے ان جلسوں میں شریک ہوتے، علماء کی مجلسوں سے لے کر وائسرائے تک کی مجلسوں میں یکساں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، تقسیم ملک کے بعد مشرقی بنگال کو اپنے قیام کے لئے انتخاب کیا اور وہاں بھی بہت جلد مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کرلی، ۲۰ ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو صبح تہجد کے بعد انتقال کیا اور چاٹگام میں اپنے کارخانہ کے پاس دفن ہوئے۔

(۱) روایت حاجی متین احمد صاحب۔

ٹیکہ و انجکشن کی تکمیل ہوئی اور سفر کی تیاری شروع ہوگئی، پہلے حضرت کا اور مخصوص ہمراہیوں کا ہوائی جہاز سے تشریف لے جانے کا قصد تھا،(۱) لیکن اس سال ہوائی جہاز کا پورا پروگرام قرنطینہ کے احکام کی بنا پر منسوخ ہوگیا تھا اس لئے بحری جہاز سے سفر اختیار کیا گیا۔

۱۲ ذیقعدہ ۱۳۶۹ھ (مطابق ۲۰ اگست ۱۹۵۰ء یوم یکشنبہ) سات بجے صبح دہلی کو روانگی ہوئی، حضرت شیخ الحدیث بھی مشایعت کیلئے ہمراہ تھے، ۱۵ ذیقعدہ کی شب میں ۹ بجے پالم ہوائی اڈے سے حضرت مع رائپور کے ہمراہیوں (راؤ عبدالحمید خاں، راؤ محمد سعید خاں، راؤ فضل الرحمٰن خاں اور راؤ مقصود علی خاں اور مولوی عبدالمنان صاحب رائپوری) کے ہوائی جہاز سے بمبئی کیلئے روانہ ہوئے، بمبئی میں تبلیغی جماعت کے خاص کارکن افتخار فریدی صاحب پہلے سے مقیم تھے انھوں نے قیام اور ضروری امور کا انتظام کر رکھا تھا اور ان کی موجودگی اور تعلقات سے بہت سہولت حاصل ہوئی، حضرت بہت ممنونیت کے ساتھ اس کا تذکرہ فرماتے تھے۔

۱۶ ذیقعدہ ۱۳۶۹ھ کو یہ راقم سطور مع اپنے عزیز رفقاء مولوی عبداللہ صاحب ندوی، مولوی سید رضوان علی ندوی، مولوی محمد طاہر منصور پوری، مولوی محمد رابع ندوی اور محمد ناظم صاحب دیوبندی مرحوم کے ساتھ اس قافلہ میں شامل ہوگیا(۲)۔ رائے پور کے راؤ صاحبان کے علاوہ فیض آباد کے عبداللطیف خاں، علاء الدین بہٹ کے ممتاز اور بریلی کے حکیم عبدالرشید صاحب بھی شریک قافلہ تھے، حضرت نے ازراہ شفقت آزاد صاحب کو بھی جو بمبئی تک پہنچانے آئے تھے اپنے ہمراہ لے لیا تھا،

(۱) اس کا ایک محرک قوی یہ تھا کہ حضرت اپنے ساتھ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کو بھی لیجانا چاہتے تھے اور ان کو بحری سفر میں سخت تکلیف ہوتی تھی، اس بنا پر ہوائی جہاز کا سفر طے کیا گیا تھا۔

(۲) راقم سطور کا یہ سفر حضرت شیخ الحدیث کی صاحبزادی مرحومہ کے حج بدل میں تھا۔

۲۰ ذیقعدہ ۱۳۶۹ھ یوم دوشنبہ (مطابق ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء) کی شام کو اسلامی جہاز روانہ ہوا حضرت مع مولوی عبدالمنان صاحب کے فرسٹ کلاس کے خصوصی کیبن میں تھے، ساتھ ہی لائبریری کا وسیع ہال تھا، جہاں پانچوں وقت باجماعت نماز ہوتی حضرت جماعت کے ساتھ نماز ادا فرماتے اور اکثر وہیں نشست ہوتی، پورے سفر میں (جب کہ بعض رفقاء جن میں یہ راقم سطور بھی تھا بہت بیمار رہے) حضرت بہت اچھے رہے حسب معمول ہوا خوری کیلئے نکلتے، غذا بھی ہوتی، بحری سفر اور جہاز کا طبیعت مبارک پر کوئی اثر نہ تھا صرف ایک دو دن حرارت کی وجہ سے غفلت رہی جس سے خدام بہت پریشان رہے مگر بحمداللہ جلد افاقہ ہوگیا۔

جہاز کو مکلا سے حجاج لینے تھے، اس لئے خلاف معمول ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۶۹ھ یوم یکشنبہ (۱۰ ستمبر) کی صبح کو وہ مکلا ٹھہرا، چوبیس گھنٹے کے قیام کے بعد جہاز پانچسو حجاج کو وہاں سے لے کر روانہ ہوا اور ۳ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ یوم شنبہ ۱۶ ستمبر کی صبح کو جدہ پہنچا، ہندستانی قونصل جنرل مولانا عبدالمجید حریری[1] جہاز پر استقبال کے لئے موجود تھے، ان سے بڑی سہولت حاصل ہوئی، جدہ کے ایک بڑے میمنی تاجر حاجی عبدالقادر نورولی کو ان کے اعزا نے بمبئی سے حضرت کی آمد کی اطلاع دے دی تھی وہ موٹر لانچ لے کر حاضر ہوئے اور بندرگاہ پر اتار کر سیدھے اپنے مکان واقع شارع قابل لیگئے، دو ایک ہمراہیوں کے ساتھ شب میں انھیں کے یہاں قیام ہوا لیکن چونکہ بقیہ ساتھی علیحدہ تھے، اس لئے حضرت نے انھیں کے پاس جانے پر اصرار فرمایا اور ان کے پاس حجاج منزل میں منتقل ہو گئے۔

جدہ میں مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی جو حجاز کی تبلیغی جماعت کے امیر د

(۱) مولانا عبدالمجید حریری بنارسی بڑے ذی علم فاضل اور ادیب عالم ہیں، حضرت سے عقیدت رکھتے تھے

ذمہ دار تھے، بندرگاہ سے ساتھ ہوگئے تھے، ان سب حضرات کی معیت میں قافلہ اگلے ہی روز قبیل مغرب مکہ معظمہ حاضر ہوا، سامان مدرسہ صولتیہ میں رکھا، بعد مغرب طواف وسعی سے فراغت کی، حضرت نے طواف وسعی پیدل ہی کی، ایک شب مدرسہ فخریہ میں قیام کیا، پھر مولانا سلیم صاحب کی تجویز کے مطابق باب باسطیہ پر شیخ حمزہ کتبی کے اس مکان میں تشریف لے گئے جو مولانا نے حضرت اور آپ کے چند ہمراہیوں کے لئے کرایہ پر لے لیا تھا۔

۸ر ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ (۱۲ر ستمبر ۱۹۵۰ء یوم پنجشنبہ) کو منیٰ گئے، سلیمان ہاشم مرحوم معلّم تھے (جو بالعموم تبلیغی جماعت کے معلم رہا کرتے تھے اور ان کے والد حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے سفر حج کے بھی معلم تھے) انھیں کا انتظام تھا اور وہ حضرت کا بڑا احترام کرتے تھے اور خادمانہ معاملہ فرماتے تھے۔

۹ر ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ (۱۳ر ستمبر ۱۹۵۰ء جمعہ) کو عرفات کا وقوف گرمی کی شدت کے باوجود خیریت سے گزرا، حضرت اور رفقاء خیمہ میں ذکر و دعا میں مشغول رہے رفقاء کے دل کو بڑی طمانیت و تقویت تھی کہ وہ اللہ کے ایک مقبول و مخلص بندہ کے ساتھ ہیں اور اس کی طرف الطاف الٰہی کے جو جھونکے متوجہ ہوں گے ان سے وہ قاصر الہمت بھی محروم نہ رہیں گے، اُولٰئک قوم لایشقی بھم جلیسھم۔(۱)

عرفات میں ایک عجیب لطیفہ غیبی اور آیت الٰہی کا ظہور ہوا، گرمی کی شدت اور حالات کے اس عالمگیر تغیر کی وجہ سے جس سے دنیا کا کوئی گوشہ مستثنیٰ نہیں، حجاج کی کثیر تعداد غفلت اور تفریح طبع میں مشغول تھی، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ توبہ و انابت، رجوع الی اللہ

(۱) یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والے بھی محروم نہیں رہتے۔

کی کیفیت میں کچھ محسوس کمی اور غفلت معلوم ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ کی رحمت مطلق نے جو اس عظیم و عزیز مجمع کو محروم نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس غفلت کے ازالہ اور اس کوتاہی کی تلافی کا عجب سامان کیا جس سے عقل حیران اور عقلا انگشت بدنداں رہ گئے اور وہ غفلت آن کی آن میں اس طرح دور ہوئی اور سارے مجمع پر خشیت وانابت اور رقت و تضرع کی ایسی فضا چھا گئی جو کسی وعظ و تاثیر اور انسانی تدبیر سے ممکن نہ تھی۔

اچانک آندھی آئی، افق سے ابر اٹھا اور دیکھتے دیکھتے ایسے زور کی زالہ باری ہوئی کہ خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں، خیمے لوگوں پر گر گئے، رونے والوں کی چیخیں نکل گئیں ہمارے معلم (سلیمان ہاشم) دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، ایک حشر کا منظر تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب انابت کی ایک عام فضا پیدا ہو گئی اور آنکھوں نے اشک باری اور دلوں نے اضطراب و اضطرار کی وہ مقدار چند لمحوں میں پوری کر دی جو پورے دن کے وقوف و قیام میں نہیں ہوئی تھی تو اچانک مطلع صاف ہو گیا اور تھوڑی دیر کے اُولے اور پانی کا چھینٹا وہ کام کر گیا جو بیسیوں دینی ادارے اور واعظین اور سحر انگیز مقررین کی منظم جماعتیں نہیں کر سکتی تھیں وما یعلم جنود ربك الا هو۔

حاجی فضل الرحمٰن صاحب کہتے ہیں کہ حضرت افق کی طرف دیکھتے رہے، اس وقت تک آسمان صاف تھا، اچانک آپ نے محسوس کیا اور لاری میں آکر بیٹھ گئے اسکے بعد ہی یہ طوفان اٹھا اور دیکھتے دیکھتے اپنا کام کر کے نکل گیا۔

عرفات سے مزدلفہ، مزدلفہ سے منیٰ واپسی ہوئی، منیٰ سے تیسرے روز پہلے لاری سے کچھ دور روانہ ہوئے، پھر جب لاریاں رُکیں تو حضرت اتر آئے اور بقیہ ۳-۴ میل پاپیادہ چل کر مکہ معظمہ حاضر ہوئے۔

اس سال کی ایک خصوصیت جس کو الطاف خداوندی میں شمار کیا جا سکتا ہے جو ایک مقبول و مخلص بندہ کی وجہ سے نصیب ہوئی یہ تھی کہ شیبی صاحب (کلید بردار خانۂ کعبہ) نے جن سے پہلے سے کوئی تعلقات نہ تھے اس سفر کے ایک ہمراہی کو خود خانہ کعبہ کے داخلے کی دعوت دی اور اسکی اجازت دی کہ جن لوگوں اور ہمراہیوں کو وہ ساتھ لانا چاہیں لائیں، گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت کی ضیافت تھی، اس صلائے عام سے پورا فائدہ اٹھایا گیا اور نہ صرف اس قافلے کے ہمراہیوں نے بلکہ بہت سے دوسرے احباب اور غیر متعلق ساتھیوں نے بھی نہایت اطمینان کے ساتھ کسی ناجائز و مکروہ وسیلہ (بخشش وغیرہ) کو اختیار کئے یا کشمکش و مزاحمت کے بغیر داخلہ کا شرف حاصل کیا اور اطمینان سے جوف کعبہ میں نوافل پڑھے بعض ساتھی چونکہ رہ گئے تھے دوسرے دن شیبی صاحب نے ازراہ کرم دوبارہ اجازت دی اور انتظام کیا اور پھر حضرت کی معیت میں دوبارہ داخلہ ہوئی اور اطمینان سے نوافل و دعا کا موقع ملا اور اس طرح سے ضعفا اور نااہل بھی اس شرف سے سرفراز ہوئے۔

مور مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد
دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

بعض رفقائے سفر و خدام جو اس سے پہلے بھی مکہ معظمہ حاضر ہوئے تھے اور اس کے بعد بھی متعدد باران کو یہ شرف حاصل ہوا لیکن کبھی اس سہولت اور خوبی کے ساتھ داخلے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی، اس کو حضرت کے اس سفر کی برکت اور اللہ تعالیٰ کا انعام خصوصی سمجھتے ہیں۔

مکہ معظمہ میں بقیہ دن قیام مدرسہ صولتیہ کی بالائی منزل کے ایک حصہ پر تھا، اگرچہ راستہ پیچ و خم کا اور دراز تھا مگر حضرت اس وقت تک اتنی مشقت برداشت فرمالیا

کرتے تھے، عصر سے عشا تک حرم شریف کے اندر باب الزیادہ کے سامنے اور میزاب رحمت کے مقابل گزرتا، مغرب کے بعد طواف کا معمول تھا، تبلیغی جماعت کے بیٹھنے کی جگہ پر نشست رہتی، گرمی کے وقت اور دوپہر میں اس خلوہ میں تشریف رکھتے جو مولانا سلیم صاحب نے رکھا تھا، اس کی وجہ سے حرم شریف میں نمازوں کے ادا کرنے میں بڑی سہولت ہوتی تھی۔

مکہ معظمہ میں بعض عمائد و علماء بھی ملے، اس سال دمشق کے ایک مشہور عالم اور طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ خالدیہ کے ایک شیخ جو شام میں ایک بڑے حلقہ کے مرجع و مرشد ہیں شیخ احمد کفتارو بھی آئے ہوئے تھے، انھوں نے راقم سطور سے ایک روز فرمایا کہ میں تمہارے شیخ سے ملنا چاہتا ہوں اور تنہائی میں اپنے کچھ حالات اور سلوک سلسلہ کی بعض مشکلات عرض کرنا چاہتا ہوں، میں نے اس مجلس کا انتظام کیا، انھوں نے بعض چیزیں دریافت کیں، حضرت نے ان کا جواب دیا، جس سے ان کی تشفی ہوئی۔

یکم محرم الحرام ۱۳۷۰ھ یوم شنبہ (۱۴ اکتوبر ۱۹۵۰ء) کو جدہ سے ہوائی جہاز کے ذریعہ مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، بیس روز قیام رہا، قیام مدرسہ علوم شرعیہ میں تھا، مولانا سید محمود صاحب[1] بڑی خصوصیت سے ملتے رہے، ایک روز اپنے باغ میں جو مسجد قبلتین کے قریب ہے مدعو فرمایا اور ناشتہ کی دعوت دی، ایک روز مکان پر ضیافت فرمائی، مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں بھی حضرت نے شرکت فرمائی، مولانا عبدالغفور صاحب نقشبندی اور بعض صلحاء و مشائخ بھی ملتے رہے۔

مدینہ طیبہ میں حضرتؒ کا معمول تھا کہ مسجد نبوی میں داخل ہو کر بہت ہی خاموشی کے

---

(۱) برادر اصغر مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور سرپرست مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ

ساتھ ایسی جگہ بیٹھ جاتے جہاں جاننے پہچاننے والے نہ ہوں، وہاں دیر تک خادمانہ مؤدبانہ حاضر رہتے، پھر اٹھ کر قیام گاہ پر تشریف لے آتے، خدام کو بعض اوقات اس ادا کی وجہ سے حضرت کو اس وسیع و معمور مسجد میں تلاش کرنا پڑتا۔

۱۶ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ یکشنبہ (۲۹ اکتوبر ۱۹۵۰ء) کو مدینہ طیبہ سے جدہ واپسی ہوئی، وہاں سے ایک شب کے لئے بغرض عمرہ مکہ معظمہ حاضر ہوئے، عمرہ کے مناسک ادا کئے، حضرت نے شیخ الحدیث کی جانب سے عمرہ کیا، ایک شب کے قیام کے بعد جدہ واپسی ہوئی، ۲۰ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ (مطابق ۲ نومبر ۱۹۵۰ء پنجشنبہ) کو محمدی جہاز سے روانگی ہوئی، جہاز میں ڈیلکس کیبن مل گیا تھا، جس میں حضرت کو بہت آرام[1] ملا۔ اسی جہاز پر مولانا محمد شفیع صاحب بجنوری بھی ہندستان واپس ہو رہے تھے، حضرتؒ کو ان کا بڑا خیال تھا، وہ عرشہ پر تھے اور سردی اور ہوا کی بہت تکلیف تھی، حضرت نے حاجی فضل الرحمٰن خاں کو اشارہ کیا، اور انھوں نے مولانا کو اپنی جگہ اپنے کیبن میں ٹھہرا دیا، مولانا بڑے خوش ہوئے اور بڑی دعائیں دیں۔

۲۸ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ جمعہ (۱۰ نومبر ۱۹۵۰ء) کو بمبئی پہنچے، اہل بمبئی کے اصرار پر چند روز قیام منظور فرما لیا، وہاں سے بعض مخلصین آپ کو پونہ، سورت اور ڈابھیل لے گئے وہاں سے بمبئی تشریف لائے اور ۹ صفر ۱۳۷۰ھ دوشنبہ (۲۰ نومبر ۱۹۵۰ء) کو ہوائی جہاز سے بمبئی سے روانہ ہو کر دہلی تشریف لائے، وہاں سے ۱۱ صفر ۱۳۷۰ھ (۲۲ نومبر ۱۹۵۰ء چہارشنبہ کو سہارنپور پہنچ گئے، دو روز قیام فرما کر ۱۴ صفر ۱۳۷۰ھ (۲۵ نومبر ۱۹۵۰ء شنبہ) کو بہٹ ٹھہرتے ہوئے اپنے مستقر رائے پور تشریف لے آئے۔

---

(۱) واپسی میں راقم سطور کو معیت کا شرف حاصل نہیں ہوا، میں حجاز میں ٹھہر گیا تھا۔

دسواں باب (۱۰)

پاکستان کے سفر

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند (اقبالؔ)۔

پاکستان میں آپکے ارادتمند پچھلے ابواب واوراق سے معلوم ہوچکا ہے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے پنجاب کے مشرقی حصہ کے اضلاع وقصبات آپسے بڑی گہری عقیدت اور روحانی ارتباط رکھتے تھے، یہ سلسلہ پنجاب کے مغربی حدود تک پھیلا ہوا تھا: آپکے دو جلیل القدر خلفاء منشی رحمت علی صاحب اور مولانا اللہ بخش صاحب کا اسی صوبہ سے تعلق تھا، اول الذکر مشرقی پنجاب میں تھے اور آخر الذکر مغربی پنجاب میں، ان دونوں کے علاوہ علماء ومخلصین کی ایک بڑی تعداد اس سلسلہ سے وابستہ تھی، انبالہ، کرنال، لدھیانہ، جالندھر، فیروزپور، امرت سر کے بہت سے قصبات اور دیہات اور وہاں کے بہت سے مدارس اور ان کے علماء ومدرسین پہلے حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ سے، پھر ان کے جانشین حضرت مولانا عبدالقادر صاحب سے بیعت و محبت کا تعلق رکھتے تھے، اسی طرح لاہور، ملتان، لائل پور، بہاول پور اور پنجاب کے بہت سے شہروں اور قصبات میں اہل تعلق پھیلے ہوئے تھے، یہ مخلصین وقتاً فوقتاً رائپور حاضر

ہوتے اور آپ تقریباً ہر سال پنجاب کا سفر فرما کر ان کو اپنی زیارت و شفقت سے بہرہ یاب فرماتے اور اپنی صحبت و تلقین سے ان کے قلوب میں تازگی و گرمی پیدا فرماتے رہتے، خود آپ کے اعزا و اقارب ضلع سرگودھا میں تھے اور ان میں بہت سے رائے پور حاضر نہیں ہو سکتے تھے، آپ ازراہ شفقت و صلہ رحمی اپنی ملاقات و تشریف بری سے ان کی دلداری بھی فرماتے رہتے۔

ناقابل شکست رشتہ

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا، خاندان بٹ گئے، وطنیت تبدیل ہوگئی، ایک طرف سے دوسری طرف جو گیا اس نے اپنے لئے نئی دنیا تعمیر کی، محبت و عقیدت وہ چیز ہے جو نہ تقسیم قبول کرتی ہے نہ تبادلہ پر راضی ہوتی ہے نہ پہاڑ اور دریا اس کی راہ میں حائل ہیں، نہ جغرافیائی و سیاسی حدود اس مقصد میں حارج،

اسکی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور

جو لوگ ہندستان سے پاکستان گئے انھوں نے ہندستان کی ہر چیز سے صبر کر لیا اور پاکستان کو اپنا وطن اور مدفن سمجھا لیکن جن شخصیتوں کی محبت و عقیدت ان کے دل و دماغ میں پیوست ہو گئی تھی اور جن سے ان کا روحانی رشتہ تھا ان کو وہ فراموش نہ کر سکے اور ان کی یاد کو اپنے دل سے نکال نہ سکے، بلکہ خونیں واقعات، دوستوں کی بے مہری دنیا کی بے ثباتی اور مال و دولت کی بے وفائی کے تجربوں نے ان بے غرض محسنوں اور سراپا شفقت بزرگوں اور مربیوں کی یاد اور زیادہ تازہ کر دی اور غفلت و مادیت کے حملہ اور خطرہ کے احساس نے ان مصلحین اور ان سے ربط و صحبت کی ضرورت کا احساس بدرجہا زیادہ بڑھا دیا۔

دوسری طرف سیاسی تبدیلیاں اور ملکی مصلحتیں، ان حضرات کے خلوص و محبت ہمت

شفقت اور بے لوث و بے غرض جذبۂ خدمت گزاری اور نفع رسانی کے جذبہ میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، ان کا جس مخلص گروہ سے تعلق تھا اس کا قدیم زمانہ سے شعار و اعلان رہا ہے کہ۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

پاکستان کے سفر تقسیم کے بعد جب دونوں طرف سے آنے جانے والوں کو نئی مشکلات پیش آنے لگیں تو یہی آسان معلوم ہوا کہ آپ خود پاکستان تشریف لیجایا کریں اور کچھ روز وہاں کے مرکزی مقامات پر قیام فرما کر وہاں کے خدام واہل تعلق کو شادکام فرما دیا کریں اور اس طرح اس دوری و مہجوری کی تلافی ہو جایا کرے جو ملک کے ناگزیر سیاسی حالات و واقعات نے پیدا کر دی ہے، آپ تقسیم کے بعد تقریباً ہر سال پاکستان تشریف لے جاتے اور کئی کئی مہینے قیام فرماتے۔[1] اس مدت میں پورے ملک میں پھیلے ہوئے مخلصین واہل تعلق ہر جگہ سے کھنچ کر آپ کے پاس جمع ہو جاتے اور اپنی اپنی توفیق وہمت اور حالات واستطاعت کے مطابق قیام کرتے اور نفع اٹھاتے ہر سفر میں صدہا کی تعداد میں نئے لوگ توبہ وبیعت سے مشرف اور ذکر وفکر سے مانوس ہوتے، جہاں آپ کا قیام ہوتا وہی جگہ ایک عظیم الشان خانقاہ بن جاتی، جو ہر وقت ذکر الٰہی سے معمور اور سکینت قلبی سے پرنور ہوتی، اور وہاں کی سادگی کا منظر اور ذکر و عبادت کی کثرت "صفۂ نبوی" کی یاد تازہ کرتی،

تقسیم کے بعد پہلا سفر تقسیم کے بعد حضرت کا پہلا سفر پاکستان ربیع الاول ۱۳۶۸ھ

(۱) ۱۹۵۶ء کا پورا سال پاکستان میں گزرا۔

(جنوری ۱۹۴۹ء) میں ہوا، ۱۰ ربیع الاول ۱۳۶۸ھ (۱۰ جنوری ۱۹۴۹ء) کو آپ دہلی تشریف لے گئے
اور ۲۶ ربیع الاول ۱۳۶۸ھ (۲۶ جنوری ۱۹۴۹ء) کو ہوائی جہاز سے کراچی روانہ ہوئے، یکم فروری
کو کراچی سے ملتان تشریف لے گئے، وہاں سے ۹ فروری کو لائل پور اور ۲۰ کو ڈھڈیاں تشریف لے گئے
یہ حضرت کا پہلا سفر تھا، اسکے بعد لگاتار سفر ہوتے رہے جس میں زیادہ تر قیام لاہور ہوتا تھا (۱)

مولانا عبداللہ صاحب فاروقی کا مکان

۱۹۵۱ء تک لاہور میں آپ کا قیام مولانا عبداللہ صاحب فاروقی مرحوم (۲) کے مکان

---

(۱) یادداشت حضرت شیخ الحدیث (۲) مولانا عبداللہ صاحب فاروقی مولانا محمد صاحب کے صاحبزادے تھے جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے اپنے والد بزرگوار سے عشقی طبیعت وراثت میں پائی تھی حضرت شیخ الہندؒ کے خصوصی تلامذہ میں سے تھے اور حضرت ہی سے بیعت تھے طالب علمی کے زمانہ میں مولانا حبیب الرحمن مہتمم دارالعلوم دیوبند نے انکو حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں پیش کیا کہ آپکے خلیفہ کا لڑکا ہے اسکو بیعت فرمالیں، اس پر حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اس کو محبت تو مولوی محمود حسن سے ہے میں بیعت کر کے کیا کروں گا۔ چنانچہ اصرار کر کے حضرت شیخ الہند ہی سے بیعت ہوئے شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ سے رجوع کیا، حضرتؒ سے غایت درجہ کا تعلق تھا بھاٹی دروازہ کے مسلم ہائی اسکول لاہور میں فارسی ٹیچر تھے اپنے والد صاحب کی طرح گریہ بہت غالب تھا روتے روتے رخساروں پر نالیاں سی بن گئی تھیں، اکثر حافظ کے اشعار پڑھتے اور کبھی کبھی وجد میں آکر حضرتؒ کو بھی سناتے تھے اخیر میں بہت زیادہ بیمار ہو گئے تھے، نہ بول سکتے تھے نہ چل پھر سکتے تھے بس ایک رونا ہی رونا تھا، رامپور کا نام لیا اور چیخ نکلی ۱۹۵۶ء میں میو اسپتال میں انتقال ہوا جنازہ صوفی صاحب کی کوٹھی پر بعد تراویح لایا گیا، نماز حضرت کے حکم سے مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی نے پڑھائی، مولوی عبدالوحید صاحب کہتے ہیں کہ میں نماز کیلئے حضرتؒ کے ساتھ کھڑا ہوا حضرت فرمارہے تھے بہت ہی مبارک آدمی تھے، ایسی طبیعتیں اور نسبتیں بہت ہی خال خال ہوا کرتی ہیں اور اس زمانہ میں تو بالکل ہی کم ہیں، میں ہی حضرت مولانا کو جانتا ہوں کہ حضرت مولانا کیا چیز تھے۔"

(چنگڑ محلہ) میں رہا، مولانا اپنی قلیل تنخواہ کے باوجود اولوالعزمی اور بڑے ذوق و شوق سے میزبانی کے فرائض انجام دیتے اور اسکو اپنے لئے ایسی سعادت اور خوش بختی خیال فرماتے کہ کسی طرح اس میزبانی کے حق اور شرف سے دست بردار اور دوسروں کے حق میں ایثار کیلئے تیار نہ ہوئے حضرت کی طبیعت نہایت حساس واقع ہوئی تھی اور شفقت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی مولانا کے دل کی فراخی کے ساتھ ان کے مکان کی تنگی اور آمدنی کی قلت کے ساتھ مہمانوں کی کثرت کا شدت سے احساس تھا، مگر یہ موضوع ان کیلئے بڑے حزن و ملال کا باعث بن جاتا تھا بعض اوقات پاؤں پکڑ کر اور رو کر عرض کرتے کہ ان کو اس دولت سے محروم نہ کیا جائے۔

صوفی عبدالحمید صاحب کی کوٹھی

لیکن رفتہ رفتہ مہمانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور حضرت کا احساس بھی تیز ہوتا گیا کہ خود مولانا کو اور ان کثیر التعداد مہمانوں کو تکلیف ہوتی ہے، ادھر صوفی عبدالحمید صاحب[1] نے اپنی وسیع کوٹھی میں قیام فرمانے کیلئے بڑے

(۱) صوفی عبدالحمید صاحب چودھری عالم علی خاں صاحب کے فرزند ہیں، تعلیم و تربیت اپنے عم نامدار مولوی سر رحیم بخش صاحب کی نگرانی میں پائی اور انھوں نے اپنے فرزند کی طرح تربیت و شفقت فرمائی، انکی حیات میں ان کے سکریٹری کی طرح رہے تقسیم سے پہلے پنجاب کی سیاسیات میں حصہ لیا، ۱۹۳۷ء تا قیام پاکستان مجلس قانون ساز کے ممبر رہے مجلس دستور ساز متحدہ ہندستان کے بھی ۱۹۴۷ء میں رکن منتخب ہوئے اور تا تقسیم ملک رہے ۱۹۵۰ء میں پہلی مرتبہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۵۳ء تک رہے دوسری مرتبہ ۱۹۵۵ء میں صدارت کیلئے دوبارہ انتخاب ہوا اور نفاذ مارشل لا تک صدر رہے ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے وزیر زراعت و خوراک مقرر ہوئے، دوسری مرتبہ پھر ۱۹۵۵ء میں اسی شعبہ کے وزیر ہوئے مغربی پاکستان کے نئے صوبہ کی تشکیل ہونے اور ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت عظمیٰ تک وزارت زراعت و خوراک پر فائز رہے ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں اپنے والد صاحب کی معیت میں بھاولپور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ رائپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے بڑے بھائی چودھری محمود خاں صاحب مرحوم کے ساتھ نابالغی کی حالت میں حضرتؒ سے بیعت ہو گئے، ۱۹۱۵ء میں رائپور حاضر ہوئے حضرت کا مرض وفات تھا، آٹھ دس روز قیام کیا، آپ

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۸۸ پر)

الحاح اور خلوص و عاجزی سے عرض کیا اور اس کے لئے سخت اصرار کیا، صوفی صاحب کے خاندان اور انکے عم محترم مولوی سر رحیم بخش صاحب مرحوم اور والد ماجد چودھری عالم علی خاں صاحبؒ دونوں سے حضرت کو بہت قدیم اور گہرا تعلق تھا اور ان حضرات کو گنگوہ اور رائپور کے پورے سلسلہ سے عاشقانہ و خادمانہ تعلق تھا، بالخصوص چودھری عالم علی خاں صاحبؒ جج بہاول پور کا تو حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ سے ایسا خصوصی تعلق تھا کہ آپ سے تعلق رکھنے والوں کو ان کے گھر سے کوئی تکلف نہیں ہو سکتا تھا ۱۹۵۱ء کے سفر پاکستان میں آپ نے ان کی درخواست منظور فرمائی اور ان کی کوٹھی ۳۲ بی واقع گلبرگ روڈ لاہور میں قیام کرنا قبول فرمالیا، اس وقت سے (۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۷ء تک مستقل، اور ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک وقتاً فوقتاً) زمانہ قیام پاکستان میں صوفی صاحب کی کوٹھی پر قیام ہوتا رہا، اس میں حکومت کی تبدیلیوں، صوفی صاحب کے وزارت میں ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا تھا جس بناپر اس جگہ کا انتخاب ہوا تھا اور صوفی صاحب کو یہ دولت ملی تھی اس کا وزارت و حکومت اور عزت و وجاہت سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ان عارضی تبدیلیوں سے صوفی صاحب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۷) دفعہ حضرت نے دوبارہ بحالت بلوغ بیعت فرمایا، رحلت فرمانے کے وقت تک چار پانچ مرتبہ رائپور حاضری ہوئی، حضرتؒ کی وفات کے بعد حضرت شیخ الحدیث کی ہدایت اور توجہ دہانی پر ۱۹۴۴ء سے حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ سے تعلق کی تجدید کی اور رائپور حاضر ہوتے رہے، پھر یہ تعلق اتنا بڑھا کہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۷ء تک انھیں کی کوٹھی حضرت کی فرودگاہ اور پاکستان کے قیام کے دوران میں مستقل مستقر قرار پائی، پاکستان کے سفر کے سلسلہ میں صوفی صاحب ہی کی درخواست و اصرار قوی محرک ثابت ہوتی تھی۔

تقسیم سے پہلے بھی ریاست بہاول پور میں ریاست وزیر تھی، ضلع بہاول نگر میں بٹہ عالمگیر جو ان کے والد صاحب کا آباد کیا ہوا ہے ان کی ملکیت میں تھا۔

کی نیازمندی اور حضرت کی شفقت و اعتماد میں فرق آتا تھا۔

صوفی صاحب کی کوٹھی پر (اور جہاں بھی ہندستان و پاکستان میں قیام رہتا) نظام الاوقات اور معمولات میں کوئی فرق نہ آتا، وہی صبح کی (جب تک صحت و قوت رہی) ہوا خوری، وہی کھانے اور سونے کے اوقات، وہی ظہر کے بعد کا تخلیہ اور عصر کے بعد کی مجلس اور کتابوں کی خواندگی، وہی طالبین و اہل ذکر کا مجمع اور ذکر کی سرگرمی، معلوم ہوتا کہ رائے پور کی خانقاہ اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ منتقل ہو گئی ہے۔

یہ کوٹھی کثیر التعداد اور وسیع کمروں، ایوانوں، ڈرائنگ روم اور متعدد غسل خانوں پر مشتمل ہے جس میں بیک وقت سو ڈیڑھ سو آدمی گزارا کر سکتے ہیں، کوٹھی کے ساتھ وسیع میدان چمن اور سبزہ ہے، ایک ایک وقت میں سو سو مہمان ہوتے، صوفی صاحب کے متعلقین اوپر کی منزل میں منتقل ہو جاتے، وہ خود نیچے کی منزل میں ایک چھوٹے کمرہ پر قناعت کرتے، اور پوری کوٹھی آنے والے مہمانوں اور اللہ اللہ کرنے والے دوستوں کے حوالہ کر دیتے، جو درویشانہ و متوکلانہ جہاں جگہ پاتے پڑ جاتے، نمازوں کے وقت کمروں کے حدود ختم ہو کر دور دور تک صفیں ہوتیں اور مکبّر مقرر ہوتے، گرمیوں میں باہر وسیع سبزہ پر اور سردیوں میں اندر زیر سقف مجلس ہوتی، شام کی مجلس میں شہر کے متعدد اہل علم و صلاح اور بعض مرتبہ مشاہیر و عمائد شہر بھی ہوتے، لاہور کے علماء و مشائخ و مشاہیر میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری (رحمۃ اللہ علیہ) اکثر صبح کے وقت اور بعض مرتبہ شام کی مجلس میں بڑے اہتمام سے تشریف لاتے، مؤدب اور دو زانو خاموش مراقب بیٹھ جاتے، اگر حضرت کچھ سوال کرتے تو خاموشی اور نہایت اختصار سے جواب دیتے ورنہ بالکل خاموش رہتے، مولانا کے علاوہ سلسلۂ دیوبند کے دوسرے متعدد علماء و اساتذہ آتے رہتے، بعض اوقات لاہور اور پنجاب کے اتنے

اہل علم، اعلیٰ عہدہ دار، سیاسی رہنما اور قومی کارکن جمع ہو جاتے جن کا ایک جگہ کسی دوسرے مقام پر بیک وقت جمع ہو جانا مشکل سمجھا جاتا ہے، ان میں بڑی تعداد احراری علماء اور رہنماؤں کی ہوتی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بھی تشریف لایا کرتے اور ہفتوں قیام فرماتے اور مجلس میں بلبل کی طرح چہکتے، ان کی موجودگی اور شیریں نوائی سے لطف صحبت دوبالا ہو جاتا حضرت کی بشاشت و شگفتگی بھی ان کی موجودگی سے بہت بڑھ جاتی،

ڈھڈیاں ۱۹۵۴ء تک تقریباً ہر سفر پاکستان میں ڈھڈیاں کا سفر بھی ہوتا، آپ کی تشریف بری سے یہ دور افتادہ گاؤں کچھ دنوں کیلئے آباد و پر رونق اور علماء و صلحاء کا مرکز و مرجع بن جاتا اور جنگل میں منگل کا منظر نظر آنے لگتا۔

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

اور یہ تو آپ کا وطن تھا، محبت کرنے والے بھائی اور سعادت مند بھتیجے بھانجے بھانوں کی خدمت کو سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے، ڈھڈیاں جاتے وقت اکثر سرگودھا میں مولانا عبدالعزیز صاحب گنتھلوی کے مکان پر قیام ہوتا اور اکثر کئی کئی روز قیام رہتا، حضرت کا نظام الاوقات وہی رہتا، صبح کی نماز سے پہلے چائے، نماز کے بعد سیر، عموماً گاؤں سے جانب شمال دریا کی طرف واپسی پر تخلیہ کبھی باہر بیٹھ جاتے، دس بجے کھانا (ٹھیک اس جگہ پر جہاں اب مزار ہے) پھر کچھ دیر بیٹھنا، پھر آرام، ظہر کی نماز کے بعد مسلسل تخلیہ، عصر سے کچھ دیر پہلے تک، عصر کے بعد عمومی مجلس، ساٹھ ستر مہمان وہاں بھی رہتے اور صاحبزادگان بڑی مسرت و فراخ دلی سے میزبانی اور مہمانوں کی راحت رسانی کا انتظام کرتے، یہاں کے قیام میں حضرت کو بڑا انبساط اور بشاشت رہتی۔

پاکستان کے رمضان اسی زمانۂ قیام میں رمضان بھی پڑ جاتے، پاکستان کے خدام و مخلصین کی کوشش و تمنا ہوتی کہ رمضان یہیں گزریں تاکہ رمضان کی رونق و برکت دوبالا ہو، رمضان گرمیوں میں پڑ رہے تھے ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۲ء) میں کوہ مری میں صوفی عبد الحمید کی کوٹھی پر رمضان ہوا، مولوی عبد المنان صاحب دہلوی نے قرآن مجید سنایا ۱۳۷۳ھ (۱۹۵۴ء) میں جناب محمد شفیع قریشی صاحب اور ملک محمد دین صاحب کی مخلصانہ دعوت و درخواست پر گھوڑا گلی (کوہ مری) میں رمضان ہوا، سو سے اوپر مہمان تھے، دونوں صاحبوں نے بڑے ذوق و شوق اور اہتمام کے ساتھ رمضان کے مہمانوں کی ضیافت و میزبانی کے فرائض انجام دیے، مولوی سید عطاء المنعم صاحب (فرزند اکبر مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ) نے قرآن مجید سنایا، اگلے سال ۱۳۷۴ھ (۱۹۵۵ء) میں پھر یہیں رمضان ہوا اور مولانا عبد اللہ صاحب رائے پوری[1] نے قرآن مجید سنایا، دوسرے سال ۱۳۷۵ھ (۱۹۵۶ء) میں لائل پور میں رمضان ہوا، مہمانوں کا مجمع دو سو تک پہنچ جاتا تھا مولانا انیس الرحمن صاحب (فرزند مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی مرحوم نے قرآن مجید پڑھا، ۱۳۷۶ھ (۱۹۵۷ء) میں لاہور میں رمضان ہوا، چودھری عبد الحمید صاحب مرحوم (کمشنر بحالیات) نے ضیافت و میزبانی میں خاص حصہ لیا، ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۹ء) میں پھر لائل پور میں رمضان ہوا اور حافظ محمد صدیق صاحب (برادر اصغر مولانا عبد الجلیل صاحب) نے قرآن مجید سنایا، اسکے بعد پھر پاکستان میں رمضان شریف گزارنے کی نوبت نہیں آئی، زندگی کے دونوں آخری رمضان ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۱-۶۲ء) رائپور میں گزرے۔

قیام پاکستان میں دو اضافے پاکستان کے دوران قیام میں دو نئی باتوں کا اضافہ

---

(۱) حال مقیم جامعہ رشیدیہ منٹگمری،

ہو جاتا، ایک تو یہ کہ پاکستان پہونچ کر تحریک قادیانیت کے خطرات اور اس کے دور رس اثرات کا احساس (جو کبھی فراموش و نظر انداز نہیں ہوتا تھا) تازہ ہو جاتا تھا اور طبیعت مبارک پوری قوت وہمت کے ساتھ اس کے مقابلہ، تردید اور ملک کی اس سے حفاظت کی ضرورت کی طرف متوجہ ہو جاتی اور یہ مسئلہ مجالس اور گفتگو کا سب سے بڑا موضوع بن جاتا علماء و زعمائے احرار میں سے (جنکو اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کے مقابلہ کی خصوصی توفیق عطا فرمائی ہے اور حضرت نے انکو اس "جہادِ اکبر" پر خود مامور فرمایا ہے) آجاتے تو ہر گفتگو ختم ہو کر بے اختیار یہی موضوع چھڑ جاتا، خصوصاً مولانا محمد علی جالندھری، مولانا لال حسین اختر اور قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی کی تشریف آوری تو گویا دل کا ساز چھیڑ دیتی اور اس موضوع کے سوا کوئی دوسرا موضوعِ سخن نہ رہتا، ان حضرات کی کارگزاری سے انکی ہمت افزائی اور تحسین فرماتے اور نئی تحقیقات و معلومات دریافت فرماتے، مولانا محمد حیات صاحب (جو قادیانی لٹریچر کے حافظ اور قادیانیت کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہیں) تشریف لاتے تو گویا ردِ قادیانیت کی کتاب کھل جاتی، ہمہ تن گوش اور سراپا ذوق ہو کر ان کی نادر تحقیقات اور زندگی کے تجربات سنتے اور کسی طرح ان کی گفتگو سے سیری نہ ہوتی حضرت کو اسی محفل میں کھِل کھِلا کر ہنستے اور لطف و مسرت کا اظہار کرتے دیکھا گیا، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ وقتاً فوقتاً مجلس کو اپنے لطائف اور قادیانیت پر تبصرہ سے زعفران زار اور باغ و بہار بناتے، حضرت اس میں کوئی مداخلت گوارا نہ فرماتے اور گویا کیفیت یہ ہوتی،

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

تقسیم کے بعد حضرتؒ کے سفر و قیام پاکستان کا بڑا زمانہ سکندر مرزا کے اقتدار اور

پاکستان میں شیعیت کے فروغ وانتشار کا زمانہ تھا پنجاب میں جابجا شیعیت کی تبلیغ اور صحابہ کرامؓ کی توہین کا مشغلہ جاری تھا حکومت کا رویہ اور حکام کی چشم پوشی اور بعض جگہ اہل تشیع کی حمایت اہلسنت کیلئے بڑی شکایت اور رنج کا موجب بن گئی تھی حضرتؒ سے تعلق رکھنے والے متعدد علماء اور احراری رہنما بالعموم حفاظت ناموس صحابہؓ اور شیعیت کے بڑھتے ہوئے اثرات کا مقابلہ کرنے میں مشغول تھے اور انھوں نے جابجا اس کے مرکز اور اس مقصد کیلئے انجمنیں قائم کر رکھی تھیں، حضرت کی آمد کے موقع پر یہ حضرات اکثر تشریف لاتے اور ملک کے یہ افسوسناک حالات سناتے، اور حکام کے تغافل یا شیعیت کی حمایت کی شکایت کرتے، حضرت پر سن شعور سے صحابۂ کرامؓ کی محبت وعظمت کا غلبہ تھا، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ صحابۂ کرامؓ کی وجہ سے ہم مسلمان ہیں، وہی ہمارے مرشد اور ہادی ہیں۔" پاکستان پہنچ کر اور شیعیت کی تبلیغ اور صحابہ کرامؓ کی توہین کے واقعات سن کر آپ پر صحابۂ کرام کی محبت کا جذبہ بہت غالب آجاتا، بالعموم ان دوستوں سے جو خود شاعر تھے یا دوسرے شاعروں کے اشعار خوش الحانی سے پڑھتے تھے، فرمائش کر کے صحابہ کرامؓ کی مدح اور خصوصیت کے ساتھ خلفائے راشدین اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی منقبت میں اشعار سنتے، اس وقت آپ پر محبت کا عجب غلبہ اور عجب محویت وکیفیت طاری ہوتی، ایک زمانہ میں مشکل سے کوئی دن اس سے خالی جاتا، رات کو اکثر سونے سے پیشتر یہ اشعار سنتے، آنکھوں میں آنسو اور چہرہ پر گہرا اثر ہوتا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان اشعار کا سننا درد کی دوا اور روح کی غذا بن گئی ہے اور کسی طرح اس سے سیری اور آسودگی نہیں ہوتی اور زبان حال کہتی ہے

وحدثتنا یا سعد عنھم فزدتنا

شجونا، فزدنا من حدیثک یا سعد

یہ اشعار اکثر پنجابی زبان کے ہوتے، اکثر یہ سعادت محمد شفیع صاحب ملتانی کے حصہ میں آتی جو بڑے دردو سوز اور بڑے ذوق و شوق سے قصائد سناتے، اکمتر صاحب نے اکثر اپنا کلام سنایا اور حضرتؒ نے بڑا لطف لیا، ملفوظات کے مجموعہ میں بار بار ان اشعار کے سننے کا تذکرہ اور یہ غزلیں اور قصائد نقل کئے گئے ہیں اور یہ راقم سطور ان مجلسوں میں حاضر رہا ہے۔

کوٹھی حاجی متین احمد صاحب ۱۹۵۰ء میں حضرت کے ایک دوسرے مخلص خادم حاجی متین احمد صاحب (فرزند اکبر جناب حاجی رشید احمد صاحب میرٹھی مرحوم) تاجر ڈھاکہ کی درخواست پر ان کی کوٹھی واقع ایمپرس روڈ مقابل ریڈیو پاکستان لاہور میں بھی (جو ان کو نئی نئی الاٹ ہوئی تھی اور نہایت وسیع تھی) قیام منظور فرمایا اور ۱۹۵۰ء کے بعد لاہور کے قیام کے دوران میں زیادہ تر اسی کوٹھی میں قیام رہا اور اسی کوٹھی میں زندگی کے آخری دن اور آخری ساعتیں گزریں اور وہیں سے سفر آخرت اختیار فرمایا، ان چار برسوں میں کبھی کبھی کچھ روز کے لئے صوفی صاحب کی خواہش پر ان کی کوٹھی پر چند روز پھر قیام رہا۔

حاجی صاحب کی کوٹھی نسبتاً شہر کے مرکزی حصہ میں واقع ہے اور ہر طرف سے آنے جانے والوں کو سہولت حاصل ہے، مہمانوں کی کثرت کا یہاں بھی وہی حال تھا عموماً حاجی عبدالعزیز صاحب انبالوی (حال مقیم کراچی) کھانے کے منتظم ہوتے تھے، شام کو کوٹھی کے وسیع صحن میں عمومی مجلس ہوتی تھی، مغرب کے بعد بالعموم رفیق احمد خاں صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے خبروں کو ذہن نشین کرنے اور ترتیب کے ساتھ سنانے کا خاص ملکہ عطا فرمایا ہے اور وہ اخبارات کے مطالعہ اور جدید معلومات کی فراہمی کا

خاص اہتمام کرتے تھے، حضرت کو تازہ خبریں اور جدید معلومات سناتے اور حضرت بڑی توجہ سے ان کی باتیں سنتے، دور سے سننے والے کو محسوس ہوتا کہ ریڈیو اردو میں خبریں سنا رہا ہے اور کہیں کا پروگرام لگا دیا گیا ہے،

حضرت کے زمانۂ قیام میں آپ کی کمزوری اور نقل و حرکت سے معذوری کی بنا پر نماز جمعہ بھی بڑی جماعت کے ساتھ قیام گاہ پر ہوتی، یہ خدمت بھی دوسری نمازوں کی طرح آزاد صاحب کے سپرد تھی۔

جب تک قوت تھی کبھی کبھی سلطان فاونڈری جس کے مالک حاجی محمد اسلم صاحب مولوی محمد اکرم صاحب اور محمد افضل صاحب حضرتؒ کے بڑے مخلص خادم ہیں، نیز ان کی کوٹھی واقع ماڈل ٹاؤن تشریف لے جاتے، حضرت ان تینوں صاحبان اور ان کے بھائیوں سے بہت خوش تھے، ان کی سمجھ اور سلیقہ مندی اور اپنے کام میں مستعدی اور کارگزاری سے بہت خوش رہا کرتے تھے، حاجی متین احمد صاحب کی کوٹھی کے زمانۂ قیام میں خصوصاً آخری ایام میں ان حضرات نے حضرتؒ کی راحت و سہولت اور علاج میں بڑی جانفشانی سے کام لیا، آخری ایام میں حضرت نے ایک موقع پر خوش ہو کر فرمایا کہ "تم تینوں بھائیوں نے مجھے نباہ دیا"

چودھری عبد الحمید صاحب مرحوم (۱) بھی بڑے مخلص اور بڑی محبت کرنے والے تھے

(۱) راہوں ضلع جالندھر کے راجپوت زمینداروں اور شرفاء میں تھے، رائے پور والوں سے قرابتیں بھی تھیں ہر صہ تک سرگودھا کے ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی مجسٹریٹ رہے، تحریک ختم نبوت میں باوجود حاکم ضلع ہونے کے علماء کے اکرام میں فرق نہیں آنے دیا، آخر میں کمشنر بحالیات ہو گئے تھے، حضرتؒ سے مخلصانہ و خادمانہ تعلق تھا، رحمہ اللہ،

پاکستان کے سفر کی تحریک کرنے والوں اور رائے پور آکر لے جانے والوں میں پھر لاہور کے زمانۂ قیام میں خدمت اور مصارف کرنے والوں میں ان کا بھی نمایاں حصہ ہوتا تھا، ان کے اچانک انتقال پر حضرت کو بڑا صدمہ ہوا، بعض مرتبہ انہیں کی کار پر رائے پور سے لاہور کا پورا سفر ہوا۔"

لائل پور لائل پور میں حضرت کے بعض ممتاز ترین اہلِ تعلق اور بڑی محبت کرنے والے خادم تھے، یہیں مولانا محمد صاحب انوری مقیم[1] ہیں جو حضرت کے ممتاز مجازین میں ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی (جن سے اور جن کی اولاد سے حضرت کو بڑا گہرا تعلق تھا) کے فرزند مولانا انیس الرحمٰن صاحب کا بھی یہیں قیام ہے، حاجی اسماعیل اور ان کے بھائی محمد ابراہیم صاحب جن کو حضرت سے بڑی محبت اور حضرت کو ان پر بڑی شفقت تھی، لدھیانہ سے لائل پور ہی منتقل ہوئے اور اب یہاں کاروبار کرتے ہیں، ان خدام و محبین کے تعلق اور اصرار سے پاکستان کے اکثر سفروں میں لائل پور کا قیام ضرور ہوتا، اول اول مولانا محمد صاحب انوری کے دولت خانہ واقع سنت پورہ میں قیام ہوا کرتا تھا، اخیر میں خالصہ کالج میں قیام رہنے لگا، جہاں کی وسیع مسجد میں مولانا انیس الرحمٰن صاحب نے تعلیم قرآن کا مدرسہ قائم کیا ہے اور مسجد سے متصل حجرے بنائے ہیں، یہاں حضرت کو بڑا انس اور انبساط رہتا اور کئی مہینے قیام فرماتے، مہمانوں کی تعداد بھی بہت

---

(۱) مولانا محمد صاحب حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز تلامذہ میں ہیں، شہرۂ آفاق مقدمہ بہاولپور میں حضرت شاہ صاحبؒ کے دست راست اور وکیل کی حیثیت سے کام کیا اور بڑی تفصیل سے اس کی روداد مرتب کی جو تقسیم کے حادثہ میں ضائع ہوگئی، پہلے رائے کوٹ (ضلع لدھیانہ مشرقی پنجاب) میں قیام تھا، اب لائل پور محلہ سنت پورہ (جو اب ان کے قیام کی برکت سے سُنّت پورہ ہوگیا ہے) میں مصروف ارشاد و اصلاح ہیں، نفع اللہ بہ،

بڑھ جاتی، ۱۳۷۶ھ و ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۹ء) کا رمضان بھی وہیں گزرا، بڑی رونق اور بڑا مجمع تھا، حضرت نے ایک دوبار ایسے اشارے بھی فرمائے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت یہاں دفن ہونا بھی پسند فرماتے ہیں، ایک بار فرمایا کہ میرا انتقال ہوجائے تو یہاں بچے قرآن شریف پڑھتے ہیں وہیں دفن کردینا، قرآن سنتا رہوں گا۔

آمد و رفت کا منظر پاکستان کا سفر زندگی کے آخری برسوں میں ایک بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا تھا، ہر سال پاکستان کے مخلصین محبین کا ایک وفد آتا جو پاکستان تشریف لے چلنے کے لئے اصرار کرتا، اس وفد کے رکن رکین اکثر صوفی عبدالحمید صاحب ہوتے جن کا حضرت بڑا لحاظ فرماتے تھے، سلطان فاؤنڈری کے مالکان میاں محمد اسلم، مولوی محمد اکرم و محمد افضل صاحب بھی ہوتے، حضرت کی صحت کی کمزوری اور نقل و حرکت کی دشواری کی بنیاد پر ہندستان کے خدام اور رائے پور کے اہل تعلق کو اس سفر میں سخت تامل ہوتا اور کئی دن تک محبت کی کشاکش رہتی، حضرت اپنی طبعی مروت اور احباب و خدام کی دلداری کی بنا پر کسی فریق کو صاف جواب نہ دیتے اور کسی کو مایوس نہ فرماتے لیکن ادا شناس سمجھتے کہ پاکستان میں خدام کی کثیر تعداد کی موجودگی انکے خلوص و گرم جوشی، حلقۂ ذکر کی سرگرمی اور ان غریبوں کی دلداری کی بنا پر جو تقسیم کے بعد سے اپنی محرومی اور دینی مراکز سے دوری پر ہمیشہ ماتم کناں رہتے ہیں، آپ کا رجحان پاکستان جانے کی طرف ہے، بالآخر پاکستانی احباب کا اصرار غالب آتا اور سفر کا فیصلہ ہوجاتا، سفر کا عزم سن کر ضلع سہارنپور اور رائپور کے اطراف و نواح کے عقیدت مند پروانوں کی طرح ہجوم کرتے، آنے والوں کا تانتا بندھ جاتا، بیعت کرنے والے اس کثرت سے جمع ہوجاتے کہ بار بار دستار اور چادر پھیلا کر کثیر مجمع کو توبہ و بیعت کی تلقین کی جاتی، اگر کار پر سفر ہوتا تو اس کا اہتمام کیا جاتا کہ مصافحہ کرنے والوں کی کثرت اور عقیدت مندوں کے ہجوم سے حضرت کو اذیت نہ ہو،

کار کے سفر میں اکثر لدھیانہ مولوی سعید الرحمٰن صاحب (فرزند مولانا حبیب الرحمٰن صاحب) کے یہاں ایک شب یا کچھ وقت ٹھہر کر جانا ہوتا، کاروں کا ایک چھوٹا سا کارواں ہوتا جس میں صوفی صاحب، چودھری عبدالحمید صاحب مرحوم اور محمد افضل صاحب وغیرہ کی کاریں ہوتیں ریل سے سفر ہوتا تو فرسٹ کلاس کے کئی کمپارٹمنٹ ریزرو کرا لئے جاتے، جنرل شاہ نواز (ڈپٹی منسٹر ریلوے) کی طرف سے سہارنپور اور امرت سر کے اسٹیشنوں پر سہولت بہم پہنچانے کے لئے ہدایات جاری ہو جاتیں، سہارنپور کے اسٹیشن پر رخصت کرنے والوں کا اتنا کثیر مجمع ہوتا کہ حضرت شیخ الحدیث کو بار بار اس کو نظم و ضبط میں رکھنے اور حضرت کو سکون کے ساتھ سوار ہو جانے کیلئے مجمع کو بار بار ہدایات دینے اور زجر و تنبیہ فرمانے کی ضرورت پیش آتی، لاہور کے اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں کا اتنا عظیم مجمع ہوتا جو کسی بڑی سیاسی شخصیت کی آمد کے موقع پر نہیں ہوتا، ریلوے حکام وہاں بھی سہولت مہیا کرتے، اس دورِ آخر میں آپ کی محبوبیت اور عوام کی عقیدت کے مناظر نے اس دور کی یاد تازہ کر دی، جب سارا شہر ایک عالم ربانی کے لئے نکل پڑتا تھا اور خلیفۂ وقت بھی محوِ حیرت رہ جاتا تھا[1] اور ثابت کر دیا کہ دین اور خلوص میں اب بھی وہ کشش ہے جو کسی دنیاوی وجاہت میں نہیں،

شہانِ بے کلہ و خسروانِ بے کمر اند

(۱) حضرت عبداللہ بن مبارک کے استقبال و اعزاز کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

گیارہواں باب (۱۱)

علالت، پاکستان کا آخری سفر، اور سفر آخرت

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے
(میر تقی میرؔ)

علالت کا سلسلہ حضرتؒ کو وفات سے کئی سال پہلے سے فشار الدم (ہائی بلڈ پریشر) کی شکایت تھی لیکن اس کا پورا احساس اور اندازہ نہیں ہو سکا تھا، ۱۶ ارشوال ۱۳۷۴ھ (۸ رجون ۱۹۵۵ء چہارشنبہ) کو جب آپ منصوری پر شاہ محمد مسعود صاحب کی کوٹھی پر تھے پہلا دورہ پڑا، اس روز آپ نے مچھلی تناول فرمائی تھی، شام کو سانس لینے میں تکلیف اور تنگی کا احساس ہوا، تکلیف بہت بڑھ گئی تو ایک مقامی ڈاکٹر گوئل کو بلایا گیا، اس نے THROM BOSIS CORONONJ تجویز کیا، علاج سے افاقہ ہوا اور چند روز کے بعد مخلصین کے اصرار سے آپ پہاڑ پر سے تشریف لے آئے اور کھلی ہوئی تازہ آب وہوا کے خیال سے بہٹ کے قریب شاہ محمد مسعود صاحب کی گانگرو دالی کوٹھی میں جو نہر پر واقع ہے قیام فرمایا، ۱۰ رجولائی کو رات کے تین بجے شدید دورہ پڑا، وہ صبح تک رہا، خدام اور تیمارداروں کو مایوسی سی ہو گئی، حکیم عبدالرشید صاحب بریلوی جو وہاں موجود تھے یٰسین پڑھنے لگے، فجر کی نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا کہ حضرت نے ہاتھ اٹھا کر نماز پڑھنے کے لئے اشارہ فرمایا، پھر افاقہ ہو گیا،

۱۷ر جولائی کو آپ سہارنپور تشریف لے آئے اور مدرسہ مظاہر العلوم کے مہمان خانہ میں قیام اختیار فرمایا، جس کا کرایہ تیس۳۰ روپے ماہوار کے حساب سے مدت قیام میں ادا فرماتے رہے، یہ اس طویل علالت کا آغاز تھا جس کا اختتام ۱۴ر ربیع الاول ۱۳۸۲ھ چہار شنبہ (۱۶ر اگست ۱۹۶۲ء) کو وفات پر ہوا،

ڈاکٹر برکت علی مرحوم

۱۹۵۳ء میں جب آپ منصوری سے واپسی پر بارش سے بھیگ گئے[1] اور بعد مغرب رعشہ کا حملہ ہوا تو پہلی مرتبہ شہر سہارنپور کے تجربہ کار و حاذق معالج ڈاکٹر برکت علی صاحب دیکھنے آئے، اس وقت سے اپنی وفات تک[2] ڈاکٹر صاحب ہی معالج رہے انھوں نے جس دل سوزی، خلوص، فکر اور محنت سے علاج کیا اسکی نظیر اس زمانہ میں ملنی مشکل ہے، وہ حضرتؒ کے پورے مزاج شناس ہو گئے تھے، ان کی اجازت کے بغیر کوئی سفر نہیں ہوتا تھا نہ کسی دوا کا استعمال۔ پاکستان کے قیام میں بھی وقتاً فوقتاً ان سے مشورہ کیا جاتا رہتا اور ان کو حالات سے مطلع رکھا جاتا، پورے دس برس ڈاکٹر صاحب دوا و غذا کے نگراں اور معالج و مشیر طبی رہے، ان کی اس مخلصانہ و بے عذر خدمت، گہرے قلبی تعلق اور حذاقت کی بنا پر حضرتؒ کو ان سے بڑا قلبی تعلق ہو گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب کو بھی حضرتؒ کی ذات سے بڑی گرویدگی اور عقیدت پیدا ہو گئی تھی،

حضرتؒ کی اصل علالت فشار الدم اور تھرمبوسس کی شکایت تھی، جسم کی فربہی اور فالج کے اثر نے نقل و حرکت سے بالکل معذور بنا دیا تھا، تقریباً ۱۹۵۵ء سے ہاتھوں

---

(۱) دہرہ دون اور سہارنپور کے درمیان اچانک بارش آگئی، کار پر صرف ہڈ تھا، کھڑکیاں نہیں تھیں، ناچیز راقم سطور بھی ہم سفر اور ہم رکاب تھا۔ (۲) ۸ر شعبان ۱۳۸۰ھ پنجشنبہ (۲۶ر جنوری ۱۹۶۱ء) کو ڈاکٹر برکت علی صاحب کا انتقال ہوا۔

اور پاؤں کو جنبش دینا بھی بڑا مشکل تھا، لیکن اس سب کے ساتھ چہرہ دمکتا ہوا، دماغ نہ صرف محفوظ بلکہ حاضر، قلب نہ صرف بیدار بلکہ قوی اور مصروف افاضہ وافادہ، اگر کوئی حضرتؒ کو تکیوں کے سہارے سے بیٹھا ہوا دیکھتا تو سمجھتا کہ ایک شیخ وقت مسند ارشاد پر متمکن ہے اور سن رسیدگی کے تقاضائے طبعی کے علاوہ اس میں کوئی ضعف اور معذوری نہیں۔

بے نظیر خدمت اس معذوری کے ساتھ کہ ہاتھ کا ہلانا اور بدن کا کھجانا بھی مشکل تھا اللہ تعالیٰ نے حضرت کے لئے ایسی خدمت و نگہداشت کا انتظام فرمایا اور ایسے مخلص، جاں نثار، ہر وقت کے حاضر باش، مزاج داں و مزاج شناس خادم میسر فرما دیے جو شاید اس زمانہ میں کسی بڑے سے بڑے رئیس اور امیر کو نصیب نہ ہوئے ہوں امراء کو خدام کی بڑی سے بڑی تعداد حاصل ہو سکتی ہے لیکن وہ اس عقیدت و محبت اور دل سوزی و خلوص کو کہاں سے لا سکتے ہیں جو خدا کے مقبول بندوں کے ان مخلص خدام کے پاس ہوتا ہے جو اس خدمت کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت و ذریعہ نجات تصور کرتے ہیں، ان خدام میں مولانا عبدالمنان صاحب، راؤ الطاف الرحمٰن[1]، صوفی برکت اور حافظ عبدالرشید خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو ہر وقت اٹھاتے بٹھاتے اور چارپائی کے قریب ہی رہتے، پانچوں وقت وضو کرانا، تمام اعضاء کو پانی پہنچانا (حضرت خود ہاتھ کو حرکت نہیں دے سکتے تھے) باہر لانا لے جانا یہ سب ان حضرات کا کام تھا اور جو ان کے ساتھ شامل ہو جائے، متفرق خدمات گرمیوں میں پنکھا جھلنے کیلئے ہر شخص سعادت سمجھ کر تیار رہتا

(۱) راؤ الطاف الرحمٰن خاں حضرت کے قدیم ترین مخلص وہمہ وقت خدام میں ہیں، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ سے قرابت کا تعلق بھی ہے بچپن سے حضرت کی خدمت میں ہیں، مہمانوں کے لیٹنے اور بستر وغیرہ کا انتظام ہمیشہ سے انکے ذمہ ہے

ان خدام میں قاری محمد شبیر صاحب لکھنوی خاص طور پر بڑے مستعد و جفاکش تھے۔

مولانا عبدالمنان صاحب کو دواؤں کا استعمال کراتے کراتے ایسا تجربہ اور حضرت کے مزاج کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک اچھے تیماردار اور چھوٹے موٹے معالج بن گئے تھے۔

دوسرے معالج پاکستان کے قیام کے دوران میں ڈاکٹر محمد عالم صاحب (استاد میڈیکل کالج لاہور) جو حضرت سے بیعت و محبت کا تعلق رکھتے تھے اور حضرت کی بھی ان پر بڑی شفقت تھی، دوا علاج کے نگراں و مہتمم بن جاتے، کسی پیچیدگی اور مرض کی شدت کی حالت میں مختلف اوقات میں کرنل ضیاء اللہ، ڈاکٹر پیرزادہ سے مشورہ لیا جاتا مرض وفات میں ڈاکٹر محمد اختر، ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر پیرزادہ وغیرہ شریک علاج رہے۔

ڈاکٹر برکت علی صاحب ہی کے مشورہ و اصرار سے اس بنا پر کہ رائے پور بروقت طبی امداد کا پہونچنا بہت مشکل، ایک مرتبہ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۷۸ھ سے ۲ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ (۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء) تک ایک سال، اور دوسری مرتبہ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ سے ۲۹ شعبان ۱۳۸۰ھ (۱۶ اکتوبر ۱۹۶۰ء سے ۱۶ فروری ۱۹۶۱ء) تک پانچ مہینے بہٹ ہاؤس[1] میں قیام رہا اور ڈاکٹر برکت علی صاحب ہی کا علاج رہا، کوئی خاص شکایت یا دورہ نہیں پڑا، صرف احتیاط اور دوا و غذا کے نظام کا اہتمام رکھا جاتا تھا، کسی

(۱) بہٹ ہاؤس شاہ محمد مسعود صاحب رئیس بہٹ کے اس مکان کا نام ہے جس کو انکے والد شاہ زاہد حسن صاحب مرحوم نے حضرتؒ ہی کے قیام سہارنپور کی نیت سے بڑی عالی حوصلگی اور اہتمام سے بنوایا تھا، نہایت وسیع آرام دہ اور مستحکم عمارت ہے جس میں بیک وقت کئی خاندان رہ سکتے ہیں، پل نہران کے قریب واقع ہے، آخری برسوں میں حضرت نے مہینوں اس کوٹھی میں قیام فرمایا، اور آپ کے خدام کی کثیر التعداد جماعت اور مہمانوں کی بڑی تعداد اسی میں مقیم رہتی تھی۔

وقت کوئی وقتی تکلیف پیدا ہو جاتی تو اس کا تدارک کر دیا جاتا، ۲۶ جنوری ۱۹۶۱ء کو اچانک شب میں ڈاکٹر برکت علی صاحب کا انتقال ہو گیا، جب اس طبیب حاذق اور شفیق معالج کا جنازہ حضرت کے سامنے لایا گیا جو ان کے دائمی مریض اور ان کی دل سوزی و خلوص کے بڑے معترف و قدردان تھے تو عجیب عبرت ناک منظر تھا حضرت شیخ الحدیث نے نماز پڑھائی اور حضرت نے بادیدۂ نم شرکت فرمائی، لله ما اخذ ولله ما اعطی وکل شئی عندہ باجل مسمی،

ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد اب بہٹ ہاؤس کا قیام کچھ ضروری نہ تھا، رائپور کے خدام اور اہل تعلق نے چمن کو گلزار رحیمی[1] میں فصل خزاں کا دور دورہ دیکھنا شاق تھا، رائے پور لے چلنے کیلئے اصرار کیا اور آپ نے منظور فرمالیا۔

رائے پور کا آخری قیام

فروری ہی میں رائے پور تشریف لے آئے اور وہاں کے خزاں رسیدہ چمن میں بہار آئی، اس مرتبہ قیام حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی قدیم قیام گاہ میں تجویز ہوا جس کو کوٹھی کے نام سے یاد کرتے ہیں، چونکہ وہ مدرسہ کی ملکیت اور وقف ہے، حضرت نے اس کا کرایہ تشخیص کروایا اور دس روپیہ ماہوار کرایہ پر قیام منظور فرمایا، کوٹھی کے آس پاس چھپر ڈال دیئے گئے، حضرت کی بیرونی نشست کیلئے پھونس کی ایک بڑی چھت ڈال دی گئی اور ضروری انتظامات مکمل ہو گئے۔

چند دن کے بعد ماہ مبارک آگیا اور رونق دوبالا ہو گئی، مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی نے مسجد میں قرآن سنایا، مہمانوں کا خاصہ مجمع ہو گیا، آخر رمضان میں حضرت شیخ الحدیث بھی تشریف لے آئے، اس رمضان کے بعد سے اگلے رمضان (۱۳۸۱ھ) تک

---

(۱) رائے پور کی خانقاہ گلزار رحیمی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ڈاک کے پتہ میں بھی یہی لکھتے ہیں۔

رائے پور ہی میں قیام رہا۔

آخری رمضان اور آخری سفر پاکستان

رمضان ۱۳۸۱ھ (فروری ۱۹۶۲ء) رائے پور میں ہوا، اس سے پہلے حضرت کے شدید اصرار پر شیخ کا یہ معمول ہو گیا تھا، کہ جمعہ کی نماز پڑھ کر رائے پور تشریف لے جاتے، دوشنبہ کو واپسی ہوتی، رمضان میں چونکہ ہر ہفتہ آنا جانا مشکل تھا اس لئے یہ قرار پایا کہ نصف رمضان یہاں ہو، نصف رمضان رائے پور میں، ۱۷ر رمضان ۱۳۸۱ھ کو حضرت شیخ الحدیث رائے پور تشریف لے آئے، قرآن مجید مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی کے فرزند مولوی حافظ فضل الرحمن نے سنایا، مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی بھی رمضان سے پہلے سے تشریف لے آئے تھے، شاید کسی کو اس کا احساس ہو کہ یہ حضرت کا آخری رمضان ہے اور اب نہ صرف رائے پور سے بلکہ اس عالم فانی سے کوچ کے دن قریب آ گئے ہیں۔

عصر سے لے کر مغرب سے کچھ پیشتر تک کتاب پڑھنے کا سلسلہ جاری تھا حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات (مطبوعہ الفرقان) ہو رہے تھے، مہمانوں کا ہجوم تھا، مجمع برابر بڑھ رہا تھا عید کی نماز حضرت نے مسجد میں آزاد صاحب کی اقتداء میں ادا فرمائی، نماز کے بعد جب حضرت کو کرسی پر بٹھا کر شیخ کے مزار پر لے گئے تو عجب منظر تھا، زبان حال کہہ رہی تھی

انتم لنا سلف ونحن لکم خلف وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون ۰

مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب کے خانقاہ میں قیام کا فیصلہ

حضرتؒ کو ہمیشہ سے یہ فکر تھی کہ خانقاہ اور مدرسہ کا سلسلہ میرے بعد بھی جاری رہے، اس کیلئے کئی بار مشورے بھی ہوئے اور مختلف تجویزیں مختلف اوقات میں سامنے بھی آئیں لیکن کوئی تجویز اطمینان بخش طریقہ پر نہیں چل سکی، اسی سلسلہ میں آخری رمضان سے پیشتر

مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب کو پاکستان سے بلایا گیا، مولانا اوپر کی منزل میں تشریف رکھتے تھے اور حسب معمول رمضان کے اشغال میں عالی ہمتی سے مشغول تھے، رائے پور کی اس خانقاہ کو آباد رکھنے کے لئے کسی موزوں شخصیت کے انتخاب و تعین کی ضرورت تھی، مولانا عبدالعزیز صاحب[1] حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ کے حقیقی نواسہ اور اسی خاندان والاشان کے چشم و چراغ ہیں، عالم صالح متشرع اور ذاکر شاغل ہیں حضرت ہی سے بیعت و اجازت ہے اور حضرت ہی کے دامن عاطفت میں تربیت پائی ہے اہل رائے پور اور قرب و جوار کے مسلمان ان سے خوب واقف و مانوس بھی ہیں اور وہ اپنے خاندانی تعلق، قرابت قریبہ اور وجاہت سے اس شیرازہ کو مجتمع و مربوط رکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں حضرتؒ نے ان کو رائے پور میں قیام کے لئے تجویز فرمایا اور رمضان کے بعد شوال (۱۳۸۲ھ) کا پہلا ہفتہ تھا، غالباً ۵۔ ۶ شوال کی تاریخ تھی، حضرتؒ کے ارشاد سے حضرت شیخ الحدیث نے جو تشریف رکھتے تھے متعلقین خانقاہ کے ایک مجمع میں اعلان فرمایا

(۱) مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب چودھری تصدق حسین خاں صاحب رئیس گمتھلہ کے صاحبزادے اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے حقیقی نواسہ ہیں ۱۹۰۵ء میں ولادت ہوئی حضرت ہی کی حیات میں قرآن شریف حفظ کر لیا تھا اور محراب بھی رائے پور میں سنا دی تھی، اول سے آخر تک مدرسہ مظاہر العلوم میں تعلیم پائی اور ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۴ء) میں دورہ حدیث میں شریک ہوئے، حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کی توجہ خصوصی اور تربیت میں ذکر و سلوک کے منازل طے کئے اور اجازت پائی، ۱۹۴۷ء کے پرآشوب زمانہ میں ہمت و عزیمت کے ساتھ مشرقی پنجاب میں حالات کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں کی تقویت کا ذریعہ بنے، پھر جب اس علاقہ کا سرکاری طور پر انخلا ہوا تو اپنے پورے قافلے کے ساتھ عزت و حرمت کے ساتھ پاکستان تشریف لے گئے اور شہر سرگودھا میں اقامت اختیار کی، أطال اللہ بقاءہ و نفع بہ۔

کہ "حضرت نے حافظ صاحب کو یہاں قیام کے لئے تجویز فرمایا ہے اور حافظ صاحب نے اس کو قبول بھی فرمالیا ہے، اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے، ہمیں تو بڑا فکر ہو رہا تھا کہ یہاں یہ سلسلہ ختم ہو ہو جائیگا، اللہ کا شکر ہے اور امید ہے کہ یہ جگہ آباد اور یہ سلسلہ قائم رہے گا۔"(۱)

پاکستان کے سفر کی اطلاع اور آنے والوں کا ہجوم

پورا سال پاکستان کے سفر سے خالی گیا تھا، وہاں کے اہل تعلق دید کے مشتاق اور زیارت و صحبت کیلئے بے چین و مضطرب تھے، سفر کے لئے سلسلہ جنبانی عرصہ سے ہو رہی تھی، مولانا عبدالجلیل صاحب و مولانا عبدالوحید صاحب اس مقصد کیلئے رمضان ہی سے مقیم تھے، ادھر سفر پاکستان کا ایک نیا محرک و داعیہ پیدا ہو گیا حضرت کے حقیقی چھوٹے بھائی حافظ محمد خلیل صاحب (والد مولانا عبدالجلیل صاحب) عرصہ سے علیل تھے، تپ محرقہ کا شبہ تھا اور علالت کے امتداد سے بہت ضعف ہو گیا تھا اور خود حافظ صاحب زندگی سے مایوس سے تھے، انھوں نے یہ آرزو ظاہر کی کہ میں تو سفر کے قابل نہیں ہوں اگر حضرت تشریف لے آئیں تو اور خدام کی بھی آرزو بر آئے گی اور میں بھی زیارت کرلوں گا، حضرت کا اصول عام مخلصین کے بارے میں ہمیشہ یہ رہا کہ :-

دل بدست آور کہ حج اکبر است

اور یہ تو حقیقی تنہا بھائی کی تمنا تھی، حضرت کی طبیعت میں پاکستان کے سفر کا تقاضا پیدا ہو گیا، رمضان سے پہلے ہی قرب و جوار میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ حضرت رمضان کے بعد پاکستان تشریف لے جائیں گے اور اسی وجہ سے رمضان میں آنے والوں کا ہجوم رہا، رمضان بعد تو عقیدت مند چاروں طرف سے پروانوں کی طرح امنڈ آئے، ہزاروں آدمیوں کو خیال

(۱) عبارت بلفظہا روایت حضرت شیخ الحدیث مدظلہ

تھا کہ حضرت اس عمر میں اور ضعف میں پاکستان تشریف لے جا رہے ہیں تو معلوم نہیں دوبارہ دیدار پھر نصیب ہوتی ہے یا نہیں؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اطراف و نواح اور دور و نزدیک کوئی شخص پکار آیا ہے کہ حضرت تشریف لے جا رہے ہیں جس کو زیارت کرنی ہو اور بیعت کا شرف حاصل کرنا ہو وہ جلدی کرے ورنہ ساری عمر حسرت رہ جائے گی، لوگ جوق در جوق اور فوج در فوج آ رہے تھے، آنے والوں کا ایک سیلاب تھا جو ختم ہونے کو نہیں آتا تھا پہلے تو دستاروں اور چادروں کو تھام کر لوگ بیعت و توبہ کے الفاظ ادا کرتے اور داخل سلسلہ ہوتے، پھر کثرت ہجوم سے یہ بھی ممکن نہیں رہا، مجمع بٹھا دیا جاتا، الفاظ کہلوانے والے اور آواز پہونچانے والے جمعہ و عیدین کے مکبرین کی طرح جا بجا کھڑے ہو جاتے اور توبہ کے الفاظ کہلواتے اور مجمع کا مجمع بیعت سے مشرف ہو جاتا، ایک خادم لکھتے ہیں:۔

"اطراف کے لوگوں، عورتوں اور مردوں کا بے شمار مجمع ہونے لگا، صبح سے جو شروع ہوتا تو شام کو ختم ہوتا، ہر روز دوسرے روز سے زیادہ مجمع ہوتا، جو حضرت کی زیارت کے لئے بے تاب نظر آتا، حضرتؒ کی عجب شان نظر آتی، مسکراتے ہوئے کبھی باہر آ رہے ہیں کبھی اندر، سیکڑوں بندگانِ خدا ایک ساتھ بیعت ہوتے، جہاں تک قابو کا مجمع ہوتا سروں سے لوگ صافے اتار کر دیدیتے اور وہ دُور دور تک جال کے مانند پھیل جاتے، بیعت کے وقت لوگ پکڑ لیتے اور جب مجمع قابو سے باہر ہوتا تو عورتیں ایک طرف، مرد ایک طرف بٹھا دیئے جاتے، خدا کی زمین چادر ہوتی اور صرف زبانی بیعت کے الفاظ کہلائے جاتے دو دو چار چار کبھی پانچ پانچ چھ چھ مکبر کی طرح بیعت کے الفاظ چلا چلا کر کہلانے والے ہوتے تھے کبھی کبھی مجھ سیاہ کار کو بھی یہ شرف حاصل ہوا، خدا کی قسم

بعض وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی بجلی تھی جو کوند گئی، دل لرز جاتا کیفیت کچھ اور ہو جاتی، حافظ عبدالرشید صاحب عموماً بیعت کراتے تھے اگرچہ حسب ضرورت مکبر ہوتے تھے مگر ان کا گلا صبح سے شام تک بیٹھ جاتا تھا،

بیعت کے بعد لوگوں کے دلوں میں حضرت کی زیارت کی خواہش اور شوق اس قدر موجزن ہوتا، کہ اہل خانقاہ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا، اہل اشتیاق کا جم غفیر جب حرکت میں آتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ برسات کے موسم میں کسی شمع پر پروانوں کا ہجوم ہے، مجمع اتنا ہوتا کہ آپ کے چہرۂ مبارک پر سب کی نظر پڑنی مشکل تھی، جو بیچارے رہ جاتے تھے اور حضرت کی چارپائی اندر چلی جاتی تھی تو بے تاب دوسرے وقت کے انتظار میں بیٹھے رہتے، پھر تھوڑی دیر کے بعد چارپائی باہر لائی جاتی اور زیارت کا شرف حاصل کرنے والے اپنی آرزو پوری کرتے۔

شروع شوال سے وسط شوال تک آنے والوں کا یہ سیلاب جاری رہا، خانقاہ آنے والے ہر راستہ اور ہر سڑک پر، مشرق، مغرب، شمال، جنوب ہر طرف سے آنے والوں کا ہجوم تھا، ان میں اچھی خاصی تعداد ہندو عورتوں اور مردوں کی بھی ہوتی تھی، وہ بھی سب کے ساتھ کلمہ پڑھتے تھے، غالباً حضرتؒ کی اجازت سے حافظ عبدالرشید صاحب آخر کو یوں کہہ دیتے تھے کہ ہم نے سب ہندو بھائیوں بہنوں کا سلام حضرت سے کہہ دیا اور دعا کے لئے بھی عرض کر دیا، سب لوگ جب بیعت ہوتے تھے تو وہ لوگ بھی اسی عقیدت و محبت کے ساتھ سب کے ساتھ ہوتے تھے اور شوق زیارت میں وہ بھی بے چین نظر آتے تھے، میں نے

ایک ہندو عورت کو دیکھا کہ جب اسکی نظر حضرت کے چہرہ پر پڑی تو وہ فرط محبت میں رو پڑی۔

حضرت کے پاکستان جانے والی تاریخ سے ایک روز قبل جمعہ کے دن تو اس قدر آمد شروع ہوئی کہ ہر دن سے بڑھ گئی(۱) اس قدر مجمع جمع ہوگیا کہ حضرت کی چارپائی خانقاہ اور مدرسہ کے درمیان میدان میں لائی گئی، سارا مجمع بے تاب زیارت نظر آتا تھا، پانچ چھ سے اوپر مکبر بیعت کے الفاظ چلا چلا کر کہہ رہے تھے، جمعہ کی نماز میں ساری خانقاہ، باغ، کھیت وغیرہ بھرے نظر آ رہے تھے، جمعہ کے بعد سارا مجمع اکٹھا ہوا اور مسجد والے بھی آنے لگے تو خانقاہ کی حد تک جدھر نظر اٹھاؤ آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، حضرت کی چارپائی باہر لائی گئی اور ذکر کرنے والوں کے چھپر سے ملا کر رکھی گئی، جتنے مکبروں کی ضرورت تھی وہ مقرر ہو گئے اور سارا مجمع بیعت ہوا، جب مجمع زیارت کے لئے حرکت میں آیا تو چند آدمیوں نے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چارپائی کے گرد مضبوط حلقہ قائم کر لیا، الحمدللہ کر کے سارا مجمع بیعت سے فارغ ہوا

سفر کا التوا ڈاکٹروں کے حکم سے حضرت کی چارپائی اندر چلی گئی اور معلوم ہوا کہ مجمع کی زیادتی کے سبب سے بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے، دفعتاً اعلان ہوا کہ آپ سب لوگ اپنے اپنے گھر واپس جائیں، حضرت اب سفر نہ فرمائیں گے، سفر ملتوی ہوگیا ہے، اب اطمینان سے آتے رہنا، معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے اس حال میں سفر کرنے کا مشورہ نہیں دیا، لوگ اعلان کرتے رہے، مولانا محمد منظور

(۱) مولانا محمد منظور صاحب نعمانی فرماتے ہیں کہ انھیں دنوں میں نے ایک روز صرف بیل گاڑیاں شمار کیں تو تقریباً سو زائد تھیں

صاحب نعمانی نے بھی اعلان کیا مگر سب مجمع منتشر نہ ہوا، مغرب بعد اندھیرے
تک حضرتؒ کے کمرہ کی جالی سے زیارت کرتے رہے، پاکستانی احباب کے علاوہ
سارے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دے
رہے تھے۔(۱)

دوبارہ پاکستان کا قصد حضرت کے سفر کے التوا کی خبر مشہور ہو گئی اور ہندستان کے اہل تعلق کو ایک گونہ اطمینان ہو گیا، یہ التوا حضرت کے معالج ڈاکٹر فرحت اور اطباء کے مشورہ اور درخواست سے ہوا تھا اور حضرتؒ نے حسب معمول معالجین کا مشورہ قبول فرمالیا تھا، تقریباً ایک مہینہ سفر کا التوا رہا لیکن سفر و التوا سفر اور ہندستانی اور پاکستانی خدام و اہل تعلق کے جذبات کی کشمکش چلتی رہی، خود حضرت کی طبیعت میں پاکستان جانے کا رجحان اور تقاضا تھا اور متعدد احباب سے اس تقاضے کا اظہار بھی فرمایا تھا، بالآخر جب مقامی خدام اور مخلصین نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ خود حضرت کا رجحان سفر کی طرف ہے اور اب وہ عارضی مانع (بلڈ پریشر کا اچانک بڑھ جانا) بھی ایک کاوٹ تھی نہیں رہا تو انھوں نے حضرت کی اس خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، حضرت نے انکو بار بار اطمینان دلایا کہ بھائی سے مل کر اور احباب و اہل تعلق کی خواہش پوری کر کے جلد تشریف لے آئیں گے، صرف اس وعدہ ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ مولانا عبد العزیز صاحب گمتھلوی سے فرمایا کہ تم ہمارے لانے کے ذمہ دار ہو، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت مولوی عبد الجلیل صاحب سے فرما دیں کہ وہ اس میں مانع نہ آئیں، حضرتؒ نے ان سے بھی فرمایا اور انھوں نے اس کا وعدہ کیا۔

پاکستان کا سفر اس مرتبہ اس کا خاص اہتمام رکھا گیا اور احتیاط کی گئی کہ پاکستان کے سفر

(۱) تحریر محمد انیس اعظمی۔

کی اطلاع مشہور نہ ہونے پائے، اور اچانک رائے پور سے سہارنپور روانگی ہو، پھر بھی شدہ شدہ خبر کچھ نہ کچھ پھیل گئی، یہ فیصلہ اس عجلت میں ہوا کہ جنرل شاہ نواز خاں کے سیلون کا انتظام جو اس سے پہلے ہوا تھا نہ ہو سکا، صرف کمپارٹمنٹ ریزرو کرالئے گئے، ۳۰ر اپریل ۱۹۶۲ء کو سہارنپور اسٹیشن سے روانگی ہوئی، احتیاط و اہتمام کے باوجود مشایعت (اور آخری زیارت) کرنے والوں کا بڑا مجمع ہو گیا جو صرف حضرت شیخ الحدیث کی ڈانٹ اور ممانعت کی وجہ سے قابو میں رہ سکا، ۲۴ر ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ دوشنبہ (۳۰ر اپریل ۱۹۶۲ء) کو حضرت پاکستان روانہ ہو گئے، بہت کم لوگوں کو اس کا اندازہ ہو سکا کہ یہ سفر دراصل سفر آخرت کی تمہید ہے، اور اب سہارنپور و رائے پور حضرتؒ کے قدوم اور وجود سے مشرف نہیں ہو سکیں گے حضرتؒ کی تشریف آوری کی خبر سے پاکستانی احباب میں مسرت اور زندگی کی لہر دوڑ گئی، اور گویا سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ ۲۵ر ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ سہ شنبہ (یکم مئی ۱۹۶۲ء) کو آپ لاہور پہونچے، عام اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے استقبال کرنے والوں کا مجمع زیادہ نہ تھا، قیام حاجی متین احمد صاحب کی کوٹھی پر ہوا، اہل تعلق سارے پاکستان سے کھنچ کھنچ کر جمع ہونے لگے۔

لاہور کا قیام اور زندگی کے آخری ایام

لاہور پہنچنے کے بعد تقریباً دو مہینے طبیعت اور صحت کی حالت غنیمت رہی، نظام الاوقات حسب معمول جاری رہا، چند چیزوں میں کچھ تبدیلی تھی۔

"خاموشی معمول سے زیادہ تھی لیکن تلقین و تربیت علیٰ حالہ قائم، رقت سے طبیعت بھرپور تھی، اس سے پیشتر زمانہ میں آپ پر جب کبھی رقت ہوتی تو آپ ضبط فرماتے اور آنسو نکل نہ پاتے، لیکن اس مرتبہ آپ رقت سے بے اختیار

ہو جاتے اور آنسو بہہ پڑتے، آنکھیں اکثر پُر نم رہتیں۔[1]

تعلق و شفقت میں اضافہ خدام و اہل تعلق سے محبت و شفقت میں اضافہ تھا، بعض مرتبہ کسی خادم کا خط آیا تو کئی کئی بار سنا اور رقت طاری ہو گئی، اپنے شیخ و مرشد کی یاد بہت غالب تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیمانۂ صبر لبریز ہے۔

"ایک دن عصر کی مجلس میں آزاد صاحب نے حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مکتوب گرامی سنایا جو آپ نے شاہ زاہد حسن صاحب کو مقدمہ میں ناکامی پر تسلی و تشفی کے لئے لکھا تھا اور صبر و رضا کی تلقین فرمائی تھی۔ خط کا آغاز اس شعر سے تھا۔

از قضا آئینہ چینی شکست
خوب شد اسباب خود بینی شکست

حضرت نے پوری خاموشی کے ساتھ سارا خط سماعت فرمایا، خط کے آخر میں آزاد صاحب نے "از احقر عبدالرحیم، رائے پور" پڑھا تو آپ پر رقت طاری ہو گئی۔"[2]

مواعظ کا دَور اور اس پر رقت اس مرتبہ ساڑھے تین ماہ لاہور میں قیام رہا، عصر کی مجلس میں حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے مجموعہ مواعظ (فیوض یزدانی) کا دور ہوتا، کتاب کے ختم ہونے کے ساتھ ہی پھر شروع کرنے کا حکم فرماتے تھے، اس دوران میں صرف ایک مرتبہ مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی کا تلخیص و ترجمہ پڑھا گیا اور نہ مواعظ

(۱ و ۲) تحریر سید انور حسین زیدی نفیس رقم۔

حضرت شیخ چار پانچ مرتبہ ختم ہوئے، اکثر مقامات پر آپ کو رقت طاری ہوجاتی تھی، ایک مرتبہ خود بھی حضرت شیخ کے مجاہدہ و توکل کا واقعہ سنایا، سناتے وقت آواز بہت پست تھی، لوگوں کی بے تابی دیکھ کر آپ نے آزاد صاحب سے فرمایا کہ سنا دو، انھوں نے یہ واقعہ سنایا تو آپ پر رقت طاری ہوگئی۔[1]

اسی طرح ایک دن حضرت پر بہت رقت طاری تھی، عصر کی مجلس تھی، آزاد صاحب سے فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ یہ پیران پیر کے وعظ ہیں، اور خوب اچھی طرح متوجہ رہئے، بعض عبارات کو دوبارہ پڑھواتے اور زبان مبارک سے خود بھی فرماتے کہ یہ پیران پیر ہیں، کئی بار بعض عبارتوں پر فرمایا "حق فرمایا" "بالکل حق فرمایا"، پھر آپ پر گریہ طاری ہوجاتا۔[2]

صلحائے وقت سے تعلق و محبت

نفیس صاحب کہتے ہیں کہ مواعظ کے دوران میں بعض اہل اللہ کے مقام کا ذکر آیا آپ نے فرمایا کہ اس مقام پر شیخ الحدیث اور مولانا یوسف صاحب ہیں آزاد صاحب کے سوا کسی نے یہ بات نہ سنی، ایک صاحب نے اٹھ کر کہا کہ حضرتؒ نے جو فرمایا ہے ذرا بلند آواز سے سب کو سنا دیا جائے آپ نے آزاد صاحب سے فرمایا کہ سنا دو، جب حضرت شیخ الحدیث کا نام لیا گیا تو آپ پر رقت طاری ہوگئی، نفیس صاحب راوی ہیں کہ ایک روز:۔

میرے ایک دوست سید جلال شاہ صاحب نے جو پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کے مرید اور حضرت مولانا مدنیؒ کے شاگرد ہیں مجھ سے ذکر کیا کہ میرا کام رکا ہوا ہے اور تصفیۂ قلب پورے طور پر نہیں ہوا، میں انھیں حضرت کی خدمت میں لے آیا اور خلوت کا وقت لے لیا، حضرت بہت متوجہ ہوئے، بڑی بشاشت ظاہر فرمائی، اور

(۱ و ۲) تحریر سید انور حسین صاحب نفیس رقم۔

ان کے حالات سننے پر زور سے ہنسے، پیر حضرت مہر علی شاہ کے بارے میں فرمایا کہ میں انھیں بہت بڑا مانتا ہوں، ایسے لوگوں کو میری آنکھیں ترستی ہیں، اس پر بہت گریہ طاری ہوا اور آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔"(۱)

"ایک مرتبہ حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی خواجہ شمس الدین سیالویؒ اور پیر مہر علی صاحب گولڑوی کا تذکرہ تھا، صوفی محمد حسین صاحب نے عرض کیا کہ سنا ہے کہ جب حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ کی خدمت میں بیعت ہونے کی غرض سے جا رہے تھے تو راستہ میں کسی شخص نے ان سے کہا کہ آپ تو سید ہیں اور وہ جاٹ ہیں، آپ ان کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ یہ جملہ سنتے ہی حضرت پر رقت طاری اور گریہ شروع ہو گیا، حاضر الوقت خدام بھی رونے لگے، قدرے سکون کے بعد فرمایا پھر؟ صوفی صاحب نے کہا کہ پیر صاحب نے اس کو جواب دیا میاں جاٹ سخی ہوا کرتا ہے، امید ہے کہ میں اس جاٹ کے پاس جاؤں گا تو خالی ہاتھ واپس نہ آؤں گا! حضرت پر رقت طاری ہوئی، خاصی دیر کے بعد فرمایا "بڑے مبارک لوگ تھے وہ بڑے سچے لوگ تھے وہ! اب تو دنیا خالی ہو گئی!"(۲)

"ایک دن عصر کے وقت حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے ایک مرید مولوی خدا بخش صاحب آئے، وہ بہت رو رہے تھے، حضرت سے دعا چاہی، خدام نے بتایا کہ یہ حضرت مولانا احمد علی صاحب کے مرید ہیں، حضرت پر رقت طاری ہوئی اور فرمایا "وہ بہت اچھے گئے"! ایک شخص نے مصافحہ کیا اور دعا کی درخواست

(۱) روایت سید انور حسین صاحب زیدی (۲) یادداشت صوفی محمد حسین صاحب مجلس ۲۰ جون ۱۹۶۲ء

کی اور کہا کہ میں مولانا احمد علی صاحب کا مرید ہوں، حضرت نے فرمایا مبارک ہو۔(۱)

"ایک روز شام کے وقت مولانا عبداللہ صاحب درخواستی(۲) تشریف لائے نماز مغرب کے بعد حضرت کو لٹا دیا گیا، مولانا پاس بیٹھ گئے اور کچھ واقعات اپنے مشائخ کے سنانے لگے حضرت پر رقت طاری ہو گئی، پورا جسم حرکت میں آجاتا تھا۔"(۳)

رقت و شوق کا غلبہ

رقت و شوق کا بہت غلبہ تھا، بزرگان دین کے واقعات بعض اوقات ان کا نام آنے، قرآن مجید سننے، کسی شوقیہ و عشقیہ شعر کے پڑھے جانے، کسی خصوصی خادم کے ملنے پر بے اختیار گریہ غالب آجاتا،

"ایک رات تہجد کے وقت تقریباً دو بجے آپ بیدار ہوئے، چارپائی صحن سے برآمدہ میں لیجاتے تھے، قاری حسن شاہ صاحب بھی چارپائی کو اٹھائے ہوئے تھے کسی نے ان کا ویسے ہی نام لیا، حضرت نے فرمایا یہ اس وقت کچھ سناتے نہیں قاری صاحب نے پوری محبت و اخلاص سے قرآن پاک کا ایک رکوع سنایا حضرت پر رقت ہوئی، تمام خانقاہ تلاوت کلام پاک سے گونج رہی تھی۔"(۴)

"ایک دن عصر کے وقت قاری عطاء المہیمن شاہ ابن مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سے ایک رکوع قرآن پاک کا سماعت فرمایا تو آپ پر کیفیت گریہ کی بہت ہوئی غالباً کچھ حضرت شاہ صاحب کی یاد بھی آئی جس سے کیفیت میں اضافہ ہوا۔"(۵)

"جن دنوں غنودگی طاری ہوئی، مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی تشریف

---

(۱) روایت سید انور حسین زیدی (۲) مولانا بڑے عالم اور محدث ہیں، بیعت حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دینپوری رحمۃ اللہ علیہ سے ہے، خان پور میں قیام ہے۔

(۳ و ۴ و ۵) سید انور حسین زیدی۔

نہیں رکھتے تھے، سرگودھا گئے ہوئے تھے تشریف لائے تو حضرت کو افاقہ ہو چکا تھا، حضرتؒ سے مصافحہ کو بڑھے تو حضرت پر گریہ طاری ہوا اور پھوٹ پھوٹ پڑے، مولانا عبدالعزیز صاحب بھی وارفتہ ہوگئے اور رونے لگے"۔(۱)

• مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی نے ایک روز یہ شعر پڑھا۔

اللہ اللہ ہے تو گویا جان ہے
ورنہ یار و جان بھی بے جان ہے

اس پر آپ کو بہت رقت ہوئی۔ ایک مرتبہ فرمائش کرکے بھی شعر سنا اور گریہ غالب ہوا"۔(۲)

طالبین کی نگرانی اور پرداخت

اس ضعف وعلالت کے زمانہ میں جب کئی کئی دن غنودگی طاری رہتی، طالبین کی نگرانی سے غافل نہیں تھے، وقتاً فوقتاً زیر تربیت خدام وطالبین کو طلب فرماتے اور ان کے اشغال و کیفیات کو دریافت فرماتے، ان حضرات سے فرداً فرداً فرمایا کہ "میں تو تمہارے لئے آیا ہوں"۔(۳)

• وفات سے بیس روز پیشتر غنودگی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی، اور کئی گھنٹے تک رہی، بعد میں افاقہ ہوگیا تو طبیعت مبارک پر بشاشت معمول سے زیادہ ہوگئی آپ نے بعض دوستوں کو بلایا اور ذکر کی بابت دریافت فرمایا کہ کتنا ذکر کرتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا تو حضرتؒ نے زور سے فرمایا "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" محفل پر سناٹا طاری ہوگیا، پھر فرمایا "بہت سے لوگ ہیں جو اپنے کو کامل سمجھے بیٹھے ہیں حالانکہ کچھ بھی نہیں"۔(۴)

تبلیغ واصلاح کا جذبہ

حکومت کے ایک وزیر جو بیعت کا تعلق رکھتے زیارت کیلئے

(۱) روایت مولانا عبدالوحید صاحبؒ (۲) روایت مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی (۳ و ۴) سید انور حسین زیدی

آتے رہتے اور دعا کی درخواست کرتے، ایک دن مولانا غلام غوث ہزاروی (ممبر صوبائی اسمبلی) تشریف لائے اور حسن خاتمہ کی دعا چاہی، رخصت کے وقت حضرت نے انکے ذریعہ ان وزیر صاحب کو سلام کہلوایا اور مولانا سے فرمایا کہ یہ شعر ان کو جا کر سنا دو،

روزِ محشر کہ جاں گداز بود

اولیں پرسش نماز بود

اس پر آپ کو بہت رقت ہوئی''(۱)

ایک دن مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند تشریف لائے غالباً دوسرے روز ان کی شہر میں تقریر تھی، اس دن عصر کے وقت حاضرین سے خاص طور پر فرمایا کہ آج رات کو قاری صاحب کی تقریر ہے جا کر سنو''(۲)

علالت کے اشتداد کے بعد افاقہ

لاہور کے قیام میں کئی بار مرض کا شدید حملہ ہوا، درجۂ حرارت بہت بڑھ گیا اور غفلت وغنودگی طاری ہو گئی، کئی کئی روز یہ حالت رہی، خدام پریشان وسراسیمہ ہو گئے، حضرت شیخ الحدیث کو حالات وکیفیت کی اطلاع تار اور خطوط سے برابر دی جاتی تھی اور دعا کی درخواست کی جاتی تھی، ۴ا صفر ۱۳۸۲ھ (۷ جولائی ۱۹۶۲ء) کو مرض کا دوبارہ حملہ ہوا، جولائی کا تیسرا ہفتہ بڑی پریشانی میں گزرا، حرارت تیز اور غنودگی شدید تھی، ہندستان کے اہل تعلق میں بھی (جن کو حضرت شیخ کے ذریعہ کیفیت کی اطلاع ملتی رہتی تھی) پریشانی اور تشویش پھیلی ہوئی تھی دونوں ملکوں میں سفر کی قانونی مشکلات اور پابندیوں نے اہل تعلق کو اور زیادہ مغموم اور زیارت وعیادت سے مایوس کر رکھا تھا، ۲۵ جولائی تک حالت ویسی ہی رہی، ۲۶ جولائی کو حالت بہتر

(۱ و ۲) سید انور حسین زیدی۔

ہوئی، ۲۷؍جولائی کو افاقہ ہوگیا اور بخار اتر گیا، ۲۷ر ۲۸؍جولائی کو حضرت شیخ الحدیث کے نام لاہور سے جو تار آیا اس سے افاقہ کی خوشخبری ملی اور خدام کو ایک گونہ اطمینان اور زندگی کی از سر نو امید ہوئی۔

مسلمانوں کے حالات کی فکر

راقم سطور ٹھیک انھیں تاریخوں میں جب حضرت لاہور کیلئے روانہ ہوئے تھے، حجاز کیلئے روانہ ہوا وہاں سے ۱۰؍جون ۱۹۶۲ء کو میری واپسی ہوئی، حضرت کی نازک علالت کا حال معلوم ہوا، باوجود خواہش و کوشش کے ۲۸؍جولائی ۱۹۶۲ء سے پہلے لکھنؤ سے روانگی نہیں ہو سکی، یہ سفر سخت ذہنی تشویش اور پریشانی کے عالم میں کیا گیا، سہارنپور پہنچ کر ہر وقت یہ خطرہ تھا کہ خدانخواستہ کوئی غمناک خبر نہ سننے میں آئے، کسی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، الحمدللہ افاقہ کی اطلاع ملی اور جان میں جان آئی، رات ہی کو لاہور روانگی ہوگئی، حاجی یعقوب علی خاں صاحب میر آل علی صاحب اور ماسٹر محمود الحسن صاحب کاندھلوی رفیق سفر تھے، بارڈر ہی پر مولانا عبدالجلیل صاحب سے خیریت و افاقہ کی خبر سن کر مزید اطمینان ہوا۔

میں ۳۰؍جولائی کو دوپہر کے قریب پہنچا تھا، نماز ظہر کے بعد یاد فرمایا اور حاضری ہوئی، مصافحہ کرتے ہوئے سب سے پہلے جو الفاظ فرمائے وہ یہ تھے کہ "ہم تو مر کر بچے ہیں"، اسی وقت مجھ سے حجاز کے حالات پوچھنے لگے، کتنے روز کہاں ٹھہرے؟ کیا کہا، کیا پیغام دیا؟ میں عرض کرتا رہا، حجاز کے مالی استحکام، اقتصادی اصلاح و تنظیم اور صنعتی ترقی کیطرف خاص اشارہ تھا اور اسی کے متعلق خاص طور پر دریافت فرماتے تھے، آواز نہایت کمزور اور پست تھی، مخدوم زادگان مولانا عبدالجلیل و مولانا عبدالوحید صاحبان کی مدد اور ترجمانی سے سمجھ میں آتا تھا،

دوسرے روز پھر بعد ظہر طلب فرمایا، حاضرین مجلس سے ارشاد فرمایا کہ ان سے حالات پوچھو، حضرت کو بولنے میں تعب محسوس ہوتا تھا، میں کچھ عرض کرتا رہا، اس وقت سید محمد جمیل صاحب[1] (سابق اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان) بھی حاضر تھے، مجھ سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کے صحیح حالات یہ سنائیں گے، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت پاکستان کو عیسائیت سے بڑا خطرہ ہے، فرمایا کہ تم موجود ہو تو خطرہ نہیں ہے۔

ہندستان کی واپسی کی خواہش اور رائپور کا تقاضا

اس افاقہ سے پہلے بھی جب حرارت اور غفلت کا غلبہ نہیں تھا، ہندستان کی واپسی کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا اور جب کوئی تقریب یا مناسبت پیدا ہوتی، ہندستان واپس چلنے کی خواہش اور آمادگی کا اظہار فرماتے، حاجی نجم الدین صاحب (مالک مدراس بوٹ ہاؤس دہلی) حاضر خدمت ہوئے اور ہندستان تشریف لے چلنے کا ذکر کیا تو پوری آمادگی اور خواہش کا اظہار فرمایا، شاہ محمد مسعود صاحب اور راؤ عطاء الرحمٰن خاں کو خط لکھنے اور لے جانے کیلئے کئی بار فرمایا، انکی آمد کا انتظار بھی فرماتے رہے، اس کے بعد ٹمپریچر پھر بہت اونچا ہوگیا اور غفلت و غنودگی طاری ہوگئی، اس سے افاقہ ہوا تو واپس چلنے کا تقاضا قوی ہوگیا، صوفی عبدالحمید صاحب سے (جو پاکستان کے اہل تعلق میں خصوصی مقام رکھتے ہیں اور اکثر انھیں کی تحریک سے پاکستان تشریف لانا ہوا اور زیادہ تر انھیں کے یہاں قیام ہوا) خاص طور پر اس خواہش کا اظہار فرمایا اور ہندستان واپس لے چلنے کا تقاضہ فرمایا صوفی صاحب فرماتے ہیں

(۱) سید جمیل صاحب کی خاص توجہ پاکستان کو عیسائیت کے اثرات اور اسکی تبلیغ و اشاعت کے خطرات سے محفوظ کرنے کے مسئلہ پر ہے انھوں نے اس مسئلہ کو اپنا موضوع اور مقصد زندگی بنا رکھا ہے اور اس سلسلہ میں ان کی مساعی جمیلہ بحمداللہ بہت مفید و نتیجہ خیز ثابت ہو رہی ہیں، ایدہ اللہ بنصرہ

"ہفتہ بھر ہائی ٹمپریچر کے بعد چار روز کا وقفہ ہوا، نارمل ہونے کے دوسرے روز مجھے بلایا، فرمایا بھائی مجھے جانے دو، یہ لوگ (۱) مجھے لینے کے لئے آئے ہوئے ہیں، میرے نزدیک تو اسکی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ یہاں مرجاؤں یا وہاں مرجاؤں لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد تھا کہ مولوی صاحب زندگی میں اکٹھے رہے، دل چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی اکٹھے رہیں، اس لئے رائے پور کا تقاضا ہے، میں نے عرض کیا کہ حضرت ابھی کل تو حضرت کا بخار نارمل ہوا ہے کمزوری بہت ہے موسم بھی خراب ہے جس وقت بھی حضرت کی طبیعت میں قوت آگئی اور موسم اچھا ہوا حضرت کی روانگی میں انشاء اللہ کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی، اتنے میں حاجی متین صاحب آگئے، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت رمضان تو یہیں کرنا ہے حضرت نے فرمایا کہ ایسی بات نہ کہو، اس پر میں نے دوبارہ عرض کیا کہ جب حضرت ارادہ فرمائیں گے اسی وقت روانگی ہوجائے گی، اس پر حضرت نے مسرت کا اظہار فرمایا۔"

علالت کا دوبارہ اشتداد اور مستقل غشی

صوفی صاحب سے یہ گفتگو غالباً شنبہ ۴ر اگست ۱۹۶۲ء کو ہوئی، اس روز دوپہر اور شام کو بیٹھ کر کھانا کھایا، چہارشنبہ ۸ر اگست سے بیہوشی شروع ہوگئی چند روز معمولات سب جاری رہے عصر کے بعد کتاب بھی ہوتی رہی، جماعت کے ساتھ نماز بھی پڑھی، پھر اندازہ ہوگیا کہ غفلت اور غشی ہے اور اس حالت میں تکلیف دینا نہ شرعاً ضروری ہے نہ طبی حیثیت سے مناسب و ممکن حسب معمول حضرت کی چارپائی صحن میں آتی، خدام اور اہل تعلق جن کی تعداد تین سو کے قریب ہوگی، چارپائی کو حلقہ میں لیکر ذرا فاصلہ سے خاموشی سے بیٹھ جاتے مغرب کی نماز کا وقت آتا تو حسب معمول جماعت کثیر

(۱) محمد محسن (فرزند ڈاکٹر برکت علی صاحب) اور راؤ سلیم خاں رائے پوری مراد ہیں۔

کے ساتھ نماز ہو جاتی اور لوگ نوافل و اوراد میں مشغول ہو جاتے، کچھ دیر کے بعد کھانے کا وقت آجاتا، نماز عشار بھی صحن میں ہوتی، پھر لوگ اپنے اپنے ٹھکانے پہونچکر آرام کرتے، کتاب کا سلسلہ بھی موقوف ہوگیا،

تشویش و فکرمندی غشی کا سلسلہ طویل ہوا تو اہل تعلق کی تشویش و فکرمندی میں اضافہ ہوا، کئی روز تک اس بارے میں اختلاف رہا کہ "یہ استغراق ہے اور حضرت پر سکوت و انقطاع کی کیفیت طاری ہے، غفلت و بیہوشی نہیں ہے، یا مرض کے ایک خاص مرحلہ پر پہونچ کر بیہوشی طاری ہوگئی ہے؟" جن لوگوں کا خیال تھا کہ یہ محض ایک باطنی کیفیت اور استغراقی حالت ہے وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہتے تھے کہ حضرت نے کئی بار کسی بات کے جواب میں "ہاں" ؟ "نہیں" ! فرمایا، اور بارہا تبسم بھی فرمایا، کئی بار مخاطب کیا گیا تو آپ متوجہ بھی ہوئے، مولانا محمد علی صاحب جالندھری فرماتے ہیں:۔

"مرض وفات میں جب حاضر ہوا تو کمزوری بیحد تھی، تکلم نہ فرماتے تھے، مولانا انیس الرحمٰن نے مجھ کو بلا کر حضرت کی چارپائی کے پاس بٹھایا اور مجھ سے کہا کہ تیرا نام لے کر حضرت کو بلاتے ہیں، پہلے خود مولوی انیس الرحمٰن نے فرمایا کہ حضرت آپ تو ادھر کے جہان کی طرف متوجہ ہیں، ہمارا کون ہے؟ جواب نہ دیا، پھر کہا مولوی محمد علی سلام کہتے ہیں، جواب نہ دیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ تم سلام کرو، میں نے زور سے سلام عرض کیا، فرمایا وعلیکم السلام"[1]

لیکن معالجین اور دوسرے فریق کا کہنا تھا کہ یہ غشی اور بیہوشی ہے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص میں یہ UREAMIA کی شکایت تھی جس کے نتیجہ میں بیہوشی طاری ہو جاتی ہے اور دماغ کام کرنا

(۱) مکتوب مولانا محمد علی جالندھری بنام مؤلف۔

چھوڑ دیتا ہے۔

ختم اور دعائے صحت ۹؍ اگست ۱۹۶۲ء سے آیت کریمہ کا ختم اور ظہر کے بعد بخاری شریف کا ختم شروع ہوا، پہلے روز جب ختم بخاری کے بعد حضرت کی چارپائی کے پاس اجتماعی طور پر دعا ہوئی اور آزاد صاحب نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت سب خدام آپ کی صحت اور زندگی کیلئے دعا کر رہے ہیں، آپ کی زندگی آپ ہی کی ملکیت نہیں سب کیلئے دولت بے بہا ہے، آپ بھی دعا فرمائیے تو سب پر عجب کیفیت طاری ہوئی، دل امڈ آئے اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں،

طبّی جدوجہد صوفی عبدالحمید صاحب، محمد افضل صاحب خصوصی خدام نے بہتر طبی مشورہ اور تدابیر اختیار کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، ہر طرح کے امتحانات (ٹسٹ) اور کثیر تعداد میں نہایت قیمتی انجکشن لگتے رہتے تھے، ان حضرات کی رائے ہوئی کہ مرض کی تشخیص کیلئے ایک طبی بورڈ بیٹھے جس میں لاہور کے تمام ممتاز و نامور ڈاکٹر ہوں، معز الدین صاحب فتحپوری آئی سی۔ ایس کی مدد اور دلچسپی کی وجہ سے جو اس وقت پنجاب گورنمنٹ کے چیف سیکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، شہر کے تقریباً تمام بڑے ڈاکٹر جمع ہو گئے جن میں ڈاکٹر پیرزادہ، کرنل ضیاء اللہ، کرنل محمد یوسف، ڈاکٹر محمد اختر خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان سب نے بھی سابق تشخیص سے اتفاق کیا، تجویز کے بارے میں مشورہ کیا لیکن غشی کے دور کرنے میں ان کی مساعی کامیاب نہ ہوئیں اور بدستور وہ حالت قائم رہی۔

یونانی اطباء میں سے لاہور کے نامور طبیب حکیم محمد حسن صاحب قرشی کئی بار تشریف لائے اور بعض یونانی ادویہ کا استعمال کرایا لیکن حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا، ہمدرد دواخانہ پاکستان کے مالک حکیم محمد سعید صاحب سے جو کراچی میں تھے ٹیلیفون پر مشورہ کیا گیا لیکن کوئی تدبیر سود مند

نہ ہوئی۔

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا

لاہور کے مشہور سرجن ڈاکٹر ریاض قدیر صاحب نے بھی طبی معائنہ کیا کہ شاید عمل جراحی کی ضرورت ہو لیکن اسکی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور انھوں نے کسی فوری تشویش کا اظہار بھی نہ کیا، راقم سطور نے یہ دیکھ کر کہ ایلوپیتھی اور یونانی طریق علاج اور ان کے مقامی ماہرین فن کی تدبیر و سعی ناکام ہو چکی ہے بعض اوقات ہومیوپیتھک علاج سے محیّر العقول نتائج نکلے ہیں، اپنے عزیز دوست ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو (جنھوں نے اس طریق علاج میں ذہن رسا پایا ہے اور حضرت سے بیعت و محبت کا تعلق رکھتے ہیں) لکھنؤ تار دے کر لاہور بلایا، ڈاکٹر صاحب ۱۲ راگست کو لاہور پہونچے لیکن مرض اس مرحلہ پر پہونچ گیا تھا اور حالت اتنی نازک ہو چکی تھی کہ علاج کے تبدیل کرنے کی ہمت نہ پڑی،

اس عرصہ میں جو احباب و اعزا و اہل تعلق حضرت کی زیارت کے لئے دور دور سے آتے ان کو دور سے حضرت کا دیدار کرنے اور مجلس میں شریک ہونے پر اکتفا کرنا پڑتا ملاقات و تعارف کا کوئی موقع نہ تھا محب گرامی مولانا محمد ناظم صاحب ندوی (شیخ جامعہ عباسیہ بھاول پور) برادر زادہ عزیز محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی" اسی دوران میں بھاول پور لکھنؤ سے حاضر ہوئے، یہی انتظار رہا کہ کچھ افاقہ ہو تو حضرتؒ سے مصافحہ اور شرف ملاقات حاصل کیا جائے لیکن حالت دن بدن گرتی چلی گئی اور اس کی نوبت نہ آئی ۱۳، یا ۱۴ راگست کو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور ماہر القادری صاحب جو کراچی سے لاہور آئے ہوئے تھے زیارت و عیادت کے لئے حاجی متین احمد صاحب کی کوٹھی پر تشریف لائے لیکن حالت ہی ایسی نہ تھی کہ تعارف ہوتا، صرف چند منٹ پاس کھڑے ہو کر اور زیارت

کر کے چلے گئے،

ماحول کی سکینت

حضرت پر استغراق کامل اور انقطاع کلی طاری تھا، ضعف و ناطاقتی اپنے آخری مرحلہ پر تھی، زبانی تعلیم و تربیت، تذکیر و تنبیہ اور احتساب کا وقت بظاہر گزر چکا تھا اور معلوم ہو رہا تھا کہ زندگی اور رشد و ہدایت کا یہ چراغ جو عرصہ سے چراغ سحری ہو رہا تھا گل ہونے کے قریب ہے لیکن یہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس معذوری و انقطاع کے باوجود یہ ماحول کسی کے نفس گرم اور قلب روشن سے گرم اور منور ہے، پورے ماحول پر سکینت و اطمینان کا ایک شامیانہ نصب ہے، راقم سطور اپنا حال اور تاثر عرض کرتا ہے کہ اس ماحول سے نکل کر ایک اضطراب اور بے چینی محسوس ہوتی تھی اور کہیں جی نہیں لگتا تھا کچھ دیر کے لئے اگر شہر میں کہیں جانا ہوتا تو طبیعت برابر مضطرب رہتی اور جلد واپسی کا تقاضا پیدا ہوتا اور چار دیواری کے اندر قدم رکھتے ہی محسوس ہوتا کہ امن و حفاظت کے ایک حصار میں داخل ہو گئے، ذکر و اذکار، تلاوت و نوافل میں خاص ذوق و کیفیت اور قوت محسوس ہوتی اور معلوم ہوتا کہ اس جگہ کوئی خاص بات ہے اور حضرت کے ضعف و مرض سے ماحول میں کوئی کمی یا اضمحلال یا انتشار نہیں ہے بلکہ جمعیت خاطر کے اسباب میں اضافہ ہے۔

آخری دن

۱۵ اگست کو شب میں حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اس عاجز سے ملنے آئے، حضرت کی خدمت میں بھی سلام کیلئے حاضر ہوئے اور نبض بھی دیکھی، ان کا بیان ہے کہ نبض میں حباب تھا اور وقفہ وقفہ کے بعد وہ حرکت کرتی تھی، حکیم صاحب اپنے فن اور وسیع تجربہ کی بنا پر سمجھ گئے کہ خطرہ قریب ہے اور عام اصول کے مطابق وقت موعود میں زیادہ تاخیر نہیں ہے لیکن انھوں نے مجھ سے بھی اس کا اظہار نہیں کیا، صبح

ماسٹر محمود الحسن صاحب کاندھلوی نے فرمایا کہ آج پاؤں پر ورم اور نیلاہٹ ہے اور یہ اچھی علامت نہیں، ان علامتوں کے باوجود جو خطرہ کے قرب کی خبر دیتی تھیں، عام طور پر اس حادثہ کے فوری طور پر پیش آنے کا عام احساس نہ تھا بلکہ بعض لوگوں کو افاقہ کی امید تھی، ۱۵راگست کو یعنی ایک ہی روز پہلے صاحب خانہ حاجی متین احمد صاحب نے، ۲ بجے شام کو حضرت شیخ کو جو تار دیا اس کا مضمون یہ تھا کہ حالت بہتر ہو رہی ہے،

وفات ۱۶راگست کو جمعرات کا دن تھا، اکثر اہل اللہ کیلئے یہی یوم لقا ثابت ہوا ہے[1] لیکن ہم نادانوں اور غافلوں کو وقت موعود کے اتنے قریب ہونے کا احساس نہ ہوا، زندگی کا چکر چلتا رہا اور لاہور کے شب و روز جس طرح گزر رہے تھے اسی طرح گزرتے رہے، کوٹھی کے اندر کی دنیا میں بھی کوئی اضطراب نہ تھا سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے، ۱۶راگست ۱۱ بجے کے قریب راقم نے دوستوں کی ایک جماعت کے ساتھ آزاد صاحب کے کمرہ میں کھانا کھایا، کھانا کھا کر اپنے کمرہ میں آکر قیلولہ کے لئے لیٹا ہی تھا کہ اچانک ۱۱½ بجے ماسٹر محمود الحسن صاحب یہ کہتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے۔ علی میاں! حضرتؒ کا وصال ہو گیا ایسا معلوم ہوا کہ بجلی گری اور ایک غیر متوقع واقعہ پیش آیا، اس دنیا میں جو آیا ہے وہ جانے ہی کیلئے آیا ہے اور اہل اللہ کا تو معاملہ یہ ہے کہ

دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے

اس لئے تو یہ وقت ان کی مبارک باد کا ہے یَا أَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ إِلٰی رَبِّكِ

---

(۱) ماسٹر محمود الحسن صاحب کاندھلوی فرماتے ہیں کہ جب نومبر ۱۹۵۸ء کو حضرت کا آخری مرتبہ انٹرنیشنل پاسپورٹ بنا جس کو نومبر ۱۹۶۲ء کو ختم ہونا تھا تو حضرت نے پاسپورٹ کے ختم ہونے کی آخری تاریخ سن کر فرمایا "اوہو! یہ تو عمر سے زیادہ کا بن گیا"

رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي ٥

لیکن اس اطلاع کے پاتے ہی مجمع میں ہر شخص کو اپنی محرومی اور اس نعمت عظمٰی کی ناقدری کا احساس ہوا اور اس کے دل پر ایک چوٹ لگی اور ساری عمر کی تقصیریں یاد آئیں اور حسرت ہوئی کہ کاش خدا کی اس عظیم نعمت کی قدر کر لیتے۔

یک حرف کاشکے است کہ صد جا نوشتہ ایم

دل قابو میں ہوا تو بالیں پر حاضر ہوئے، دیکھا تو میٹھی نیند سو رہے ہیں، نصف صدی سے زائد مدت مسلسل مجاہدہ، مسلسل خدمت مسلسل دعوت و اصلاح اور مسلسل بیداری روح و قلب میں گزار کر اس طرح سکون پایا ہے جیسے رات بھر کا چلا اور جگا ہوا مسافر صبح منزل مقصود پر پہنچ کر آرام کرتا ہے

لیعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

خدام محبین اور اہل تعلق آتے تھے اور زیارت کر کے چلے جاتے تھے، شہر میں بجلی کی طرح خبر پھیل گئی، ریڈیو پاکستان نے لاہور سے اس روح فرسا واقعہ کی اطلاع دی، شہر کے کونہ کونہ سے لوگ آنا شروع ہوئے، ٹیلی فون اور ٹرنک کال سے سہارنپور، دہلی، اور پاکستان کے مختلف شہروں میں اہل تعلق کو اطلاع دی گئی۔

مدفن کا انتخاب

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا تھا کہ جی چاہتا ہے کہ جس طرح زندگی میں ساتھ رہے مرنے کے بعد بھی اکٹھا رہیں مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے" اس جملہ کو سن کر اسی وقت اہل بصیرت کو یہ کھٹکا ہو گیا تھا کہ شاید اللہ کو یہ منظور نہ ہو، یہی ہوا کہ حضرت باوجود خواہش اور کوشش کے زندگی میں رائپور تشریف نہ لا سکے، مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی جن کو حضرت نے اپنی واپسی کا ذمہ دار بنایا تھا اور ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ حضرتؒ کو واپس لے آئیں گے، ہندستان جانے

کے عزم سے اچانک ایک روز قبل اپنا پاسپورٹ لینے سرگودھا تشریف لے گئے، یہ حادثہ ان کی غیر موجودگی میں پیش آیا، حضرتؒ کے اعزا خصوصی (بھائی صاحب اور بھتیجے بھانجے) نے یہ طے فرمایا کہ حضرت کی تدفین اپنے وطن آبائی ڈھڈیاں میں ہوگی، اس وقت مولانا عبدالعزیز صاحب کی (جو رائے پور لے جانے کے سلسلہ میں سب سے زیادہ مؤثر ہوسکتے تھے) غیر موجودگی اور نعش کے دوسرے ملک میں منتقل کرنے اور وقت پر پہونچانے کی مشکلات کے پیش نظر حاضرین اور اہل ہندستان میں سے کوئی ہندستان کے مسئلہ اور رائے پور میں تدفین ہونے پر زور نہ دے سکا، لاہور کے بعض احباب نے یہ تجویز پیش کی کہ حضرت کو اسی شہر میں حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے قریب دفن کیا جائے، یہ مرکزی اور سرحدی شہر ہے، ہندستان سے آنے جانے والوں کو بھی فاتحہ خوانی اور زیارت میں آسانی ہوگی اور کہیں منتقل کرنا بھی نہ پڑے گا مگر اعزا نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا اور ان کا جذبہ اور کشش نیز تعلق نسبی وخاندانی غالب رہا، اور اسی تجویز کی اطلاعیں ٹرنک کال سے جا بجا کر دی گئیں، طے کیا گیا کہ نماز جنازہ ½ ۵ بجے عصر کو کوٹھی کے سامنے کے میدان میں ہو جائے، پھر براہ لائل پور و سرگودھا جنازہ ڈھڈیاں جائے، دوسری نماز جنازہ لائل پور میں اور تیسری سرگودھا میں ہو، تاکہ ان دونوں مقامات کے اہل تعلق واحباب و خدام نماز میں شریک ہوسکیں، اسی کا اعلان شہر میں ہو گیا۔

جب جنازہ تیار ہو کر باہر آگیا تو اس وقت مولانا عبدالعزیز صاحب (جنھوں نے خبر راستہ میں سن لی تھی) تشریف لائے، اس وقت ان کا عجیب حال تھا، انھوں نے رائے پور نہ لے چلنے پر اپنے تعجب و افسوس کا اظہار کیا اور دوستوں سے احتساب بھی

فرمایا، حافظ صاحب نے اس وقت بھی رائے پور منتقل کرنے پر بہت زور دیا مگر بظاہر اب اس کا وقت گزر چکا تھا، ہزاروں کی تعداد میں لوگ نماز پڑھنے کے لئے جمع تھے، لائل پور اور سرگودھا میں اطلاع ہو چکی تھی اور وہاں لوگ منتظر تھے، ڈھڈیاں میں تدفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں، بہر حال اللہ کو جو منظور تھا وہ ہو چکا تھا اور تسلیم و رضا کی آخری منزل تھی کہ ارادۂ الٰہی کے غلبہ اور تقدیر الٰہی کی فرمانروائی کا علانیہ اظہار ہو رہا تھا،

فأترك ما اريد لما يريد

نماز جنازہ لاہور میں ایک کثیر مجمع کے ساتھ مولانا عبدالمنان صاحب خادم نے نماز پڑھائی اور نعش مبارک ایمبولنس کار پر لائل پور روانہ ہوئی نعش چارپائی پر تھی اور اس کے چاروں طرف برف رکھ دی گئی تھی، نعش کے ساتھ اعزا اور خصوصی خدام تھے، اس کے پیچھے لاریوں اور کاروں پر دوسرے اہل تعلق اور ڈھڈیاں تک لے جانے والے احباب،

لائل پور تقریباً نو بجے کے قریب عشاء کو لائل پور میں دوسری نماز جنازہ (۱) ہوئی، مولانا انیس الرحمٰن صاحب لدھیانوی نے نماز پڑھائی اور ایک عظیم مجمع نے شرکت کی، لائل پور سے حضرتؒ کو بڑا انس تھا اور اہل لائل پور کو بھی حضرتؒ سے بڑی خصوصیت تھی اور یہاں متعدد بار طویل قیام بھی ہوا، اسلئے مجمع بہت تھا اور لوگوں پر بڑا اثر تھا،

سرگودھا یہاں سے جنازہ سرگودھا روانہ ہوا، چاندنی رات تھی جو سکون و سکینت زندگی بھر سایہ کی طرح ساتھ رہی وہ اب بھی ہم رکاب تھی، جنازہ کے بجائے معلوم ہوتا تھا

(۱) حنفیہ کے یہاں نماز جنازہ کا تعدد صحیح نہیں ان متعدد نمازوں میں عام طور پر وہ لوگ ہوتے تھے جنھوں نے اس سے پہلے نماز جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی ۱۲۔

کہ ایک محمل جارہا ہے، جلو میں مسلمانوں اور اہل محبت کا ایک مجمع ہے، کسی وقت وحشت اور تعب کا احساس نہیں ہوتا تھا، ۱۱ بجے شب میں سرگودھا میں بھی ایک کثیر مجمع کے ساتھ جس میں کئی ہزار آدمی تھے، تیسری نماز جنازہ پڑھی گئی، یہاں مولانا عبدالعزیز صاحب گمتھلوی نے نماز پڑھائی،

یہاں سے جنازہ اب اپنی آخری منزل کے لئے روانہ ہوا، سرگودھا میں مولوی سید عطاء المنعم صاحب (فرزند مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ) اپنی والدہ محترمہ اور بھائیوں کے ساتھ پہونچے اور آخری زیارت کی، معلوم ہوا کہ وقت کی کمی کی وجہ سے لوگ ملتان منٹگمری اور دوسرے مقامات پر رہ گئے، سیکڑوں آدمی بروقت سواری نہ ملنے کی وجہ سے محروم رہے۔

جنازہ بھاوریاں سے ڈھڈیاں کے لئے روانہ ہوا تو کئی جگہ آخری دید کے شائقین اور مخلصین کے اصرار سے موٹر روکی گئی اور انھوں نے زیارت کی، ڈھڈیاں کے قریب غریب اور مخلص واہل تعلق دیہاتی دوڑ رہے تھے، محبت وعقیدت اور غم ومسرت کا ملا جلا منظر تھا، ان غریب دیہاتیوں کے تصور میں نہ تھا کہ جو اللہ کا بندہ جیتے جی ان سے جدا ہو گیا تھا اور جس کی زیارت برسوں میں نصیب ہوئی تھی، اب وہ ہمیشہ انھیں کے پاس رہے گا اور یہ گنج گراں مایہ اور کنز مخفی ان کے حصہ میں آئے گا، ڈھڈیاں میں چوتھی نماز جنازہ ہوئی، یہاں حضرت کے امام صلوٰۃ سید مسعود علی صاحب آزاد نے آخری نماز پڑھائی۔

تدفین

ڈھڈیاں میں قبر تیار تھی، پہلے خاندانی زمین پر گاؤں سے باہر قبر تیار کی گئی تھی لیکن وہ علاقہ نشیبی تھا اور سیلاب میں (جو ان اطراف میں عام ہے) زیر آب ہو جاتا تھا، اہل دیہہ نے اصرار کیا کہ حضرتؒ مسجد سے متصل جانب شمال اس صحن میں دفن

ہوں، جو قیام کے زمانہ میں مجلس کی جگہ تھی، یہاں بھی لبِ دریا ہونے کی وجہ سے زمین ذراسی کھودنے سے پانی آجاتا ہے، اس لئے بعض اہل علم کے مشورہ سے جو وہاں موجود تھے طے ہوا کہ نعش مبارک کو اس تابوت میں رکھا جائے جو لاہور سے ساتھ آیا تھا، اس تابوت کو وہیں رکھ دیا جائے اور اس کے چاروں جانب بخیال حفاظت دیوار چن دی جائے تاکہ پانی جلد نہ پہونچ سکے، پھر اس کو بلند کرکے اوپر قبر کا نشان بنا دیا جائے، اسی پر عمل ہوا عین صبح صادق کے وقت تدفین سے فراغت ہوئی اور فوراً صبح کی اذان ہوگئی، لوگوں نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور کچھ لوگ اسی وقت فاتحہ پڑھ کر روانہ ہوگئے، اکثر لوگ آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے اور دن نکلے ان سواریوں پر واپس ہوئے جو ان کے انتظار میں تھیں، رخصت کے وقت جب آخری سلام کے لئے حاضر ہوئے تو عجب منظر اور دل پر عجب اثر تھا، دور افتادہ خادم جو سیکڑوں میل کے رہنے والے تھے سمجھ رہے تھے کہ شاید یہ آخری حاضری اور آخری سلام ہے مگر زبان حال کہتی تھی کہ :-

رفتید، ولے نہ از دل ما

حلیہ مولانا محمد صاحب انوری حضرت کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کا قد میانہ اوپر کو اٹھتا ہوا، بدن مبارک بھاری بھرکم، چہرہ مبارک روشن، پیشانی مبارک پر ستارہ چمکتا ہوا دکھائی دیتا تھا، پردۂ بینی نور کی طرح روشن، دانت چمکیلے جیسے موتی کی لڑی، جب ہنستے تو بہت خوبصورت نظر آتے، اکثر اوقات خاموش بیٹھتے اور حاضرین پر رعب پڑتا تھا، تمام چپ بیٹھتے، اخیر میں آکر اکثر اوقات آنکھیں بند کرکے بیٹھتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خاموش تعلیم ہو رہی ہے، آنکھیں بڑی بڑی خوبصورت،

ایک دفعہ رائے پور میں عید کے روز اجلے کپڑے پہنے ہوئے صفوں پر ٹہل رہے تھے اور یہ پڑھ رہے تھے "وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا" بڑے ہی خوبصورت دکھائی دیتے تھے، جو دیکھتا اوّل اوّل رعب پڑتا، پھر آپ کو بہت ہی محبوب رکھتا تھا۔

بارہواں باب (۱۲)

باطنی کیفیات اور نمایاں صفات

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد
ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند آنرا کہ خبر شد خبرش باز نیامد
(شیخ سعدیؒ)

محبت و شوق کامل الاحوال بزرگوں کی باطنی کیفیات کا اندازہ عامی کیا لگا سکتے ہیں، ان حضرات کا اصول و مسلک یہ ہے کہ۔

عشق عصیان است گر مستور نیست

لیکن پھر بھی پیمانہ جب لبریز ہوتا ہے تو دو چار قطرے ٹپک پڑتے ہیں، ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں ضبط گریہ اور اخفائے حال کی کوشش اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے جس سے سینہ معمور اور دل مخمور ہے، کسی حقیقت شناس نے عرصہ ہوا کہا تھا۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

اصحاب احوال جب کسی شعر کا انتخاب کرتے ہیں یا اس سے ان کو خاص کیف اور ذوق حاصل ہوتا ہے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ان کے حقیقت حال کی تصویر اور ان کے دل کی سچی ترجمانی اور تعبیر ہے، ایک مرتبہ راقم سطور نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ حضرت مولانا فضل رحمٰن

گنج مرادآبادیؒ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

دل ڈھونڈنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے

اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

حضرت کو اس شعر پر بڑا ذوق آیا اور کئی بار فرمائش کر کے مجھ سے سنا، میں سمجھ گیا کہ اس پسندیدگی اور کیف کی وجہ یہ ہے کہ یہ شعر مطابق حال ہے،

حضرتؒ کے خمیر میں شروع سے محبت وعشق کی چنگاری تھی، اور یہ ان کا فطری ذوق اور حال تھا، اس لئے مشائخ اور بزرگوں میں بھی جن کے یہاں یہ عنصر نمایاں اور غالب نظر آتا تھا ان سے خصوصی مناسبت اور عقیدت تھی، اسی بنا پر محبوب الٰہی سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے عشق کا سا تعلق تھا اور ان کے حالات سے خاص شغف اور شیفتگی تھی اور کسی طرح ان کے حالات سے سیری نہیں ہوتی تھی[1]، دور آخر میں حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے حالات اور تذکرہ میں یہ چیز بہت ملتی ہے اور اہل عشق کو ان کے واقعات، ان کی کیفیات اور ان کے منتخب و پسندیدہ اشعار سے بڑی چاشنی حاصل ہوتی ہے، لاہور کے دوران قیام ۱۹۵۹ء میں حاجی متین احمد صاحب کی کوٹھی پر کسی دوست کی تحریک و تذکرہ پر تذکرہ مولانا فضل رحمٰنؒ عصر کے بعد کی مجلس میں پڑھا جانے لگا اس وقت تک کتاب چھپی بھی نہیں تھی اور میرے پاس اس کا ناقص مبیضہ تھا، کتاب شروع

(۱) حضرت کے بار بار تقاضے اور تاکید ہی سے راقم نے تاریخ دعوت وعزیمت" کا تیسرا حصہ جو حضرت خواجہ کے حالات پر مشتمل ہے مرتب کیا، حضرت نے اتنے بار اس کا تقاضا فرمایا تھا کہ بغیر اس ارمغان کے حاضر ہونے سے شرم آنے لگی تھی، بالآخر اللہ نے اسکی توفیق دی اور حضرتؒ نے اسکو حرف بحرف سنا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، جب تک وہ ختم نہیں ہوا کوئی دوسری چیز شروع نہیں ہو سکی۔

ہوئی اور مولانا کے سادہ لیکن دل کو تڑپا دینے والے حالات اور واقعات پڑھے جانے لگے تو ساری مجلس پر ایک کیف سا طاری ہو گیا، جو درحقیقت حضرت کی کیفیت باطنی کا عکس تھا، زبان حال گویا کہہ رہی تھی:۔

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

بعض اہل احساس نے بیان کیا کہ ایسا کیف مجلس میں اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا، حضرتؒ نے ایک بار فرمایا کہ بڑی پیاری باتیں ہیں" پھر فرمایا: پیاروں کی باتیں پیاری ہی ہوتی ہیں"۔

اسی بنا پر حضرت مولانا ہی کے ایک معاصر اور صاحب محبت شیخ سائیں توکل شاہ صاحب انبالوی کا تذکرہ بھی بڑے ذوق و کیف کے ساتھ فرمایا کرتے تھے، یہاں بھی کشش کی وہی وجہ تھی، حضرت کے شیخ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ دونوں حضرات کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور دونوں نے خصوصی توجہ فرمائی تھی، حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ اور دوسرے مشائخ چشتیہ سے مناسبت اور خصوصی تعلق کی وجہ بھی یہی تھی،

اہل درد و محبت کے یہاں ہمیشہ سے عشق و محبت کے اشعار سے تسکین و قوت حاصل کرنے کا دستور رہا ہے، اس کا مقصد صرف دل کی آنچ کا (جو بعض اوقات ناقابل برداشت ہو جاتی ہے) نکالنا یا اس پر آنسوؤں کے چھینٹے دینا ہوتا ہے، اپنے زمانہ کے مشہور نقشبندی شیخ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ نے اسی ضرورت و حقیقت کا اظہار اس طرح کیا ہے:۔

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینھ نہ برساتی

اس کے لئے اہل دل رسوم وضوابط کے پابند کبھی نہیں رہے کبھی سادگی کے ساتھ کبھی ذرا ترنم سے کوئی عارفانہ عاشقانہ شعر سن لیا اور تسکین حاصل کر لی، اس لئے کہ :-

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے

نالہ پابند نَے نہیں ہے

حضرت بھی بعض اوقات اضطراراً کسی صاحبِ دل اور صاحبِ نسبت کا کلام سن لیتے بعض اوقات اپنی اس باطنی کیفیت وضرورت کی بنا پر فرمائش کرتے اور سادگی و بے تکلفی کے ساتھ عربی، فارسی، اردو اور زیادہ تر فارسی یا پنجابی کا عاشقانہ کلام پڑھا جاتا ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۸ء میں جب سہارنپور سے پاکستان تشریف لے جا رہے تھے تو یہ خادم سہارنپور سے لدھیانہ تک اسی کار پر تھا جس پر حضرتؒ تشریف رکھتے تھے، سہارنپور سے جب کار روانہ ہوئی اور سواد شہر سے نکلی تو حضرتؒ کی بے کلی و بے تابی کی عجیب کیفیت دیکھی، معلوم ہوتا تھا کہ کسی کل چین نہیں آتا پیچھے کی سیٹ پر خود بدولت اور مولانا عبدالجلیل صاحب اور مولانا عبدالمنان صاحب تھے، آگے کی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ یہ خادم بیٹھا ہوا تھا، مجھ سے ارشاد ہوا کہ کچھ سناؤ، یہ خادم اگرچہ مختلف وقتوں میں عارفانہ وعاشقانہ اشعار پڑھا کرتا تھا، لیکن اس وقت کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ سوائے دو چار شعر کے کچھ یاد نہ آیا، حضرت کی طبیعت مبارک اسی وقت اس کی متقاضی تھی کہ ترنم سے پڑھا جائے وہ بھی اس وقت نہ ہو سکا، اس سے تسکین نہ ہوئی تو فرمایا کہ بزرگوں کے واقعات سناؤ اتفاق سے وہ بھی کچھ زیادہ یاد نہ آئے، اس اضطراب کو دیکھ کر بار بار اس کا خیال آیا کہ کاش اس موقع پر مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی ہوتے اور حضرت کو خوش کرتے۔

پاکستان کے قیام میں بعض زمانوں میں یہ ذوق زیادہ غالب آجاتا اور حسب مانوس و

فہیم لوگ ہوتے تو پنجابی کے اشعار سنتے، ایک زمانہ میں سونے سے پہلے بہت دن تک یہی معمول رہا۔

"اسی محبت و شوق اور دائمی نسبت و تعلق کا نتیجہ تھا کہ بڑی سے بڑی جسمانی تکلیف اور بیماری کی شدید سے شدید اذیت کے موقع پر بھی حرف شکایت زبان پر کیا دل میں بھی نہیں آنے پاتا تھا جو اس محبت و شوق کے بغیر ناممکن ہے مالک کے احسانات کا شکر کا جذبہ اور انس مع اللہ ان جسمانی اذیتوں اور انکے احساس پر غالب رہتا تھا۔

مولانا عبدالوحید صاحب بیان کرتے ہیں۔

"آخری ایام میں معمول تھا کہ عشا کی نماز اول وقت پڑھ کر فوراً لیٹ جاتے تھے ایک دن فرمایا کہ بہت جلدی نماز پڑھاؤ مجھے پیشاب لگا ہے سلام پھیرتے ہی فرمایا، چارپائی جلد اندر لیجاؤ خدام چارپائی اندر لے گئے اور چوکی پر بٹھا دیا بہت دیر بیٹھے رہے پیشاب نہیں ہوا (حضرت کی تکلیف کا اندازہ اسکو ہو سکتا ہے جس نے اس زمانہ میں انکو دیکھا ہو) سخت تکلیف تھی فرمایا پیشاب نہیں ہوا مجھے اٹھا لو خدام نے اٹھا کر لٹانے کا ارادہ کیا پھر فرمایا بہت جلدی کرو، پھر چوکی پر بٹھایا گیا پھر بہت دیر بیٹھے رہے، فرمایا میں گر رہا ہوں مجھے جلدی سے اٹھالو پھر اٹھا کر لٹایا پھر فرمایا مجھے اٹھاؤ، پھر یہی صورت پیش آئی، کئی مرتبہ کے بعد پھر جب اٹھانے کے لئے فرمایا (اس وقت انتہائی تکلیف کا عالم تھا) تو اتنا لفظ زبان سے نکلا کہ میرے مالک..... ایک خادم کے جی میں آیا کہ حضرت والا کو ساری عمر کیسی کیسی تکلیفیں رہیں گر ساری عمر ایک کلمہ بھی شکایت کا زبان پر نہ آیا مگر آج یہ جملہ کیسے نکل رہا ہے حضرت نے جملہ پورا فرمایا، میرے مالک کا میرے ساتھ عجیب فضل کا معاملہ ہے، وہ خادم دل

میں اس عاجلانہ خیال پر نادم ہوئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ شدید بخار تھا، بیہوشی کی یہ حالت تھی کہ رات بھر بے چین رہے اور صبح کو کچھ احساس نہ ہوا کہ کیا تکلیف تھی، بے چینی کی یہ کیفیت تھی کہ کسی پہلو چین نہ تھا کبھی بیٹھتے کبھی لیٹتے۔ آدھی رات کے بعد خادم نے عرض کیا کہ اب کچھ سکون ہے؟ ارشاد فرمایا، الحمد للہ سکون تو ہے ہی، اسکے علاوہ کوئی لفظ زبان سے ایسا نہ نکلا جس سے آزردگی کا اظہار ہوتا ہو۔"

قرآن مجید سے شغف اور اسکی تلاوت کا انداز

حضرت کو اپنے شیخ کیطرح قرآن مجید سے عشق، اور اسکے پڑھنے اور سننے سے بڑا شغف اور ذوق تھا خود حافظ تھے، تخلیہ اور صبح کے ٹہلنے میں اکثر قرآن مجید ہی سے اشتغال رہتا، کلام الٰہی کی تلاوت میں آپ کا کیا انداز تھا اور آپ اس وقت کیا مراقبہ اور استحضار فرماتے تھے، اسکا کسی قدر اندازہ اس روایت سے ہوگا، جو ایک معتبر خادم نے بیان کی :۔

"جب حضرت رحمۃ اللہ کی صحت اچھی تھی، تو رمضان المبارک میں بعد نماز عصر مجلس سے الگ تنہائی میں قرآن پاک کی تلاوت فرماتے ایک صاحب جو وہیں رہا کرتے تھے بتلاتے ہیں کہ میں ادھر سے گذرا، تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن پڑھنے کی کیفیت کچھ کھلی، اور بہت ہی بھلی معلوم ہوئی، اور دل ہی دل میں بے ساختہ یہ دعا کی کہ اے اللہ اس طرح پر قرآن پاک پڑھنا ہم کو بھی عطا فرما دے، رمضان المبارک کے گذرنے کے بعد غالباً حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں صاحب کو بلایا، اور فرمایا کہ آؤ تمھیں بتلائیں قرآن ایسے پڑھا کرو، وہ جو قرآن پاک میں آتا ہے، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا سے باتیں

کرتے اور اس شجر سے سنتے تھے، اپنے کو وہی شجر تصور کرو اور پھر اپنے میں سے قرآن پاک کے نکلتے ہوئے الفاظ کو یوں سمجھو کہ یہ خدائے پاک فرما رہے ہیں، اور کانوں سے اسی انداز پر سنو کہ میں اپنے اللہ کا کلام اللہ ہی کی آواز میں سن رہا ہوں، اور اسی طرح پر فرمایا کہ فرماتے ہوئے یہی کیفیت سراپا اپنے اوپر طاری کرلی، اور فرمانے کا یہ اثر ہوا کہ وہی کیفیت دل میں جیسے اتر گئی، وہ ہی صاحبؒ یوں بتلاتے ہیں، کہ مدت تک قرآن پاک ایسی ہی کیفیت کے ساتھ پڑھنا نصیب ہوا، اور بہت ہی لطف آیا، اور یہ انداز قرآن پاک کی تلاوت کے سلسلہ کی ترقیوں میں نئے نئے اضافوں کا سبب بنا"

محبت رسول ان بزرگوں کے اس تعلق و محبت کا اندازہ جو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ان کو حاصل ہے بغیر ان کو قریب سے دیکھے اور کچھ دن صحبت میں رہے، نہیں ہوسکتا، دور سے دیکھنے والے تو ان کو زاہد خشک اور معاذ اللہ بے ادب اور محبت سے نا آشنا سمجھتے ہیں، مگر ان کا حال وہ ہوتا ہے جو آسی غازی پوری نے پوری احتیاط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

صبا یہ جاکے کہیو مرے سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اس محبت اور جذبہ کی تسکین بھی نعتیہ اشعار سے ہوتی تھی حضرت خاص طور پر صحابہ کرام کے نعتیہ اشعار زیادہ شوق اور فرمائش سے سنتے تھے خصوصیت کے ساتھ قصیدۂ بانت سعادؓ حضرت کا بڑا محبوب قصیدہ تھا اور اکثر مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی سے اسکے سنانے کی فرمائش کرتے تھے، حضرت عبداللہ بن رواحہ کے اشعار۔

فینا رسول اللہ یتلو کتابہ اذا انشق معروف من الفجر ساطع

ارانا الھدی بعد العمی فقلوبنا بہ موقنات ان ما قال واقع

یبیت یجافی جنبہ عن فراشہ اذا استثقلت بالمشرکین المضاجع

حضرت کو خوب یاد تھا اور خود پڑھ کر سناتے تھے،

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی طرف منسوب قصیدہ جس کا مطلع ہے،

صبا بسوئے مدینہ روکن ازیں دعاگو سلام برخواں

بگرد شاہ مدینہ گردو بصد تضرع سلام برخواں

اکثر پڑھوا کر سنا، اسی طرح۔

دلم زندہ شد از وصالِ محمدؐ

جہاں روشن است از جمالِ محمدؐ

اسی طرح پنجابی اور ملتانی کے نعتیہ اشعار محمد شفیع صاحب اور کمتر صاحب سے اکثر سنا کرتے تھے اور اس وقت اکثر آنکھیں پرنم ہوتیں۔

ایک مرتبہ حضرت مسجد نبوی میں تشریف رکھتے تھے، اس خادم نے عرض کیا کہ حضرت اس مسجد میں بعد کے لوگوں نے بڑی زیب و زینت پیدا کر دی اور قیمتی قالین بچھائے کاش یہ مسجد اپنی پہلی سادگی پر ہوتی، معلوم نہیں اس وقت حضرت کس حال میں تھے جوش آگیا، فرمایا" حضرت اور زیادہ زیب و زینت ہو، دنیا میں جہاں کہیں جمال اور زیب و زینت ہے انھیں کے صدقہ میں تو ہے" مجھے شرمندگی ہوئی اور احساس ہوا کہ یہ حضرات کس قدر محبت سے بھرے ہوتے ہیں،

مرض وفات میں مدینہ طیبہ کا ذکر سن کر بے اختیار رقت طاری ہو جاتی اور بعض

اوقات بلند آواز سے رونے لگتے، مولانا محمد صاحب انوری عمرہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے حضرت سے رخصت ہونے کے لئے آئے، مدینہ طیبہ کا ذکر ہوا تو حضرت دھاڑیں مار کر روئے مولانا محمد صاحب فرماتے ہیں کہ "میں نے کبھی حضرت اقدس کو اس سے پہلے بلند آواز سے روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا" بابو عبدالعزیز صاحب آئے تو ان سے فرمایا "دیکھو یہ مدینہ جا رہے ہیں"، یہ کہہ کر حضرت کی چیخیں نکل گئیں(۱)۔

صحابۂ کرامؓ سے تعلق و محبت

کتاب میں اس کا تذکرہ کئی بار آچکا ہے کہ حضرتؒ پر ابتدائے شعور سے صحابہ کرامؓ کی محبت و عظمت کا بڑا غلبہ تھا اور حضرت کو ان کے حالات اور تذکرہ سے بڑی مناسبت اور شغف تھا، اکثر انھیں کا تذکرہ کرنا اور سننا پسند فرماتے تھے ان کی فتوحات و مغازی کی کتابوں سے سیری نہیں ہوتی تھی، فتوح الشام واقدی سے خاص شغف تھا خلفائے راشدینؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے مناقب بڑی دلچسپی اور لطف سے سنتے تھے اور اس داستان کو زیادہ سے زیادہ طول دینا پسند کرتے تھے،

بحرفے تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از شوق حضوری طول دادم داستانے را

پاکستان میں بالخصوص (وہاں کے حالات کی بنا پر) یہ ذکر و تذکرہ بہت بڑھ جاتا تھا، ایک روز ایک مجلس میں فرمایا:۔

"اگر شیعہ کے اصول کو دیکھا جائے تو پھر اسلام میں تو کچھ نہیں رہ جاتا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی کمال ہی نہیں معلوم ہوتا ہم دیکھتے ہیں کہ

(۱) مکتوب مولانا محمد صاحب انوری

ایک بزرگ کی صحبت سے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی اصلاح ہو جاتی ہے اور صحبت کی برکت سے پکے دیندار بن جاتے ہیں، نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے کوئی بھی پکا مسلمان نہیں بنا!" (۱)

ایک مرتبہ ان حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے جو سادات کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں اور تشیع کی طرف مائل ہیں فرمایا:-

"بھائی میں تو سیدوں سے عرض کرتا ہوں کہ مجھے تو آپ حضرات پر اعتبار نہیں رہا کہ ہم تو اچھے خاصے مندروں میں پوجا پاٹ میں لگے رہتے تھے آپ کے بڑوں نے ہمارے بڑوں کو اسلام کی دعوت دی، ہم لبیک کہتے ہوئے ان کے پیچھے ہو لئے اب آپ ہمیں ہمیں چھوڑ کر کوئی شیعہ ہو رہا ہے، کوئی مرزائی اور کوئی عیسائی اور کوئی منکر حدیث، پس بھائی ہمیں یہی اسلام کافی ہے، یہ ہمارے بس کا نہیں کہ تم جہاں جاؤ ہم تمہارے پیچھے پیچھے بھاگے پھریں، اگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم مسلمان نہیں ہیں تو ہمیں تو اور کوئی مسلمان نظر نہیں آتا" (۲)

مولانا محمد صاحب انوری لکھتے ہیں:-

"حضرت نور اللہ مرقدہ کو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات سننے کا بڑا ذوق و شوق رہتا تھا، مولانا محمد یوسف صاحب کی کتاب حیاۃ الصحابہ (۳)

---

(۱) مجلس ۶ ر جمادی الثانیہ ۱۳۷۶ھ کو ٹھی صوفی عبدالحمید صاحب، (۲) تحریر صوفی غلام فرید ساکن جھاوریاں

(۳) حیاۃ الصحابہ مولانا محمد یوسف صاحب کی جلیل القدر تصنیف ہے کتاب عربی میں ہے، یہ صحابہ کرامؓ کے حالات و واقعات اور تبلیغ و دعوت کی روئداد کا نہایت ضخیم مجموعہ ہے، دو ضخیم حصے مطبع دائرۃ المعارف حیدر آباد سے طبع ہو چکے ہیں، تیسرا حصہ زیر طبع ہے۔

(جو کبھی خلوت میں سنائی گئی) سن کر بہت روتے تھے اور پنجاب کے اسفار میں لاہور
ولائل پور میں تو ہم نے دیکھا ہے کہ محمد شفیع کبیر والہ ضلع ملتان سے آجاتے تو ان سے
مناقب صحابہ کے متعلق پنجابی نظمیں سنتے اور رقت طاری ہو جاتی۔ اکثر اوقات
حضرت اقدس کی زبان مبارک پر پنجابی کا یہ شعر رہتا تھا۔

او دیوانے محمدؐ دے میں دیوانہ صحابہؓ دا
او پروانے محمدؐ دے میں پروانہ صحابہؓ دا

پھر محمد شفیع کے انتظار میں رہتے جب آتے تو یہ شعر ضرور سنتے۔[1]

اپنے شیخ اور اکابر سے تعلق

شریف الفطرت اور کریم النفس انسان جس سے کوئی نعمت پاتا ہے ساری عمر اس کا احسان مانتا ہے اور اس کے گن گاتا ہے، پھر جس شخص کو کسی شیخ کامل اور مقبول بارگاہ کی خدمت میں طویل صحبت اور خصوصی قرب حاصل رہا ہو اور اس نے شب و روز جلوت و خلوت میں بنظر غائر اسکی زندگی کا مطالعہ کیا ہو اور اسکے کمالات اس پر منکشف ہوئے ہوں، اس کا دل کس طرح اس کی محبت وعقیدت سے لبریز اور اسکی زبان کس طرح اس کے محامد و فضائل بیان کرنے میں مشغول نہ ہو،

حضرت اپنے شیخ و مربی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہ کی محبت وعقیدت سے لبریز تھے، اور یہ آپ کا ایک دائمی حال اور ذوق بن گیا تھا، جس وقت آپ کا ذکر فرماتے تھے اس شعر میں ذرا مبالغہ اور شاعری نہیں معلوم ہوتی ہے،

---

(۱) مکتوب مولانا محمد صاحب انوری مولانا عبدالجلیل صاحب: فرماتے ہیں کہ باوجود ضبط کے نعت کے آخری مصرعہ کا اثر حضرتؒ پر ہوتا تھا اور بعض اوقات اس اثر سے بدن میں حرکت دیکھی گئی۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

حضرت کے اخلاص وللہیت، حضرت کی بے نفسی وفنائیت، حضرت کے اجتہاد وبصیرت پر آپ کو پورا اعتقاد واعتماد تھا، ایک مرتبہ فرمایا:۔

"میں اپنے حضرت کی تعریف اس لئے نہیں کرتا کہ اس میں بھی اپنی ہی تعریف ہے، ورنہ ہمارے حضرت تصوف کے امام تھے اور تو کچھ نہیں عرض کرتا البتہ اتنا جانتا ہوں کہ میں چودہ سال حضرتؒ کی خدمت میں رہا، اس طویل مدت میں کبھی ایک کلمہ بھی حضرت کی زبان مبارک سے نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو بھی آتی ہو، حُب جاہ ایک ایسی چیز ہے جو سب سے آخر میں اولیاء اللہ کے قلوب سے نکلتی ہے جب سالک صدیقین کے مقام تک پہنچتا ہے تب اس سے پیچھا چھوٹتا ہے، یہ بات میں نے اپنے حضرت میں خوب اچھی طرح سے دیکھی کہ حُبّ جاہ کا وہاں سر کٹا ہوا تھا۔"(۱)

حضرت کو اپنے شیخ اور شیخ سے نسبت رکھنے والی چیزوں سے اتنا انس اور محبت تھی کہ فرمایا کرتے تھے کہ "ہمیں تو رائے پور کا کتا بھی پیارا ہے" حضرت کا کوئی دور سے دور کا رشتہ دار بھی ہوتا تو اس سے اس طرح جھک کر ملتے کہ گویا اپنے کسی معزز قریبی عزیز سے مل رہے ہیں اور ان سے اس درجہ اظہار تعلق فرماتے کہ نہ جاننے والے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے کہ یہ لوگ حضرت کے کوئی قریبی عزیز اور خصوصی تعلق والے ہیں، اپنے قریبی عزیزوں کو ان کے مقابلہ میں ہمیشہ پیچھے رکھا۔(۲)

(۱ و ۲) تحریر مولانا عبدالوحید صاحب۔

اس غایت تعلق کا نتیجہ یہ تھا کہ کامل مناسبت اور اتحاد پیدا ہو گیا تھا، ایک مرتبہ فرمایا کہ "میرے اور شیخ کے تعلق کو کیا پوچھتے ہو، جو بات حضرت کے قلب میں آتی وہی بات میرے دل میں آجاتی تھی، اور جو میرے قلب میں آتی وہی حضرت کے قلب میں آتی"[1]

حضرتؒ سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے اور ان کے حقوق کو ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کو اپنے حق میں نہایت مفید و موجب ترقی سمجھتے تھے، ایک بار فرمایا کہ:-

"رائے پور میں شاہ زاہد حسن صاحب مرحوم کی بیماری کی خبر آئی[2] میں نے سوچا کہ یہ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خادم تھے، خالص لوجہ اللہ بغیر بلائے ان کی عیادت کو جانا چاہیئے، اس لئے رائے پور سے پیدل بہٹ گیا، اس جانے میں عجیب کیفیت رہی اور ایک ایسی خوشبو آتی رہی کہ پھر وہ نہیں آئی، یہ اس تصحیح نیت کی برکت تھی[3]"

یہ تعلق مرور ایام اور طول مدت سے مضمحل اور کمزور نہیں ہوا تھا بلکہ جوں جوں وقت گزرتا اور وقت آخر قریب آتا جاتا تھا، اس محبت و تعلق میں اضافہ و ترقی تھی، ۱۹۶۲ء میں حضرت لکھنؤ میں مولانا محمد منظور صاحب کے مکان پر تشریف رکھتے تھے عائد شہر بھی حاضر تھے، حضرت اپنے مرشد مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کے مرض وفات اور انتقال کا حال

---

(۱) تحریر مولانا عبدالجلیل صاحب (۲) اس بیماری کے بعد حضرت شاہ صاحب عرصہ تک زندہ رہے حضرت شاہ صاحب کی پشت پر سرطان ہو گیا تھا اور وہ اچھا ہو گیا، اس مرض تک شاہ صاحب کو حضرت سے کچھ زیادہ موانست و عقیدت نہ تھی لیکن اسکے بعد انکو حضرت سے عاشقانہ و خادمانہ تعلق پیدا ہو گیا جو اخیر تک رہا۔ (۳) تحریر مولانا عبدالجلیل صاحب۔

بیان فرما رہے تھے، جب انتقال کا ذکر فرمایا تو آنکھوں میں آنسو تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ زخم تازہ اور حادثہ بالکل قریب کا ہے، لاہور کے زمانۂ قیام میں مرض وفات میں حضرت کا ایک مکتوب بنام شاہ زاہد حسن پڑھا جا رہا تھا، جب آخر میں حضرت کا اسم گرامی "احقر عبدالرحیم" آیا تو ضبط نہ ہو سکا اور رقت طاری ہو گئی،

نہ صرف اپنے شیخ جن سے براہ راست تعلق تھا اور جو ولی نعمت تھے بلکہ اپنے سلسلہ کے تمام شیوخ بالخصوص سلسلۂ ولی اللّٰہی اور سلسلۂ امدادیہ کے مشائخ اور اہل سلسلہ سے نہایت درجہ عقیدت مندی اور عشق و محبت کا تعلق تھا، ان حضرات کے بارے میں کسی طرح کی تنقیص یا تنقید کی طبیعت متحمل نہیں تھی، اور یہ ایک ایسی غیر اختیاری کیفیت تھی، جس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو سچی محبت، کامل اعتماد اور شرافت اور شکر گزاری کا جذبہ فطرت میں ملا ہے، صوفی محمد حسین صاحب راوی ہیں:-

"ایک دفعہ ڈھڈیاں میں شام کا کھانا ہو رہا تھا، حضرت والا خود دسترخوان پر تشریف فرما تھے، ایک صاحب لائل پور سے تشریف لائے جن کا جماعت اسلامی سے تعلق تھا، السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے، حضرت نے ان کو کھانے میں شریک ہونے کو کہا، چنانچہ کھانے میں شریک ہو گئے، ان کو حضرت کے ساتھ ہی جگہ ملی، ابھی ایک ہی لقمہ اٹھایا ہو گا کہ انھوں نے حضرت اقدس سے سوال کیا (بڑے اکھڑپن سے سوال بھی کیا) حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کیوں ناکام ہو گئی تھی؟ ناکامی کی وجوہات کیا تھیں؟ حضرت اقدس نے بڑی ناگواری کے ساتھ بلکہ غصہ کے ساتھ فرمایا کہ ہم کوئی بزرگوں کے عیب نکالنے کے لئے تھوڑے بیٹھے ہوئے ہیں، ان کی سعی بہر حال مشکور ہے، اس سے وہ

صاحب خاموش ہوگئے(۱)

بے نفسی وفنائیت

حضرتؒ نے اپنے مرشد و مربی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فنائیت و بے نفسی کے متعلق اپنا ذاتی مشاہدہ و تاثر جو کچھ بیان فرمایا حضرت کے یہاں رہنے والوں کا بعینہ یہی تاثر حضرت کی ذات کے متعلق ہے کہ کبھی ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سنا جس میں اپنی تعریف کی بو بھی آتی ہو، حب جاہ کا یہاں سر کچلا ہوا تھا، اس خادم کو ۱۳۶۹ھ کے آخری سفر حج میں ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا اور تقریباً تین مہینے شب و روز ساتھ رہنا ہوا، بعض خدام نے اپنے ادراک و الطاف الٰہی کے واقعات بھی سنائے، پورے سفر میں حضرتؒ نے کوئی ایسی بات نہیں فرمائی جس سے حضرت کے علو مرتبہ یا کسی کشف و ادراک کا احساس ہو، حج کے علاوہ بھی کبھی کوئی ایسی بات قصداً نہیں فرمائی جس سے لوگوں کی عقیدت میں اضافہ یا آپ کی بزرگی کا احساس ہو، خدام نے جب سنا، اپنی نفی، اپنا انکار اپنی بے حسی اور جہالت کا اظہار سنا، مشیخت کی باتیں یا متصوفانہ نکات یا سلوک و معرفت کی تحقیقات بیان کرنے کا حضرت کے یہاں دستور ہی نہ تھا، مسئلہ علماء سے پوچھتے، تصوف کی کوئی بات پوچھتا تو اگر حضرت شیخ الحدیث یا کوئی دوسرا صاحب علم و صاحب نظر قریب ہوتا تو اس کی طرف محول فرما دیتے، اگر اصرار کیا جاتا اور بات ضروری ہوتی تو نہایت نپے تلے لفظوں میں مغز کی بات فرما دیتے، ایسی بات سے گریز کرتے جس سے آپ کی ژرف نگاہی باریک بینی کا اندازہ ہو لیکن اہل حقیقت سمجھ جاتے کہ

غواص کو مطلب ہے گہر سے کہ صدف سے

(۱) مولانا عبدالجلیل صاحب کی روایت ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ میں اسی برس کا بوڑھا قبر میں پاؤں لٹکائے اپنے بزرگوں کے عیب ڈھونڈھنے کے واسطے رہ گیا۔؟

کسی بھری مجلس میں خواہ اس میں کیسے ہی نئے نئے اور سر برآوردہ اشخاص کیوں نہ ہوں،
اپنی لاعلمی اور اپنے عامی ہونے کا اظہار کرنے میں کوئی تأمل نہ ہوتا خواہ اس کا اثر حاضرین
مجلس اور خاص طور پر صاحب علم طبقہ پر کچھ پڑتا ہو، راولپنڈی میں ایک مرتبہ قریشی صاحب کی
کوٹھی پر چمن میں عصر کے بعد بڑی وسیع مجلس تھی، بعض اعلیٰ عہدہ دار، ممتاز علماء اور عمائد
شہر جمع تھے، پروفیسر عبدالغنی صاحب جے پوری نے (غالباً اس خیال سے کہ حضرت کچھ
ارشاد فرمائیں اور لوگ مستفید ہوں) سوال کیا کہ حضرت صبر کی حقیقت کیا ہے؟ حضرت نے
بڑی بے تکلفی سے راقم کی طرف اشارہ کیا کہ مجھے تو معلوم نہیں ان سے پوچھو! میں نے
اپنے نزدیک بڑی کسرِ نفسی اور تواضع سے کام لیتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو اس کے لغوی
معنی کے سوا کچھ معلوم نہیں، نہایت سادگی اور اطمینان سے فرمایا کہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں!
مجلس پر سناٹا چھا گیا، حضرت کو اس کا احساس نہیں معلوم ہوتا تھا کہ مجلس کے خواص حضرت
کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے، جن کو علماء و عمائد کے ایک بڑے گروہ نے اپنا شیخ و مربی
تسلیم کر رکھا ہے۔

ایک مرتبہ لائل پور کے دوران قیام میں اس بارے میں خدام و احباب کے درمیان
بڑی کشاکش تھی کہ حضرت رمضان کہاں کریں، لائل پور کے اہل تعلق لائل پور کے لئے کوشاں
تھے لاہور کے احباب لاہور کے لئے مُصر تھے اور قریشی صاحب وغیرہ راولپنڈی کے لئے
عرض کرتے تھے، حضرت نے ایک روز سحور کے وقت تینوں گروہوں کے خاص خاص اشخاص
کو بلایا اور فرمایا کہ بھائی دیکھو میں ایک غریب کاشتکار کا لڑکا ہوں، میرے گھر میں ایسی غربت تھی
کہ میں جب طالب علمی میں آیا کرتا تھا تو میری والدہ کو فکر ہوتی تھی کہ گیہوں کی روٹی کا انتظام
کس طرح کریں؟ عجمی بھی ہوں، اور کچھ زیادہ پڑھا نہیں، پھر جو کچھ پڑھا تھا وہ بھی بھول

گیا، اب تم جو مجھے کھینچے کھینچے پھرتے ہو اور کوئی ادھر لے جانا چاہتا ہے کوئی ادھر تو یہ محض اس کی برکت ہے کہ کچھ روز اللہ کا نام لیا، تم خود اخلاص کے ساتھ چند روز اللہ کا نام کیوں نہیں لیتے کہ خود مطلوب بن جاؤ، یہ تقریر کچھ ایسی سادگی اور اثر کے ساتھ فرمائی کہ بعض حضرات کی آنکھوں میں آنسو آگئے،

لکھنؤ سے بریلی جاتے ہوئے سفر میں مجھ سے فرمایا کہ آپ لوگ اہل علم ہیں، آخر آپ نے مجھے کیوں آگے کر دیا اور کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں، ایک مسترشد خادم کو جو اپنی حقیقت اور احتیاج سے کسی قدر واقف تھے، اس کا جو جواب دینا چاہیئے تھا وہ عرض کیا گیا۔

ایک مرتبہ آزاد صاحب نے حضرت کو مخاطب کر کے ایک غزل کہی جس کا مقطع تھا۔

یہ کیا ستم ہے کہ آزاد تیرے ہوتے ہوئے
ہے میکدہ میں بھی اور تشنہ کام ہے ساقی

یہ شعر سن کر فرمایا کہ بھائی میرے پاس تو پانی بھی نہیں، یہ شعر تو شیخ الحدیث کو سنانا یہ دراصل حضرت کا حال تھا جس میں کسی تصنع یا مصلحت بینی کا دخل نہیں تھا، بداہۃً اور وجدانی طور پر اپنے کو ہر کمال سے عاری سمجھتے تھے اور اہل نظر کے نزدیک یہ مقام ہزار کراماتوں اور ہزار علوم و معارف سے ارفع ہے۔

بے نفسی اور فنائیت کا ایک واقعہ جو میرے نزدیک سیکڑوں مجاہدات اور صدہا کرامات سے بھی بلند اور بیش قیمت ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے اس واقعہ سے اندازہ ہوگا کہ حضرت کی طبیعت وقتی تاثرات و جذبات سے کس قدر غیر متاثر واقع ہوئی تھی اور آپ کا مزکی نفس بے نفسی اور فنائیت کے کس درجہ پر پہونچ گیا تھا اور آپ کی طبیعت میں کس درجہ وضعداری

بناہ کی قوت اور حق شناسی تھی۔

وفات سے تین چار ماہ قبل کا واقعہ ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وہ خادم جو ساری عمر خانقاہ کے کھانے وغیرہ کے ذمہ دار رہے۔ بوجہ اپنی علالت کے انکی بیوی نے اپنے لڑکے کے ذریعہ معذوری ظاہر کر دی جس پر حضرت کے کچھ فرمائے بغیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنے گھر میں کھانے کا انتظام کیا، حضرت نے بالکل سکوت فرمایا اس کے بعد منتظمین نے ان کے خلاف بہت شکایات کیں، کھانا اچھا نہیں ہوتا، روٹی کچی ہوتی ہے۔ کبھی نمک غائب، مہمانوں کو تکلیف ہوتی ہے غرض کہ اس طرح کی بہت سی باتیں انھوں نے کہیں۔ گویا وہ چاہتے تھے کہ بہت اچھا ہوا کہ انھوں نے استعفیٰ دیدیا۔ حضرت سے انھوں نے کہا کہ یہ منجانب اللہ ہوا ہے ہم چاہتے بھی یہی تھے، لیکن ان سب کے کان بھرتے کے باوجود حضرت نے سکوت اختیار فرمایا کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا، صرف ایک مرتبہ ان شکایات کے جواب میں ایک عام بات یہ فرمائی کہ "بھائی اصل میں ایک کام جب بہت دن تک کیا جاتا ہے تو اس میں اتنا اہتمام نہیں رہتا اور ایسی باتیں ہو ہی جاتی ہیں"۔

بہر حال دوسرے دن حضرت نے انکو دوسری کوٹھی سے بلوایا، مگر وہ آئے نہیں، کئی گھنٹے کے بعد پھر بلوایا پھر بھی نہیں تشریف لائے ظہر کے بعد پھر وہ شکایات کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً آدمی بھیجا اب کی وہ تھوڑی دیر کے بعد آگئے کمرہ خالی کر دا یا گیا۔ چارپائی کی پشت پر حضرت کے بھائی مولانا عبدالوحید صاحب تشریف رکھتے تھے، حضرت

استغراق میں تھے جب وہ آئے تو حضرت نے فرمایا کون ہے؟ انھوں نے کہا ظفرالدین فرمایا آ گئے؟ تمہارا کیا حال ہے؟ انھوں نے اپنا حال بتایا اور ڈاکٹر کے دکھانے کا ذکر کیا۔

حضرت نے ارشاد فرمایا مجھے تمہاری بیماری کی بہت فکر ہے اللہ تعالیٰ تمہیں صحت عطا فرمائے میں بہت معذور ہوں، چل نہیں سکتا ورنہ دن میں کئی مرتبہ تمہاری خدمت میں آتا، اگر تکلیف کی وجہ سے نہیں آسکتے ہو تو اپنے لڑکے بشیر احمد کے ذریعہ اپنی خیریت کہلوا دیا کرو دوا بھی تو تمنے خریدی ہوگی؟ جب ڈاکٹر کے پاس گئے تو کچھ پیسے تو لے جاتے انھوں نے جواب دیا کہ حضرت دس روپے لے گیا تھا اور دوا اتنے ہی میں آئی اسکے بعد حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میری واسکوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالو (اس میں اس وقت ۳۔۴ روپیہ تھے) اور فرمایا کہ یہ رکھ لو دوائی وغیرہ میں کام آئیں گے۔ اس کے بعد فرمایا کہ دوسری جیب بھی تو دیکھو اس میں بہت بڑی رقم تھی فرمایا کہ یہ بھی رکھ لو انھوں نے کچھ تکلف کیا حضرت نے فرمایا کہ اور بھی بہت سے خرچ ہیں اسکو رکھ لو، اللہ کا شکر کرو۔ یہ محض میرے مالک کا فضل ہے جب وہ رقم لیکر واپس جانے لگے تو حضرت نے پھر آواز دی اور ارشاد فرمایا۔ تم نے ہمارا کھانا پکانا کیوں چھوڑ دیا؟ تین چار مہینہ کی بات تھی میں تو چاہتا تھا کہ تمہارے ہی ہاتھ سے کھاتے انھوں نے اپنی اور اپنی اہلیہ کی بیماری کا ذکر کیا۔ حضرت نے فرمایا تمہارے تین بچیاں ہیں، انھوں نے عرض کیا کہ وہ چھوٹی بچیاں ہیں، حضرت نے فرمایا ہم تو چاہتے ہیں کہ تمہارے ہی ہاں کھائیں چاہے جیسا بھی ہو کچا ہو پکا ہو

بے نمک ہو جس طرح کا بھی ہو۔ اگر تم اور تمہارے گھر والے نہ کر سکیں تو ایک .....

... ملازمہ رکھ لو ان کا خرچ انشاءاللہ میں دونگا اس کو مجھ سے لے لیا کرو کسی کو خبر نہ ہو

لیکن پکے تمہاری ہی نگرانی میں، انھوں نے کہا کام کرنے والی کوئی عورت اچھی

ملتی نہیں، حضرت نے فرمایا کہ تمہیں اچھی نہیں ملتی تو میں بھائی فضل الرحمٰن سے

ہی کہتا ہوں وہ انتظام کردیں گے۔ انھوں نے کہا کہ سوچ کر بتاونگا اسی درمیان

میں یہ بھی فرمایا کہ تمہارے پاس چاول کی بوریاں بھی تو آئی تھیں اس میں سے ایک

بوری چاول علی میاں کے لئے ہمیں چاہئے اسکے بعد وہ چلے گئے اسکے بعد حضرت نے

کچھ نہیں لیا

دوسرے تیسرے روز بہت بڑی تعداد میں ہدایا و تحائف اور رقمیں آئیں

حضرت کی جیبیں تو روپیہ سے بھر ہی چکی تھیں پوری چارپائی بھی نوٹوں سے اٹ

گئی، اپنے بڑے رومال میں ان سب روپیوں کو اکٹھا کرکے باندھ لیا اسکے بعد

حاجی ظفرالدین صاحب کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ "اسکو خوب مضبوطی سے اور

کس کر باندھو تاکہ زیادہ بڑی نہ معلوم ہو اور لیجاؤ" کھانے کے سلسلہ کی کوئی بات

نہیں فرمائی۔ (روایت مولانا عبدالوحید صاحب)

زہد و توکل اور بذل و سخا

حضرتؒ نے اس دورِ انحطاط و مادیت میں مشائخ متقدمین اور گزشتہ عہد کے اصحاب یقین کے زہد و توکل کی یاد تازہ کردی، آپ کو دیکھ کر اور آپ کی صحبت میں کچھ رہ کر ان کے ان واقعات کی تصدیق ہوجاتی تھی، جو اس زمانہ کے ناآشنا اور ظاہر بیں اشخاص کو مبالغہ آمیز اور مشکوک معلوم ہوتے ہیں، یہاں آکر مال و دولت اور روپیہ پیسہ کی حقیقت کھل جاتی تھی اور صاف نظر آتا تھا کہ وہ اس مرد خدا کی نظر میں کنکریوں اور

سنکیوں سے زیادہ نہیں، یہاں نہ کسی امیر کا اعزاز تھا، نہ اس کی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کا تذکرہ، بعض مرتبہ وزرائے حکومت آتے اور چلے جاتے، کبھی مخصوص خدام سے بھی (جو بعد میں آتے) ان کی آمد کا تذکرہ تک نہ فرماتے، ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ اس طرح استقبال و وداع ہوتا جو بڑے بڑے وزراء و امراء کو نصیب نہیں لیکن ایک جگہ کے استقبال یا وداع کا دوسری جگہ ذکر بھی زبان پر نہ آتا، معلوم ہوتا کہ یہ سب تماشہ ہے یا یہ سب اعزاز کسی دوسرے کا ہو رہا ہے، کار کے سفر میں کاروں کا ایک کارواں پیچھے ہوتا لیکن معلوم ہوتا کہ اس سب اعزاز و احترام سے بے تعلق اور علیحدہ کسی اور حقیقت پر نگاہ جمی ہوئی ہے۔

سب سے مایوس اور سب سے مستغنی تھے مگر چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا ایسا تکفل ہوتا کہ عقل ظاہر بیں انگشت بدنداں رہتی، دوائیں انگلستان تک سے آتیں، موسم کے پھل اور میوے اور خاص طور پر جن کی حضرت کو غذا یا دوا میں ضرورت ہوتی، وہ سہارنپور و دہلی اور پاکستان تک سے بڑے اہتمام سے آتے اور اتنے جمع ہو جاتے کہ ان کا ختم کرنا مشکل ہو جاتا، اکثر دیکھا گیا کہ ادھر حضرت کو معالج نے کوئی پھل بتایا، ادھر کوئی خادم بڑی مقدار میں نذر لے آیا، اور اس کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا، ایک خادم(۱) اپنا مشہور واقعہ لکھتے ہیں:۔

"آموں کی فصل تھی کثرت سے آم مہمانوں کو بھی تقسیم ہوا کرتے تھے، ایک بار فرمایا اب تو انگور ہوتے، یہ بات کھانے کے بعد فرمائی تھی، ظہر میں جو مہمان آئے وہ انگور لے کر آئے اور پھر انگوروں کا اتنا سلسلہ شروع ہوا کہ انگور بھی آموں کی طرح تقسیم ہوتے تھے۔

ایک بار فرمایا کہ اللہ نے مجھ پر اتنی رزق میں وسعت فرمائی ہے کہ اگر چاہوں تو مہمانوں کو مرغ پلاؤ روزانہ کھلاؤں"۔

(۱) صوفی انعام اللہ لکھنوی۔

ایک مرتبہ رائے پور سے پاکستان کے لئے روانگی ہوئی سہارنپور میں فرمایا کہ غلطی ہوئی، موم نہیں لے لیا، پاکستان میں دقت سے ملتا ہے، موم روغن کی ضرورت ہوگی، کچھ ہی دیر کے بعد دیکھا گیا کہ ایک شخص بہت سا موم لئے چلا آرہا ہے اور نذر کر رہا ہے۔ (۱)

اسی سلسلہ کا ایک اور واقعہ جو مولانا عبدالوحید صاحب بیان کرتے ہیں قابل ذکر ہے مولانا کہتے ہیں۔

"ایک صاحب اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں، ابتدا میں حاضری ہوئی۔ ان دنوں حضرت اپنے گھر جانے کی تیاری فرمادی تھی دیکھا تو جیب میں ایک پیسہ نہیں اور اتنے طویل سفر کی تیاری ہورہی ہے اور جو اللہ تعالیٰ بھیجتے ہیں وہ سب ارباب حوائج میں تقسیم فرمادیتے ہیں، سفر کے بیچ میں ایک دن رہ گیا ہے میں دیکھ دیکھ حیران ہوں کہ اسی طرح تقسیم فرماتے رہے تو آخر سفر کیسے ہوگا، دوپہر کے وقت بہت سے مہمانوں ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ گاؤں سے بھائی فضل الرحمٰن خانصاحب آئے اور حضرت کے کان میں عرض کیا میں پاس کھڑا سن رہا تھا" ایک منی آرڈر بمبئی سے ۵۴ روپیہ کچھ آنے کا آیا ہے بھیجنے کا پتہ میں جانتا نہیں حضرت نے فرمایا میں بھی نہیں جانتا حضرت کا معمول تھا کہ ایسے منی آرڈروں کو واپس فرمادیتے تھے مگر اس موقع پر فرمایا کہ اسکو رکھ لو، اللہ تعالیٰ نے ہمارے سفر کے لئے انتظام فرمایا ہے اسکے بعد فرمایا کہ حساب لگاؤ کہ انٹر کا کرایہ میرا اور میرے ساتھی کا ڈھڈیاں تک کیا ہوگا، انھوں نے جوڑ کر بتایا کہ ٹھیک ۵۴ روپیہ کچھ آنے ہی ہوتے ہیں حضرت نے یہ فرما تو دیا لیکن اس رقم کا رکھنا بھی طبیعت پر بار ہونے لگا چنانچہ سہارنپور پہونچ کر

---

(۱) روایت آزاد صاحب۔

وہ بھی کسی ضرورت مند کو عنایت فرمادیا۔

اسی سلسلہ کا ایک عجیب وغریب واقعہ جو خدا کے مقبول بندوں کے حالات اور ان کے ساتھ خدا کی مسبب الاسبابی کا جو معاملہ ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اس کے پیش نظر تو عجیب وغریب نہیں لیکن ظاہری نگاہ اور روزمرہ کے واقعات کے لحاظ سے ضرور عجیب ہے مولانا عبدالوحید صاحب کی زبانی سننے میں آیا۔

مستری احمد حسن صاحب[1] اور حافظ محمد ابراہیم صاحب[2] وغیرہ احباب دہرہ دون کا معمول تھا کہ اکثر ہفتہ میں کسی شام کو موٹر پر رائے پور آجاتے اور رات وہاں رہ کر اگلے دن دہرہ دون واپس ہوجاتے ایک مرتبہ وہ ایسے ہی دہرہ دون سے رائے پور آرہے تھے کہ انکو راستہ میں بیچ سڑک پر ایک سیاہ سا جانور کھڑا نظر آیا قریب ہی جنگل اور جنگلی جانوروں کی شکارگاہ ہے اسلئے پہلے انکو یہ خیال آیا کہ کوئی شیر یا تیندوا وغیرہ ہوگا باوجود ہارن بجانے کے وہ راستہ سے نہ ہٹا، آخر کار انھوں نے موٹر روکی اور قریب جاکر دیکھا تو ایک نیل تھا اسکو انھوں نے پھر ہٹانے کی کوشش کی تاکہ راستہ صاف ہو اور موٹر چلے لیکن وہ اڑا کھڑا رہا اور وہاں سے نہ ہٹا، انکے پاس شکار کا کوئی سامان نہ تھا، یہاں تک کہ کوئی چھرا چاقو بھی نہ تھا انھوں نے کچھ دیر انتظار کیا کچھ ہی دیر کے بعد ایک دوسری موٹر یا ٹرک آیا، اسکی سواری میں سے کسی کے پاس چاقو تھا انھوں نے وہ چاقو لیا اور اسی نیل کو حلال کیا۔ وہ گویا اسی کے لئے کھڑا تھا انھوں

---

(۱) مستری احمد حسن صاحب حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ سے بیعت ہیں حضرت سے بھی بڑا تعلق رکھتے تھے اور اس برادرانہ رشتہ کی وجہ سے حضرت کو بھی ان سے بہت انس و تعلق تھا دہرہ دون میں موٹروں وغیرہ کی مرمت کا کام کرتا تھے حضرت اکثر مسوری سے آتے جاتے انکے ہاں ٹھہرتے تھے، ذاکر شاغل اور خوش اوقات بزرگ ہیں (۲) حافظ محمد ابراہیم کا عرصہ سے دہرہ دون میں بھٹے کا کاروبار تھا انکو بھی حضرت سے بہت تعلق تھا۔

نے اسکو موٹر پر لادلیا، اور رائے پورے آئے حضرت کو جب یہ قصہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ
اللہ کا بڑا فضل ہے میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کل فلاں فلاں بزرگ تشریف
لائے ہیں[1] ہمارے پاس گوشت نہیں ہے۔ کاش کہیں سے گوشت آجاتا اللہ تعالیٰ نے یہ سامان کیا

ادھر غیب سے ضرورت کی اشیاء کی آمد تھی، ادھر ان کا فوری صرف، روپیہ کا رات کو
رکھنا اور اس پر رات کا گزرنا طبیعت پر بڑا بار تھا، خدام جو کچھ پیش فرماتے تھے فوراً دوسرے
خدام مقیمین خانقاہ اہل حاجت اور آنے والوں کو پیش کر دیتے، حاجی فضل الرحمٰن خاں کہتے
ہیں کہ صرف میرے ہاتھوں سے کئی لاکھ روپئے حضرت نے دوسروں کو دلائے ہیں، بعض اہل علم
کو کرایہ کے نام سے سوسو دو دو سو کی رقم عطا فرمانے کا عام دستور تھا، کبھی ان کی آمد پر بڑی شفقت
سے فرماتے کہ میں تو بہت دن سے تمہارا انتظار کر رہا تھا اور تمہارے لئے رقم رکھے ہوئے تھا
پھر فوراً کچھ عنایت فرماتے، ایک خادم جو سفر حج میں ساتھ تھے حجاز سے مصر و شام چلے گئے
تھے، ان کے ایک رفیق کو ایک ہزار کی رقم عنایت فرمائی اور فرمایا کہ ان کو بھیج دو اور لکھ دو کہ تمہاری
صحت بحری سفر کی متحمل نہیں، تم ہوائی جہاز سے سفر کرنا[2] میں نے خود دیکھا ہے کہ بعض اوقات
منی آرڈر سے کوئی معتدبہ رقم آئی، وصول کرتے ہی کسی کے حوالہ فرما دی، جو لوگ اس عادت
سے واقف تھے وہ ایسے موقع پر موجود رہنے سے احتیاط کرتے تھے۔

صوفی محمد حسین صاحب لکھتے ہیں:۔

"مولانا عبداللہ صاحب دھرم کوٹی نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ لاہور میں صوفی
عبدالحمید صاحب کی کوٹھی پر حضرت والا قیام پذیر تھے، دوپہر کا وقت تھا اور سب لوگ

(۱) اس موقع پر جہاں تک راقم کو یاد ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب اور حضرت شیخ الحدیث کا نام لیا ممکن ہے
مولانا عاشق الٰہی صاحب بھی ساتھ ہوں۔ (۲) روایت مولانا منظور صاحب نعمانی۔

سو رہے تھے، میں ساتھ کے کمرہ میں تھا، حضرت چارپائی پر آرام فرما رہے تھے لیکن بیدار تھے اور سب خدام سوئے ہوئے تھے، ایک نووارد آئے حضرت سے ملے اور کچھ نذرانہ پیش کرکے رخصت ہوگئے، حضرت نے ان کے جانے کے بعد فرمایا "ارے بھائی کوئی ہے" چونکہ خدام سب سوئے ہوئے تھے صرف ایک صاحب پاس بیٹھے ہوئے تھے (جن کا نام مولانا نے مصلحتاً نہیں بتایا) انھوں نے حضرت کی بات کا جواب دیا، فرمایا یہاں آؤ دیکھو یہ کیا ہے؟ انھوں نے دیکھ کر بتلایا کہ حضرت مبلغ سات سو پینتیس روپے ہیں، فرمایا اچھا ان کو جیب میں ڈال لو، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے ضرورت نہیں ہے، مجھ پر اللہ کی مہربانی ہے، اور میں اس کے لئے حضرت کی خدمت میں حاضر بھی نہیں ہوا، فرمایا "اجی بس ڈال بھی لو، کہیں کام آجائیں گے"(۱)

محمد اختر صاحب (نومسلم) بیان کرتے ہیں کہ:۔

"ایک دفعہ مجمع لگا ہوا تھا، بہت سے حضرات بیٹھے تھے کسی شخص نے مصافحہ کرتے وقت بے تکلف عرض کیا: "حضرت دس روپیہ کی ضرورت تھی" حضرت نے فرمایا اللہ سے دعا کرو، پھر خاموش ہوگئے، تھوڑی دیر میں ایک شخص آیا اور سو روپیہ کا نوٹ حضرت کے ہاتھ پر رکھا، حضرت نے آواز دے کر فرمایا "ارے بھائی وہ شخص کہاں گیا جو دس روپیہ مانگ رہا تھا" وہ بولا، جی حضرت بیٹھا ہوں، فرمایا "لے یہ دس روپیہ" اس نے عرض کیا حضرت یہ تو سو روپیہ ہیں، فرمایا "لے جا تیری موج ہوگئی"

رقم کی مقدار اور تعداد میں ان حضرات کے نزدیک کوئی فرق اور اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی بعض مرتبہ حقیر سی رقم قبول اور بعض مرتبہ بڑی رقم واپس فرما دیتے، مولانا منظور صاحب بیان

(۱) روایت آزاد صاحب۔

کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے سامنے دو منی آرڈر آئے، ایک پانچ کا تھا، ایک نوٹے کا پانچ کا قبول فرمالیا، نوٹے والے کو یہ کہہ کر واپس فرمایا کہ میں انھیں پہچانتا نہیں ہوں۔

رائے پور کا دسترخوان بہت وسیع تھا، بالعموم ۵۰۔۶۰ اور بعض دنوں میں کئی کئی سو آدمی مہمان ہوتے، دسترخوان اگرچہ بالعموم سادہ ہوتا اور حضرت اس سادگی اور اہل خانقاہ اور اہلِ ذکر کے لئے جفاکشی اور سادہ غذا کو پسند فرماتے اور تکلفات و تنعم کو ان لوگوں کے لئے مضر سمجھتے جو اپنی اصلاح و تربیت کے لئے آئے ہوئے ہیں، پھر بھی اس میں تنوع اور تکلف ہوتا رہتا، خصوصاً خصوصی مہمانوں کی آمد کے موقع پر تو بہر وقت ایسا تنوع ہوجاتا کہ بڑے بڑے امراء کے یہاں دیکھنے میں نہ آتا۔

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی لکھتے ہیں:-

"اب سے چار پانچ سال پہلے کی ایک دن کی بات ہے ہم دونوں (یعنی عاجز اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) بھی حاضر تھے، لگ بھگ سَو مہمان ہوں گے، دسترخوان پر خود میں نے گنا چار قسم کی تو کھیر تھی، تین قسم کی مچھلیاں تھیں، گوشت بھی کئی قسم کا تھا، یہ سب قرب و جوار کے دیہات کے حضرت ؒ کے محبین و مخلصین حضرت ؒ کے مہمانوں ہی کی نیت سے خود اپنے گھروں سے پکوا کر لے آتے تھے اور رائے پور کے خوش نصیب بھائی تو روزانہ ہی اپنے گھروں سے ناشتہ دانوں میں بھر بھر کے کئی کئی قسم کے کھانے لاتے تھے ___ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" کا یہ ظہور ادھر چند برسوں سے مسلسل ہو رہا تھا ___ حق یہ ہے کُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ___ لیکن یہ سب کچھ اس دور میں ہوا جب حضرت اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے خود اس میں سے کچھ بھی نہیں کھا سکتے تھے۔"

حضرت شیخ الحدیث کی آمد پر جتنا تکلف واہتمام ہو حضرت کو بجا اور برمحل معلوم ہوتا تھا، اسکا سامان بھی اللہ تعالیٰ بروقت اور غیب سے فرماتا اور اس کے لئے کبھی کسی تردد کی ضرورت نہ ہوتی، غرض انھیں اہل توکل ویقین کو دیکھ کر آیت قرآنی وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسۡبُہٗ اور مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا وَّیَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ کی تصدیق وتفسیر ہوتی۔

مقبولیت ومحبوبیت دین سے استغنا معاشی بحران ودنیا پرستی کے اس دور میں آپ کی ذات کی طرف ایسا رجوع ہوا اور محبین ومعتقدین کا ایسا ہجوم ہوا جس سے مسلمانوں کے عہدِ عروج اور دینداری وخدا طلبی کے دور ترقی کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آگئی، آپ کہیں ہوں گاؤں میں یا شہر میں، ہندستان میں یا پاکستان میں، اہل طلب و اہل ارادت آپ کی ذات کو گھیرے رہتے تھے اور بغیر کسی اعلان واشتہار کے پروانہ وار جمع ہوجایا کرتے تھے، غالباً ۱۹۵۸ء میں آپ پاکستان جانے کے لئے رائے پور سے روانہ ہوکر گانگروں والی کوٹھی پر بہٹ میں مقیم تھے، یہ جگہ آبادی سے باہر نہر کے کنارے الگ تھلگ ہے راقم لکھنؤ سے رخصت کرنے کے لئے حاضر ہوا تو دیکھا ایک میلہ سا لگا ہوا ہے، ناواقف آدمی دیکھتا تو سمجھتا کہ واقعی کوئی میلہ ہے روانگی کے وقت مصافحہ وسلام کرنے والوں کا ایسا ہجوم ہوا کہ بڑی مشکل سے آپ کی راحت اور باطمینان روانگی کا انتظام کیا جاسکا، مولانا اکرام الحسن صاحب کاندھلوی نے اس منظر کو دیکھ کر کہا۔

حسن کی جنس خریدار لئے پھرتی ہے
ایک بازار کا بازار لئے پھرتی ہے

یہی پاکستان میں حال ہوتا، کہیں تشریف رکھتے کئی کئی سو کا مجمع حاضر رہتا، وسیع کوٹھیوں کا

چپہ چپہ ذکر کرنے والوں اور دُور دُور سے آنے والوں سے آباد و معمور ہوتا، آپ کی ذات نے ثابت کردیا کہ زمانہ کے انقلاب کا بہانہ ہے، اخلاص و کمال کہیں مخفی و مستور نہیں رہ سکتے، جہاں گل ہوگا وہاں بلبل اور جہاں شمع ہوگی وہاں پروانے ضروری ہیں۔

محبت و شفقت حضرت کی زندگی اور اپنے خدام و اہل تعلق کے ساتھ تعلق میں جو ادا سب سے زیادہ نمایاں اور روشن تھی وہ حضرت کی غیر معمولی محبت و شفقت تھی، جسکو بعض خدام (جنکو اس محبت کا تجربہ ہوا تھا) شفقت مادری سے تعبیر کرتے تھے اور اس کیلئے اس سے بہتر الفاظ اور تشبیہ نہیں ملتی، اس شفقت کو دیکھ کر زمانہ سابق کے شیوخ کاملین (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ وغیرہ) کی شفقت کے واقعات یاد آتے تھے اور اسکی تصدیق ہوتی تھی کہ ان کے خدام اگر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے دھوپ میں کھڑے ہوتے تھے تو فرماتے تھے کہ سایہ میں آجاؤ، دھوپ میں تم کھڑے ہو اور جلا میں جا رہا ہوں، ان کے دسترخوان پر لوگ کھانا کھاتے تو فرماتے کہ تم کھاتے ہو اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کھانا میرے حلق میں جا رہا ہے اور اندازہ ہوتا تھا کہ جب ان حضرات کی شفقت کا یہ حال ہے تو انبیاء علیہم السلام اور سیدالانبیاء علیہ السلام (عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ) کی رافت و شفقت کا کیا عالم ہوگا ؟ !

حضرت کی یہ ادا اور مزاج اتنا نمایاں اور ان کی زندگی اور اخلاق و معاملات پر اتنا غالب اور حاوی تھا کہ کوئی خادم بھی جس سے حضرت کو کچھ تعلق ہوا اسکی لذت و حلاوت سے ناآشنا نہیں رہ سکتا تھا اور وہ بلا تصنع کہتا تھا کہ حضرت کی شفقت نے ماں باپ کی شفقت کو یاد دلا دیا اور بہت سے لوگ تو اس پر بھی ترجیح دیتے تھے، حضرت کے ایک مسترشد اس شفقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"حضرت ایسے شفیق تھے کہ ماؤں کی شفقتیں ان پر قربان، میں نے اپنی باون سالہ عمر، ۲۰ سالہ تعلق میں نہ کسی کی ماں اور نہ کوئی استاد، نہ کوئی دوست، نہ کوئی بزرگ ایسا مہربان دیکھا، مہمانوں میں سے اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو حضرت کو تمام رات نیند نہیں آتی تھی"(۱)۔ اس ڈر کی وجہ سے خدام کسی مہمان کے بہت زیادہ بیمار ہونے کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔

حضرت کے ملنے والے تمام حضرات فرداً فرداً یہ سمجھتے تھے کہ حضرت کو جتنی مجھ سے محبت ہے اوروں سے نہیں، سب سے زیادہ محبت مجھی سے ہے آپ کے اندر کوئی ایسی بجلی کی سی محبت تھی کہ جتنا بھی کوئی مصیبت زدہ اور فکر مند ہوتا حضرت کو دیکھ کر تمام کلفتیں دور ہو جاتیں، بہت سے جو لوگ پیدل چل کر جاتے یا جھاوریاں سے جوڑھڈیاں یا پیادہ جاتے ان میں بوڑھے اور امیر لوگ ہوتے جو بیچارے بالکل تھک جاتے، بس حضرت کو دیکھتے ہی تمام تکان دور ہو جاتا، یہ خود میرا بارہا کا تجربہ اور مشاہدہ ہے"(۲)

ایک دوسرے صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں نے اپنی تمام عمر میں ایسا شفیق شخص نہیں دیکھا، کوئی شخص اپنے بیٹوں سے اتنی محبت نہیں کر سکتا جتنی حضرت ہم لوگوں کے ساتھ کیا کرتے

(۱) مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی لکھنؤ کے زمانۂ قیام مرکز میں درد گردہ میں مبتلا ہوئے، حضرت کو ان کی وجہ سے سخت بے آرامی و بے چینی تھی، بعض مرتبہ آپ خاموشی سے اٹھ کر ان کی جائے قیام پر تشریف لے جاتے اور ان کا حال دیکھتے، ہر طرح کے علاج و تدابیر کا اہتمام فرماتے۔

(۲) مکتوب مولانا سعید احمد صاحب (ڈونگہ بونگہ) ضلع بھاول نگر،

تھے، ایک دفعہ کھانے کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرتؒ نے کچھ بھی نہ کھایا، حضرتؒ نے کمال شفقت سے فرمایا کہ تم کھاتے ہو تو میں ہی کھاتا ہوں۔(۱)

مولانا محمد صاحب انوری تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب میں حضرت اقدس کے حکم سے (تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں) جیل گیا تو حضرت سرگودھا سے میرے گھر (لائل پور) تشریف لائے اور بچوں کو تسلی تشفی دیتے رہے، فرمایا میں فقط تم سے ملنے کے واسطے آیا ہوں، ملک واحد بخش صاحب نے کہا کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، وہ تو حضرتؒ کے حکم کی دیر تھی، حکم ہوا فوراً جیل چلے گئے، اس پر حضرت اقدس پر بہت رقت طاری ہو گئی، فرمایا وہ پہلے بھی میرے ہی کہنے پر ڈھاکہ تبلیغ پر چلے گئے تھے، وہاں بھی ہم نے ہی بھیجا تھا"(۲)

مولوی محمد یحییٰ صاحب بھاول نگری اپنی پہلی حاضری اور حضرت کی شفقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حضرت نورا رتہ تشریف لائے ہوئے تھے، احقر بھی والد ماجد کے ساتھ چلا گیا، والد صاحب نے پہلے مصافحہ کیا، حضرت نے فوراً احقر کا نام لے کر دریافت فرمایا کہ برخوردار نہیں آئے؟ والد صاحب نے عرض کیا آیا تو ہے وضو کر رہا ہے، اتنے میں احقر بھی حاضر ہو گیا، مجلس بھری ہوئی تھی، حضرت نے بڑی شفقت سے مصافحہ فرمایا، اور بڑی ہی محبت فرمائی، حتیٰ کہ فرمایا برخوردار تم تو میرے پاس ہی بیٹھ جاؤ، میں تعمیل ارشاد میں بیٹھ گیا، حضرت والد صاحب اور نانا صاحب کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ برخوردار کا میرے

(۱) مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب ایم۔اے۔ (۲) تحریر مولانا محمد صاحب انوری

پاس خط آیا تھا کہ میرے فلاں فلاں سبق ہیں میرے لئے دعا کریں اور میری اصلاح کرنی آپ پر واجب ہے ورنہ قیامت کے دن دامن گیر ہوں گا، تو میں نے بڑا غور کیا کہ یحییٰ نام کا کون لڑکا ہے؟ آخر خیال آیا اور ہو یہ تو حضرت بھاول نگری رحمۃ اللہ علیہ کا پوتا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ الحمد للہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد دین کی طرف تو چل نکلی ....

پھر تقریر ہوتی رہی جو تقریر فرماتے اس کا خطاب مجھ کو فرماتے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی مجلس سے الگ ہوتا تو فوراً بلا لیا جاتا، نماز کے وقت پر حاضری میں دیر ہو جاتی تو فوراً یاد فرماتے اور اپنے برابر ایک ہی چارپائی پر بٹھلاتے احقر کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جیسے کہ اپنے بڑے محسن سے کیا جا سکتا ہے ....

پھر فرمایا کہ جس پر کوئی اتنا خوش ہوتا ہے تو وہ انعام بھی دیا کرتا ہے، مجھے اتنی خوشی ہے کہ برخوردار کو انعام دیا جائے، اس کے بعد آپ نے اپنی جیب سے پچاس روپیہ نکال کر عنایت فرمائے، والد صاحب سے فرمایا دیکھو یہ رقم برخوردار کی ہے اسی پر خرچ کرنی ہوگی، کھانے پینے کی جو چیز آتی اسی وقت مجھے اپنے ساتھ بلا کر کھلاتے اور فرماتے بھائی یہ تو برخوردار کے لئے ہے اور مجھ سے فرماتے برخوردار خوب کھاؤ۔"(۱)

حضرت کے ایک خادم صوفی محمد حسین صاحب لکھتے ہیں:-

"۱۹۵۳ء میں جبکہ احقر دفتر ڈپٹی کمشنر جہلم میں ملازم تھا، حضرت اقدس لاہور سے راولپنڈی تشریف لے جا رہے تھے، جب جہلم سے گزرے تو کار کے

(۱) تحریر مولوی محمد یحییٰ صاحب بھاول نگری،

ڈرائیور سے فرمایا کہ کار کو شہر کی طرف لے چلو، جب شہر پہنچے تو فرمایا کچہری کا راستہ پوچھ کر کچہری کو چلو، چنانچہ کچہری پہنچے اور گراؤنڈ میں کار کھڑی کر کے کار سے باہر اترے، اس وقت صبح کے سات بجے تھے، نو بجے دفتر کھلتے تھے، کوئی آدمی کچہری میں موجود نہ تھا آخر ایک چپراسی ملا، اس سے راقم کے مکان کا پتہ دریافت کیا، اس نے لاعلمی کا اظہار کیا اور بتایا کہ نو بجے دفتر کھلے گا، چنانچہ کچھ دیر کچہری کے میدان میں حضرت والا ٹہلتے رہے اور تقریباً آدھ گھنٹے تک انتظار کر کے راولپنڈی تشریف لے گئے۔

نو بجے جب احقر شہر سے دفتر کو آرہا تھا وہی چپراسی ملا اور کہنے لگا کچہری میں ایک کار میں چند سفید ریش بوڑھے آئے تھے اور تجھے پوچھ رہے تھے، احقر کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ بوڑھے کون لوگ ہوں گے؟ آخر بار بار حلیہ پوچھنے پر یقین ہوگیا کہ حضرت اقدس نے کرم فرمایا ہوگا، اپنی بے نصیبی پر اگرچہ افسوس ہوا لیکن فوری طور پر دفتر سے رخصت لے کر اسی دم احقر راولپنڈی حضرت والا کی خدمت میں پہونچ گیا، جب حضرت کی خدمت میں پہنچا تو حضرت بار بار ہنس کر فرماتے "آج تو ہم نے تمہاری برکت سے کچہری بھی دیکھ لی" احقر شرمندہ ہو کر عرض کرتا کہ سب حضرت کی عنایت ہے، یہ ذرۂ بے مقدار ان نوازشات کے قابل کہاں ہے؟[1]

ایک اور خادم[2] اپنی پہلی حاضری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میری سب سے پہلی حاضری رائے پور جون ۱۹۴۳ء میں ہوئی پہونچتے ہی اور

(۱) مسودہ صوفی محمد حسین صاحب ایم۔ اے (۲) صوفی انعام اللہ لکھنوی۔

پہلی ہی حاضری میں طبیعت پوری طرح سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کھنچ گئی، اور فوراً اندر سے تیز تقاضا بیعت کا پیدا ہوا، میں نے بیعت کا شرف حاصل کیا، حضرت کی طرف سے شفقت اور پیار بڑھا، جو ہمارے محبت و خدمت کے جذبہ میں اضافہ کرتا رہا، دس بارہ روز رہنے کے بعد ہم نے عرض کیا کہ حضرت ہم گھر ہو آئیں؟ حضرت نے عجیب پیار کے انداز میں فرمایا کہ ہم کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ ہم نے عرض کیا کہ نہیں، ہم تو آنے کے لئے جا رہے ہیں غرض لکھنؤ آئے، راستہ بہت مشکل سے کٹا یہاں بھی جی نہیں لگا، صرف ایک ہفتہ میں واپس رائے پور پہونچ گئے، حضرت سے مصافحہ کے لئے حاضر ہوا چند حضرات تشریف فرما تھے، دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا ؎

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ

سیلاب اشتیاقت جان ہا خراب کردہ

فرمایا کہ یہ شعر بابا صاحب (حضرت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ) حضرت سلطان جی (حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ) کے لئے پڑھا تھا، اور بعد میں وہ کامیاب ہوئے، حضرت اقدس کی طرف سے اس قدر شفقت و پیار بڑھا کہ حضرت اقدس کی محبت اندر سما گئی۔"

اگر اس طرح کے ذاتی واقعات جن سے حضرت کی پدری و مادری شفقت اور عنایت خصوصی کا اظہار ہوتا ہے اور مختلف خدام و اہل تعلق ان کو بیان کرتے ہیں نقل کئے جائیں تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے، واقعہ یہ ہے کہ اخلاق و شفقت نبوی کی یہ وراثت مشائخ کبار کو ملتی ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا اور یقین کرتا ہے کہ انہ أکرم علیہ من صاحبہ

(میں دوسرے سے زیادہ معزز و محبوب ہوں)

یہ شفقت اتنی خورد نواز اور دقیقہ رس تھی کہ جن لوگوں سے خصوصی شفقت تھی، ان کی مرغوبات کا بھی اہتمام اور اس کی تاکید بلیغ فرمائی جاتی، پورب کے ایک خادم جو چاول (خشکہ) کے عادی اور شائق ہیں بیان کرتے ہیں کہ میرے لئے ہمیشہ خواہ ہندستان ہو خواہ پاکستان خشکہ کے اہتمام کی تاکید فرمائی جاتی اور میزبان سے دریافت فرماتے کہ ان کے لئے خشکہ بھی تیار کیا ہے؟ ایک روز رمضان مبارک کے آخری عشرہ میں عصر کے بعد کی مجلس تھی، کتاب ختم ہو چکی تھی، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو (جو اس زمانہ میں لنگر کے مہتمم تھے) یاد فرمایا، عرض کیا گیا کہ مولانا گھر پر ہیں، فرمایا بلاؤ، ان کے آنے میں کچھ دیر لگی، دریافت فرمایا کہ آئے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ آدمی بلانے گیا ہوا ہے، یہ اہتمام دیکھ کر ایک صاحب پھر گئے لوگ منتظر تھے کہ حضرت اس اہم وقت میں کون سی اہم بات مولانا سے فرمانے والے ہیں اور کس لئے اس اہتمام کے ساتھ ان کی طلبی اور یاد گاری ہے، مولانا تشریف لائے تو ان صاحب کا نام لے کر فرمایا کہ آپ نے ان کیلئے خشکہ بھی تیار کیا ہے؟ پھر بڑی شفقت سے ہدایات دیتے رہے اور فرماتے رہے کہ خشکہ ضرور تیار کیا جائے اور روٹی بھی ہونی چاہیے اسلئے کہ یہ دونوں چیزوں کے عادی ہیں،

۱۹۵۰ء میں سفر حج میں راقم سطور مکہ معظمہ میں دوستوں اور وہاں کے علماء سے ملنے چلا جاتا یا کسی اجتماع میں شرکت ہوتی، ظہر کے بعد جب حرم شریف سے خلوت میں حاضر خدمت ہوتا تو دیکھتا حضرت کے پاس کھانا رکھا ہوا ہے اور حضرت منتظر ہیں، بڑی شفقت کے ساتھ فرماتے کہ تمھیں تو کھانے کا بھی ہوش نہیں، دیکھو تمہارے لئے یہ روٹیاں رکھی ہیں، یہ کھانا تمھاری صحت کے مطابق ہے۔

ان جزئیات اور واقعات لکھنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس شفقت بے پایاں کا کچھ اندازہ ہو سکے جو خدام و اہل تعلق کے ساتھ تھی۔

ان خصوصی اہل تعلق کے آنے سے بڑے مسرور ہوتے، کبھی فرماتے کہ "تم نے حد کر دی، بڑا انتظار کرایا" کبھی کسی سے رخصت ہونے پر فرماتے "دیکھئے اب کب نصیب ہوتے ہیں"۔ ایک خادم کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ مرادآباد سے رخصت ہونے لگا، مولوی جلال الدین صاحب سے فرمایا کہ اسٹیشن جاکر گاڑی پر سوار کرانا اور سیکنڈ کلاس[1] کا ٹکٹ خرید دینا، خود بدولت سیر کو تشریف لے گئے، کچھ دیر کے بعد تشریف لے آئے چلتے وقت دیکھا تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں، تحمل و ضبط کہتا ہے کہ ٹپکنے نہ پائیں اور محبت کہتی ہے کہ کیا حرج ہے؟!

والدمع بينهما عصيٌّ طيّعٌ[2]

نومسلموں سے خصوصی تعلق اور شفقت

ان سعید روحوں سے جو اپنی طلب صادق اور ذاتی جذبہ سے دین حق کو قبول کرتے بڑا خصوصی تعلق رکھتے تھے اور ان پر اولاد کی سی شفقت فرماتے تھے، ان قابل قدر حضرات کی اتنی قدر اور ان سے اتنی محبت کرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا، مولانا حبیب الرحمن صاحب رائے پوری[3] اور اختر صاحب کے ساتھ آپ کا معاملہ نہایت شفیق باپ اور بڑے

---

(۱) جو آجکل فرسٹ کلاس کہلاتا ہے (۲) آنسو ان دونوں احکام اور تقاضوں کے درمیان کشمکش میں مبتلا ہے

(۳) مولانا ایک معزز سکھ زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، پہلا نام بلونید رسنگھ تھا، جنال (جو اب ضلع سنگرور ریاست پٹیالہ میں ہے) کے رہنے والے تھے، فرید کوٹ میں تعلیم پائی، وہیں ۱۹۱۹ء میں مولانا محمد علی صاحب (نڑھر شریف ریاست جے پور) کی تلقین سے مسلمان ہوئے، ۱۹۲۳ء میں حضرت سے بیعت ہوئے اور آنا جانا رہا، ۱۹۳۲ء میں ماہ رمضان میں رائپور مستقل قیام اختیار کیا، ۱۹۳۲ء میں حزب الانصار قائم کی جس کی سرپرستی

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۶۷ پر)

چاہنے والے مربی کا تھا، ان کی دل جوئی ان کے آرام و صحت کا خیال، ان کی ضروریات کا تکفل، ان کی اولاد پر شفقت اور ان کی تعلیم و تربیت و معاش کی فکر، ان کی شادیوں کا اہتمام، غرض محبت کرنے والا باپ، اور سرپرست خاندان جو برتاؤ اپنی محبوب اولاد اور افراد خاندان کے ساتھ کرتا ہے اور ان کے بارے میں اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے وہی برتاؤ حضرت کا ان عزیزوں کے ساتھ تھا جنھوں نے آغوش اسلام میں پناہ لی تھی، اگر کوئی ناواقف شخص حضرت کا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے ساتھ برتاؤ اور رائے پور میں حضرتؒ کے یہاں ان کو جو خصوصیت، اعتماد اور تقرب حاصل تھا دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ یہ یا تو حضرت کے فرزند ہیں یا حقیقی بھتیجے، بھانجے، حضرتؒ کے ایما اور تعلق خصوصی کی بنا پر وہ مولانا اشفاق احمد صاحب کی وفات کے بعد مدرسہ کے متولی مقرر ہوئے، نہ صرف مولانا بلکہ ان کے صاحبزادہ حکیم محب الرحمٰن پر بھی خصوصی شفقت تھی، مولانا کے اگر غیر مسلم بھتیجے کبھی ملاقات و زیارت کو حاضر ہوتے تو حضرت بڑی شفقت فرماتے۔

محمد اختر[1] صاحب اور ان کے پورے خاندان پر بڑی شفقت تھی، ہمیشہ ان کی پرسش و پوچھ فرماتے اور فکر رکھتے، ایک مرتبہ غایت شفقت سے فرمایا کہ مجھے اب دوسری شادی نہ کرنے کا افسوس ہوتا ہے، اگر میری کوئی لڑکی ہوتی تو میں اختر کو دیتا، بھائی اسمٰعیل لائلپوری اور ان کے بھائی محمد ابراہیم صاحب کو ہمیشہ ان کا خیال رکھنے کی ہدایت فرماتے

(بقیہ حاشیہ ۲۶۶ کا) حضرتؒ نے قبول فرمائی اور سرپرست کی حیثیت سے نام کے اعلان کی اجازت دی

(۱) ضلع دہرہ دون کے رہنے والے ایک شریف ہندو خاندان کے فرد ہیں، اپنے شوق سے اسلام لائے اور بڑی تکلیفیں اٹھائیں، تقسیم کے بعد پاکستان منتقل ہوئے، اب لاہور میں قیام ہے، حضرت کے زمانۂ قیام میں خصوصی مہمانوں کی بڑی خدمت کرتے۔

اگر کوئی ان کے ساتھ سلوک کرتا تو بیحد خوش ہوتے، حاجی متین احمد صاحب راوی ہیں کہ آخری وصیت مجھے حضرت نے انھیں کی خبر گیری اور خیال رکھنے کی فرمائی، نومسلموں کے ساتھ جو امتیازی سلوک بعض مسلمان کرتے ہیں، حضرت اس کو بہت ناپسند اور اسلام کی روح اور تعلیمات کے خلاف سمجھتے اور اس کو جاہلیت کے اثرات اور خاندانی نخوت کا نتیجہ سمجھتے۔

اسلام کے نئے مہمانوں اور عزیز فرزندوں کے ساتھ حضرت کا جو شفیقانہ برتاؤ اور پدرانہ شفقت تھی اس کا کسی قدر اندازہ محمد اختر صاحب کی اس تحریر سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے اپنے قبول اسلام اور حضرت کی شفقت و سرپرستی کا تذکرہ کیا ہے یہاں اس کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:۔

"میری پیدائش قصبہ بنت ضلع مظفر نگر (یو۔پی) میں گوڑ برہمن خاندان میں ہوئی، والد صاحب سرکاری ڈاکٹر تھے، کئی جگہ تبدیل ہونے کے بعد ڈوئی والہ ضلع دیرہ دون تبادلہ ہوا، والد صاحب کے ماتحت ایک کمپاونڈر محمد اسمٰعیل صاحب تھے جو اردو، فارسی اور ہندی میں بہت قابل تھے، کچھ اردو، فارسی انھوں نے مجھے پڑھائی، ۱۹۲۶ء میں درجہ چہارم کا امتحان پاس کیا اس کے بعد کچھ اسلامی کتابیں دیکھیں، قرآن پاک کی چند سورتیں بھی زبانی یاد کرلیں، ۱۹۲۶ء میں والد صاحب کا تبادلہ چوہڑپور ضلع دیرہ دون ہوگیا، ان دنوں والد صاحب کو میرے خیالات پر کچھ شبہ ہوا، انھوں نے دیرہ دون سے مجھے روہتک جاٹ ہائی اسکول میں بھیج دیا، جہاں سات سو لڑکوں میں ایک بھی مسلمان نہ تھا، چنانچہ میں تین سال وہاں رہا، بڑے ، ن کی

تعطیلات میں چوہڑپور گھر آیا، محمد اسمٰعیل صاحب کپیا ونڈر کا مکان بھی چوہڑپور تھا، ان کے بہنوئی راؤ حسین علی خاں حضرتؒ سے بہت تعلق رکھتے تھے محمد اسمٰعیل صاحب نے راؤ صاحب سے کہا کہ اس کو حضرتؒ سے ملاتے ہوئے سہارنپور چھوڑ آنا، ہم رات کو رائپور پہنچے، سردیوں کے دن تھے، حضرت نے بڑی شفقت و محبت سے اپنے پاس بٹھلایا، کھانا ساتھ کھلایا، اور اپنے حجرہ کے دروازہ پر لیٹنے کو فرمایا، اپنے بستر میں سے ایک رضائی بھی عنایت فرمائی، رات بھر عجیب کیفیت رہی، دو تین بجے سے ذکر کی صدا کانوں میں آنے لگی، صبح نماز کے وقت اٹھا اور چائے پی، اجازت چاہی تو حضرت رخصت کرنے نہر کی پٹڑی پر بہت دُور تک آئے، رخصت کرتے وقت فرمانے لگے "روہتک تو دہلی سے قریب ہے، انشاء اللہ وہاں تو ملو گے"۔

میں بہٹ سے سوار ہو کر سہارنپور آیا اور دہلی ہوتا ہوا روہتک پہنچ گیا مگر طبیعت نہ لگی مغرب اور فجر کی دو نمازیں میں صرف اشارہ سے پڑھتا تھا کیونکہ ہندوؤں میں دو وقت ہی پوجا کرتے ہیں، دوسرے اوقات میں شبہ کا اندیشہ تھا، رمضان کے کچھ روزے بھی رکھ لیتا، برت کا بہانہ کر کے، مسلسل نہیں چھوڑ چھوڑ کر، حضرت دہلی نظام الدین تشریف لے آتے تو میں اتوار کی چھٹیوں میں دہلی پہونچ جاتا، وہاں حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور شیخ رشید احمد مرحوم میرے متعلق مشورے کرتے، وہ اس لئے کہ میری ایک چھوٹی ہمشیرہ تھی، وہ بھی میرے ہمخیال تھی، مگر والد صاحب اس کی شادی جلد کر دینا چاہتے تھے، میں دہلی میں سب انتظام کر کے اپنے گھر پہونچا، پولیس کے ذریعہ شادی کو رکوانے

کی کوشش کی، پولیس اور ڈپٹی صاحب آئے، ان کے سامنے میں نے اپنا اسلام ظاہر کیا، مجھے پھر گھر میں نہیں جانے دیا گیا، جو کپڑے میں نے پہن رکھے تھے، وہی میرے بدن پر تھے، جون کا مہینہ تھا، پولیس اور ڈپٹی صاحب کو سلام کرکے گھر سے سڑک کی طرف چل پڑا، بالکل خالی ہاتھ، پیسہ ایک جیب میں نہیں، سڑک پر آکر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر میں کار آتی ہے، ایک شخص اترتے ہیں فرماتے ہیں، یہاں ایسا واقعہ ہوگیا ہے کیا تجھے علم ہے؟ میں نے کہا میں وہی شخص ہوں، انھوں نے اپنے ساتھ بٹھلاکر مظفر نگر مولوی رؤف الحسن صاحب کے ہاں پہنچا دیا،

مظفر نگر سے میں دہلی پہنچا اور نظام الدین آیا، حضرت مولانا الیاسؒ نے فرمایا نماز پڑھوگے وضو آتا ہے؟ میں نے کہا جی حضرت وضو بھی اور نماز بھی بلکہ دو چار سورتیں بھی یاد ہیں، فرمایا ماشاء اللہ تجھے تو اللہ نے مسلمان ہی بنا کر بھیجا، صرف اس کے گھر میں پیدا ہوئے، اور واقعی میں نے کسی بت کو سجدہ نہیں کیا، مجھے اپنے ہوش سنبھالنے تک یاد ہے کہ کوئی کفریہ بات نہیں کی، ہردوار بھی گیا، گنگا بھی نہایا، شوالہ میں گیا، مگر ان کی طرح کچھ کام نہ کیا، صرف دیکھتا رہتا، یہاں تک کہ برہمن ہونے کے باوجود جوان ہونے پر زنار بھی گلے میں نہیں ڈالا، بلکہ ان سب باتوں سے کچھ قدرتی نفرت رہی، یہاں تک کہ خطوط میں اوپر ۷۸۶ شروع میں لکھا کرتا، تعلیم کے زمانہ میں ہیڈ ماسٹر نے بتلایا جو پنڈت تھا کہ ۷۸۶ مسلمان لکھا کرتے ہیں اور اس سے بسم اللہ بنتی ہے، اس نے خط دیکھ لیا تھا،

شروع میں "تاریخ اسلام" پڑھی جو حضرت مولانا عاشق آلہی صاحب میرٹھی نے لکھی تھی انھوں نے مجھے اسلام لانے کے بعد کئی کتابیں اپنے پاس سے دیں جب میں ان کے پاس میرٹھ پہنچا، دل میں پختگی حضرتؒ سے ملنے کے بعد پیدا ہوئی،

میں نے ۱۶ر جون ۱۹۳۲ء کو اپنا آبائی وطن چھوڑا اور مظفر نگر دہلی ہوتا ہوا رائے پور پہنچا۔

میں نے ابھی اسلام بھی قبول نہیں کیا تھا کہ راؤ حسین علی خاں صاحب چوہڑپور سے رائے پور آئے، وہ اپنی لڑکی کا رشتہ رائے پور ہی کر رہے تھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے مشورۃً دریافت کر بیٹھے، حضرتؒ نے فرمایا" راؤ جی کبھی وہ بھی تو آئے گا جس کو آپ اور محمد اسمٰعیل صاحب اپنا بیٹا کہتے ہو، اس کے لئے پھر کیا کروگے؟ (یعنی وہ میری طرف اشارہ تھا) اس لئے اس شادی کو ٹھہرا رکھو، چنانچہ میرے اسلام لانے کے بعد بھی راؤ جی نے دو ڈھائی سال انتظار کیا اور پھر نکاح ہوا،

شادی سے پہلے حضرت ہر جگہ مجھے اپنے ہمراہ سفر میں لے جاتے تھے اور کئی جگہ یہ بھی فرمایا کہ اگر جی چاہے تو یہاں ٹھہر جاؤ، تمھارا سب انتظام ہو جائیگا، مگر جب حضرتؒ وہاں سے چلتے تو میں بھی پیچھے چل پڑتا، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے پاس لے گئے، حضرت شاہ صاحب نے، مجھے ایک کتاب "اسلام کیوں کر پھیلا" عنایت فرمائی، حضرت بھاولنگری (مولانا اللہ بخش صاحب) کے پاس لے گئے، حضرت منشی جی صاحب (منشی رحمت علی صاحب)

جالندھری کے پاس لے گئے، مگر میری طبیعت کہیں نہ لگی، سہارن پور آکر حضرت شیخ سے فرمانے لگے "اختر تو ایسا میرے پیچھے پھرتا ہے جیسے بچے ماں کے پیچھے پھرتے ہیں" شیخ نے فرمایا یہ کہیں نہیں رہے گا، یہ تو رائے پور ہی آئے گا حضرتؒ نے فرمایا میں اس خیال سے کہتا ہوں کہ رائے پور جنگل ہے کوئی آرام کی جگہ نہیں، کھانا بھی ایسا ہی ہے وہاں یہ گھبرا جائے گا، مگر حضرتؒ نے مجھے اپنے والدین بھلا دیے،

ایک دفعہ میں باورچی خانہ میں خاموش بیٹھا تھا، والدہ یاد آگئیں، کیونکہ وہ سب ابھی تک زندہ ہیں، دو بھائی اور دو بہنیں اور ہیں، حضرت اسی وقت باورچی خانہ میں تشریف لائے، میری کمر پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے "فکر کیوں کرتا ہے، میں تیری ماں اور باپ ہوں، تو میرا بیٹا ہے اور جب تک زندہ ہوں انشاء اللہ اپنی زندگی کے ساتھ نبھا جاؤں گا" چنانچہ ایسا ہی نبھایا کہ کوئی دنیا کا امیر سے امیر نبھا کے کیا جائے گا؟

رائے پور گرمیوں میں جب حضرت لیٹنے لگتے تو فرماتے "اختر کی چارپائی کہاں ہے، یہاں میرے پلنگ کے پاس لے آؤ، برابر میں چارپائی لگا لیتے، رات کو دو ڈھائی بجے بڑی خاموشی سے اٹھتے مگر قدرت اس وقت آنکھ کھول دیتی، کئی روز تو خاموش پڑا رہا، بعد میں نیند نہ آوے ایک روز حضرتؒ سے عرض کیا کہ حضرت میں بھی کچھ پڑھ لیا کروں؟ فرمانے لگے "ابھی نہیں تم سوتے رہا کرو، مگر نیند کیسے آوے، آخر چارپائی سے اٹھ کر بیٹھ جاتا، حضرت نے مجبوراً فرمایا اچھا کچھ ذکر کر لیا کر،

میں اس وقت تک بیعت بھی نہیں ہوا تھا، حضرتؒ سے ذکر کیا کہ دوسروں کو تو بہت بیعت کرایا مگر خود ابھی تک نہیں ہوا، حضرتؒ نے فرمایا "میں خود جب مناسب سمجھوں گا بیعت کرلوں گا" چنانچہ رمضان کا مہینہ آگیا، ایک روز نماز فجر سے پہلے خود ہی مجھے اور مولوی عبدالرحمٰن صاحب کو جو حضرت کے بھتیجے ہیں بلا کر فرمایا "لاؤ آج تمہیں دونوں کو بیعت کرلیتا ہوں، کبھی کہو کہ ہماری کوئی سفارش نہیں ہے اس لئے نہیں کرتے" پھر فرمایا کہ "دراصل بیعت سے جو فائدہ پہنچتا ہے وہ تمہیں بغیر بیعت کے بھی پہونچ جائے گا، اس لئے کہ جب تجھے میرے سے تعلق اور محبت ہے تو فائدہ لازمی پہونچے گا اور لوگ ہاتھ میں ہاتھ تو دے دیتے ہیں مگر تعلق اور محبت ہوتی نہیں، دوسرے کچھ کرتے کراتے بھی نہیں اس لئے کچھ زیادہ فائدہ بھی نہیں پہونچتا، اصل مقصود ہے محبت اور تعلق پیدا کرنا، پھر سب کچھ کرگزرتا ہے"

ایک دفعہ حضرت سکروڈہ ضلع سہارنپور جو راجپوتوں کا گاؤں ہے ٹھہرے ہوئے تھے، میں بھی ہمراہ تھا، کچھ دوستوں نے کلیر شریف جانے کا ارادہ کیا، عرس کا زمانہ نہیں تھا اور سکروڈہ سے قریب تھا، میں نے بھی حضرت سے مزار شریف پر جانے کی اجازت چاہی، حضرتؒ نے فرمایا "خیر چلے جاؤ مگر صحن میں کھڑے ہوکر مزار سے باہر ہی پڑھ لینا، اندر زیادہ نہ جانا" سب دوست ہم عمر تھے چلے گئے، جب کلیر شریف پہونچے اور سب فاتحہ پڑھ چکے تو کہنے لگے ذرا اندر بھی مزار کی زیارت کرلیں، مجھ سے بھی اصرار کیا، اندر گئے پہلے حصہ میں داخل ہوئے تو کچھ مستورات نکلتی نظر پڑیں، پھر دوسرے حصہ میں

مزار کے قریب گئے، مزار کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی جالی ہے، پاؤں کی طرف ایک شخص کو دیکھا جو سجدہ کر رہا تھا اور بڑی دیر تک کرتا رہا، فوراً دل میں خیال آیا وہاں شوالہ میں جاکر بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، یہاں قبر پر سجدہ کرلیا بات کیا رہی، دونوں کا پتھر اور مٹی کو سجدہ، اللہ کو ہندو بھی مانتے ہیں اور سجدہ کرتے وقت وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم صرف تصوران بزرگوں کا رکھتے ہیں جن کی یہ پتھر کی تصویر ہے، ورنہ دراصل پرماتما ہی کو سجدہ کرتے ہیں، دل میں وسوسہ پیدا ہوا، حضرت کے پاس جب واپس آئے تو فرمایا "ہو آئے"؟ میں نے کہا جی ہاں! فرمایا "کچھ وسوسہ تو نہیں گزرا" میں نے عرض کیا جی ضرور گزرا ہے اور یہ بات ہے جو میں نے وہاں دیکھی فرمایا "اس لئے میں نے کہا تھا اندر نہ جانا تاکہ تمہارے خیالات میں کمزوری نہ آجائے"، پھر فرمایا "تم یہ نہ دیکھو کہ مسلمان کیا کرتا ہے، اس کے کسی فعل کو شریعت نہ سمجھو، تم یہ دیکھو کہ اسلام کیا کہتا ہے، انسان کا ہر فعل حجت نہیں بن جاتا" اس کے بعد اسلام پر روشنی ڈالی، حضرتؒ نے فرمایا "ایک موٹی سی بات ہمیشہ یاد رکھنا، تمہارے سامنے کوئی شخص اگر آسمان پر اڑ کر بھی دکھلاوے اگر اس کا فعل سنت کے خلاف ہو، خواہ کتنا ہی بزرگ ہو اس کے پیچھے نہ لگنا، اور دوسرا شخص اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پوری پابندی کرتا ہے اس سے کوئی بھی کرامت ظاہر نہ ہو تم اس کے پیچھے لگ جانا، کسی خاص چیز کی مشق ہندو بھی کرلیتے ہیں، جو جس چیز کی مشق کریگا اس میں کمال حاصل ہوجائے گا، کئی کئی روز تک سادھو دم سادھے بیٹھے رہتے ہیں ایسے ہی

مسمریزم ہے، اشارہ ہاتھ کا کرو چیز اپنی طرف کھنچی ہوئی نظر پڑیگی یہ سب شعبدہ بازیاں ہیں۔"

اس کے بعد آج تک میں جلدی سے کسی کا معتقد نہیں ہوا اور نہ کسی رسم ورواج کا پابند بنا، بس حضرت کو پانے کے بعد پھر کہیں نظر نہ ٹھہری۔

کسی شخص نے میرے والد صاحب کو کافر اور کچھ ایسے ہی الفاظ کہے حضرت نے سنا تو فرمایا "ایسا مت کہو، اگر وہ نہ ہوتے تو اختر ہمارے قبضہ میں کہاں سے آتا، اب وہ اگر ہمارے سامنے آویں ہم تو ان کی خدمت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں، والد صاحب کا درجہ اپنی جگہ موجود ہے، وہ قابل احترام ہیں۔"

حضرت نے مجھے پہلے ڈیرہ دون کمپونڈری سیکھنے بھیجا وہاں میں نے ایک ڈاکٹر صاحب کے پاس کام سیکھا، کمپونڈری میں نے سہارنپور ہی میں پاس کی تھی،

شادی کے بعد حضرت مجھے ڈیرہ دون چھوڑ کر جانے لگے، سڑک پر کار کھڑی تھی، مکان سے نکل کر حضرت سڑک تک آئے، کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے "کل پرسوں ڈیرہ دون آجاناوہیں ولیمہ کریں گے۔" حضرت کی جدائی سے میرے آنسو نکل آئے، مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب فرمانے لگے اختر کو تو خوش ہونا چاہیئے، یہ تو رورہا ہے، حضرت نے فرمایا "یہ تو پاگل ہے مجھے بھی کچھ اس کی جدائی گوارہ نہیں ہے، اچھا کل چلیں گے۔"

پہلی بیوی کے انتقال کے بعد شادی کا ارادہ نہیں تھا مگر حضرت کا اصرار

ہمیشہ رہتا کہ نہیں تم جوان آدمی ہو ایسے نہیں رہنا چاہیئے، چند ماہ بعد مرزا پور کے (جو رائے پور سے دو تین میل ہے) حافظ عبدالحمید صاحب خود بخود حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت میری ہمشیرہ ہے، اگر اختر کے ساتھ نکاح ہو جائے تو بہتر ہے، حضرت نے فرمایا جو چیز خود بخود آئے وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، حضرت کے منشا کے مطابق نکاح ہو گیا،

۱۹۴۷ء میں میں نے پاکستان کی تیاری شروع کر دی، تیار ہو کر حضرت سے اجازت چاہی، حضرت نے فرمایا "بس جلدی نکل جانا کبھی راستہ بند نہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ تمہیں خیریت سے پہنچا دیں" میں ٹنڈو آدم جو حیدر آباد کے قریب ہے چلا آیا، جب حضرت پاکستان آتے تو میں اکثر حضرت کی زیارت کے لئے لاہور آتا، ایک مرتبہ میں لاہور حضرت کی زیارت کے لئے صوفی صاحب کی کوٹھی پر آیا، یہ ٹنڈو آدم آنے کے بعد پہلی دفعہ حضرت سے ملنا تھا، شام کو برآمدے میں کھانے کے لئے دسترخوان بچھا، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ کبھی تو ہم حضرت کے ساتھ برابر بیٹھ کر کھاتے تھے، اب یہاں ہم جیسوں کو کون پوچھتا ہے، بڑے لوگ ہیں، کوئی وزیر صاحب بھی آئے ہوئے تھے، چودھری عبدالحمید صاحب کمشنر اور صوفی صاحب اندر بیٹھے تھے بس ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ برآمدے میں جو کمرے کا دروازہ ہے وہ کھلا، اور مولوی عبدالمنان صاحب نے فرمایا کہ بھائی اختر حضرت اندر یاد فرما رہے ہیں، میں اٹھا دروازہ پر گیا، حضرتؒ نے دیکھتے ہی فرمایا "آجا باولے میرے

برابر ہیں" جو حضرات دسترخوان پر بیٹھے تھے ان سے فرمانے لگے "یہ میرے پاس ہی رائپور رہتا تھا، میں نے اسکی دو شادیاں کیں، آج کل ٹنڈو آدم میں ہے وہاں سے مجھ سے ملنے آیا ہے، اسے یہ کھاؤ وہ کھاؤ"

میری تمنا رہتی تھی کہ اللہ تعالیٰ لاہور میں کوئی انتظام ٹھہرنے کا کر دے تاکہ حضرت کی صحبت پورے طور پر حاصل ہو سکے اور اتنی دور سے آنا نہ پڑے اللہ نے وہ بات بھی حضرت کی دعا سے پوری کر دی"(۱)

حقیقت پسندی اور حالات زمانہ سے باخبری

حضرت کی طبیعت میں حقیقت پسندی، عملیت اور زمانہ کے تغیرات کی رعایت بہت تھی، آپ کی طبیعت میں وہ افراط تفریط اور تخیل پسندی نہیں تھی جو اکثر فرط ذہانت، یا شدت مجاہدہ یا رجائیت (ضرورت سے زیادہ پر امید اور نیک گمان ہونا) پیدا کر دیتی ہے، آپ کا ذہن بڑا متوازن اور عملی تھا، حقائق و واقعات پر (خواہ وہ کیسے ہی تلخ اور تشویش انگیز ہوں) آپ کی نظر رہتی تھی، معاملہ کا کمزور اور تاریک پہلو بھی دیکھتے تھے، زمانہ کی نئی تبدیلیوں اور تقاضوں پر آپ کی نظر تھی اور آپ ان کو پوری اہمیت دیتے تھے اور ان کی طرف متوجہ اور متنبہ فرماتے رہتے تھے، باوجود ایک مخصوص و محدود ماحول میں نشوونما پانے اور زندگی گزارنے اور ایک خاص (دینی) طبقہ سے تعلق و وابستگی رکھنے کے آپ کا ذہن فطری طور پر اتنا وسیع، نمو پذیر اور نقاد تھا کہ قدیم دینی حلقہ میں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

حضرت اسلامی ممالک کیلئے مادی ترقی، نئے علوم کا اکتساب، جدید صنعتیں، سائنس

(۱) تحریر قلمی ارسال کردہ محمد اختر صاحب۔

میں ترقی، مالی استحکام اور خود کفالتی بہت ضروری سمجھتے تھے اور عام طور پر (خصوصاً پاکستان کے زمانۂ قیام میں) اپنی مجلسوں میں اور خاص طور پر جب جدید تعلیم یافتہ حضرات اور فضلاء تشریف رکھتے ہوں، ان کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے رہتے تھے، ایک مرتبہ عالم اسلام کے اس سلسلہ میں تساہل و غفلت کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"مسلمان اپنے اغراض میں مبتلا ہو کر کچھ ایسے سوئے ہیں کہ جاگنے کا نام نہیں لیتے، جس وقت یورپ جاگ رہا تھا مسلمان ترک گہری نیند سو رہے تھے اس نے ہر قسم کا سامان جنگ بنایا، لیکن مسلمان غفلت میں پڑے رہے، جبتک سامان پاس نہ ہو لڑائی کس طرح لڑی جاسکتی ہے مسلمانوں کی ساری سلطنتیں اسلامی بھی بن جائیں تو جنگ کے لئے ایک دن کا خرچ دینے کی بھی طاقت نہیں انگریز جن کے پاس اتنی بڑی سلطنت ہے کہ اس کے ملک میں سورج غروب نہیں ہوتا یہ بھی جنگ کا خرچ برداشت نہیں کر سکا، چنانچہ اپنے ملک کے بیشتر حصے قرض میں دیدیے، لڑائیاں لڑنا آسان نہیں ہے"[(۱)]

ایک مرتبہ ایک مسلمان ملک کے ایک بڑی سلطنت سے امداد لینے کا تذکرہ تھا اور بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا، فرمایا:۔

"کیا کریں؟ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں، ان میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ اپنی جملہ ضروریات کی اشیاء خود مہیا کر سکیں، بہر حال اپنی ضروریات کے لئے ان کو ان سے تعلقات رکھنے ضروری ہیں، عرب سلطنتوں میں سب سے زیادہ طاقتور

(۱) مجلس ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ (۲۷ رمئی ۱۹۵۴ء، گھوڑا گلی (کوہ مری) بیاض مولوی علی احمد صاحب مرحوم۔

مصر شمار ہوتا ہے، وہ بھی ان کا محتاج ہے، عرب شریف ہے تو وہ محتاج ہے امریکہ سب کو اپنے قبضہ میں لے رہا ہے، اگر پاکستان والے سو سال تک سامان تیار کرتے میں لگے رہیں اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے نہ لڑیں تو ممکن ہے کہ اتنی طاقت حاصل کر سکیں کہ ان سے مستغنی ہو سکیں اور ان کا مقابلہ کر سکیں[1]۔

ایک مرتبہ فرمایا:۔

"نیک نیتی سے ملک کی طاقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی جائے سب دین ہی ہے وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ، اگر ریا، یا نیت فاسد سے نماز بھی پڑھی جائے تو وہ بھی قبول نہیں ہوتی اور رَد ہے، اور اگر نیت صالح سے پڑھی جائے تو وہ عبادت ہے، اسی طرح نیت صالح سے حکومت کی ترقی کا جو بھی کام کیا جائے سارے کا سارا دین ہی دین ہے، ایسا نہ ہو کہ "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود"، افراد کے اخلاق کی اصلاح بھی ضروری ہے لیکن ملک کی حفاظت بھی ضروری ہے[2]۔"

ایک مرتبہ فرمایا:۔

"اسلامی نظام خالی باتوں سے نہیں قائم ہو سکتا، اگر دنیا کے بڑے ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے تو ان لوگوں کے علوم و فنون سیکھنے ہوں گے مگر مشکل یہ ہے کہ ہم ان کے علوم کو سیکھتے سیکھتے اپنے دین و مذہب کو خیرباد کہہ دیتے ہیں جبتک کوئی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو، اس زمانہ میں دین و دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتا[3]۔"

(۱ و ۲) مجلس ۲۲ و ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ (۲۷ مئی ۱۹۵۴ء) گھوڑا گلی (کوہ مری) بیاض مولوی علی احمد صاحب مرحوم

(۳) مسودہ صوفی محمد حسین صاحب مجلس بر مکان مولوی عبدالمنان صاحب گوجرانوالا۔

حضرت اکثر اسلامی ممالک بالخصوص حجاز کے متعلق بڑے افسوس اور قلق کے ساتھ اظہار خیال فرمایا کرتے تھے کہ انھوں نے ابھی تک صنعت وحرفت اور اپنی ضرورت کو اپنے ملک ہی میں پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور ان کی دولت زیادہ تر باہر سے ضروریات زندگی کے درآمد کرنے پر صرف ہوتی ہے، شعبان ۱۳۸۱ھ (جنوری ۱۹۶۲ء) میں راقم نے اپنے چند رفقاءؒ کے ساتھ کویت وقطر وغیرہ کا سفر کیا، جب اجازت اور رخصت کیلئے رائپور حاضر ہوا تو بڑی عنایت ومحبت سے رخصت فرمایا، چلتے وقت خصوصیت کے ساتھ فرمایا، ان بھلے مانسوں سے کہنا کہ اپنی دولت کا صحیح استعمال کریں، کارخانے بنائیں اور صنعتوں کو رواج دیں۔ کویت میں مغربی تہذیب کا تسلط اور مادیت کا طوفان دیکھ کر دل کو بڑا صدمہ ہوا، ان عرب ریاستوں کے حالات کے گہرے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ یہاں کی زندگی کی ڈوری ان ملکوں کے قائدین کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ یورپ کے سربراہوں کے ہاتھ میں ہے اور یہاں کی ساری روشنی اور جگمگاہٹ کا بٹن (سوئچ) یورپ میں ہے، یہاں کی زندگی اور رجحان مغربی زندگی اور رجحان کا عکس ہے میں نے حضرت کی خدمت میں وہاں سے مفصل عریضے لکھے جن میں وہاں کے حالات کا تذکرہ اور اپنے تأثرات بھی تھے، ایک عریضہ میں یہ جملہ بھی آیا کہ یہاں کے حالات دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے، اندازہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک خود یورپ میں کوئی انقلاب نہ ہو یہاں انقلاب نہیں ہوگا، حضرت کے حقیقت پسند اور نقاد ذہن کو غالباً یہ جملہ پسند آیا اور اس میں حقیقت حال کی صحیح ترجمانی محسوس ہوئی، میں واپسی پر رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں حاضر ہوا، میری آمد کی اطلاع ہوتے ہی یاد فرمایا گیا اور مصافحہ کے ساتھ ہی فرمایا کہ آپ نے اپنے خط میں وہ کیا جملہ لکھا تھا کہ جب تک یورپ میں انقلاب نہ ہو؟ میں نے اسکی تشریح کی، باوجود اسکے کہ رمضان مبارک میں حضرت کے ہاں دن میں گفتگو کرنے کا معمول نہیں تھا لیکن بہت دیر تک بہت تفصیل کے ساتھ کویت کے حالات

دریافت فرماتے رہے اور بڑے غور و توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنتے رہے، اس ایک مجلس سے سیری نہیں ہوئی، متعدد بار مختلف وقتوں میں بُلا بُلا کر پوچھتے رہے، اسی سال جب ذیقعدہ میں حجاز جانا ہوا اور رخصت کیلئے رائے پور حاضر ہوا تو پھر اسی قسم کی ہدایات دیں اور ملک کے ذمہ داروں اور سربراہوں کو اپنے ملک کی اصلاح و ترقی کی طرف متوجہ کرنے کی تلقین فرمائی، اور واپسی پر باوجود انتہائی نقاہت اور ضعف کے وہاں کے حالات دریافت فرمائے اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ یہ پیغام کہاں تک پہنچانے کا موقع ملا؟

پاکستان کے اہلِ ثروت کو بھی کارخانے قائم کرنے اور صنعتوں پر اپنا سرمایہ لگانے کی تلقین فرماتے رہے، ہندستانی مسلمانوں کو بالخصوص تنسیخ زمینداری کے بعد صنعتوں کو اختیار کرنے اور اپنی اولاد کو کوئی ہنر یا صنعت سکھانے کی بڑی تاکید کرتے تھے، فرماتے تھے کہ اب ہندستان میں اس کے بغیر شریفانہ زندگی گزارنا مشکل ہے جن مسلمانوں کو ایسے پیشے اور صنعتیں اختیار کرنے سے (جو پسماندہ اقوام اور اہلِ حرفہ کا شعار سمجھی جاتی تھیں) عار اور ننگ محسوس ہوتا تھا اسکی ہمیشہ اصلاح اور تردید فرماتے تھے اور اس احساس کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے، رائے پور کے حضرات اور دوسرے زمیندار طبقہ کے افراد کو ہمیشہ مشورہ دیتے تھے کہ اپنے سرمایہ کو کسی تجارت یا صنعت پر لگا کر کمپنیاں بنالیں، بعض لوگوں کے لیے جو حضرت کو صرف ایک شیخ طریقت اور روحانی مربی سمجھتے تھے اور آپ سے صرف اسی سلسلہ کی ہدایات اور رہنمائی کے متوقع رہتے تھے اس طرح کا مضمون سننا (جو ان کے نزدیک مشیخت وارشاد کے خلاف تھا) ایک نیا تجربہ اور غیر متوقع سی بات تھی، لیکن حضرتؒ اسکی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے اور نہایت زور اور جوش کے ساتھ کبھی کبھی اس پر تقریر فرماتے تھے،

حضرت ان لوگوں کیلئے جو فریضۂ حج سے فارغ ہو گئے ہیں بار بار حج نفل کرنے کی

(سوائے خاص حالات کے) ہمت افزائی نہیں فرماتے تھے، اس کے بجائے ایسے کاموں میں روپیہ صرف کرنا بہتر سمجھتے تھے جن میں دین کی ترقی اور اسلام و مسلمانوں کا استحکام ہے، حضرت کو (ایک طبیب حاذق اور مبصر کی حیثیت سے) اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ اس میں نفس کا حصہ نہیں ہے۔

"ایک صاحب حج نفل کے لئے تیار تھے، حضرت نے بلایا اور ہنس کر فرمایا کہ "اگر لوگوں سے کہا جائے کہ نماز خشوع و خضوع سے پڑھو تو بار ہوگا اور نہیں ہوسکیگا لیکن حج کے لئے کہا جائے تو فوراً تیار ہو جائیں گے"[1]

حالات زمانہ اور بیرونی دنیا میں اور ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے واقف رہنے کا بڑا اہتمام تھا، اخبارات کی اہم خبروں اور اہم مضامین اور جدید معلومات کے سننے کا ساری عمر اہتمام رہا، رائپور میں یہ خدمت راؤ فضل الرحمٰن خاں صاحب کے اور پاکستان میں رفیق احمد خان کے سپرد تھی، بہت سے نو وارد اس معمول اور اہتمام کو دیکھ کر متعجب ہوتے، لیکن حضرتؒ ان تاثرات سے بالاتر اور مستغنی تھے، حضرت کی وفات پر "نوائے وقت" میں رفیق احمد خاں صاحب نے حضرت کے اس شعبۂ زندگی سے متعلق اپنے کچھ تاثرات شائع کرائے تھے جن میں انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ حضرتؒ کے اس ذوق و اہتمام پر روشنی ڈالی تھی، یہاں اس کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:-

"بعض لوگوں کے لئے یہ بات حیران کن ہوگی کہ حضرت اقدسؒ جیسے بلند مرتبہ بزرگ اور بظاہر دنیاوی علائق سے لاتعلق انسان کو زمانہ کی خبروں اور سیاسی امور اور ملکی و غیر ملکی حالات و واقعات اور سائنسی تحقیق اور ایٹمی ایجادات

---

(۱) مجلس ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ

وانکشافات سے کیا غرض و دلچسپی ہو سکتی ہے ؟ مگر شریک محفل رہنے والے احباب پر یہ بخوبی واضح ہے کہ حضرت اقدسؒ یہ حالات کس درجہ توجہ وانہماک سے سنا کرتے اور ملنے والوں سے اکثر تازہ خبریں سنانے کی فرمائش کیا کرتے،

کبھی کبھی کسی خبر پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نہایت پر لطف انداز میں تبصرہ فرماتے جس سے ان کی دور بینی، نکتہ شناسی اور گہری فہم و فراست کا ثبوت ملتا، اس وقت حضرت کے ارشادات گرامی کو سننے کے لئے محفل ہمہ تن گوش ہو جاتی، مگر حضرت کی آواز بوجہ حد درجہ نقاہت دور تک نہ پہنچتی، اس لئے قریب بیٹھنے والے احباب بھی بمشکل ہی سمجھ پاتے، تاہم حضرت کے چہرے سے فکر و استعجاب یا خوشی و مسرت کا اندازہ ہو جاتا تھا، حضرتؒ کو پاک اور بھارت کے باہمی تعلقات کی خبروں سے گہری دلچسپی تھی، دونوں ملکوں کے تعلقات کی بہتری و اصلاح کی کوئی خبر سنتے تو بہت خوش ہوتے اور فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں سے پریشان و فکرمند ہوتے، دونوں ملکوں کے چوٹی کے لیڈروں کی فرقہ وارانہ مذمت کی کوئی خبر سنتے تو بڑی تسلی کا اظہار فرماتے، حضرت اقدسؒ بھارت اور پاکستان کے باہمی بہتر تعلقات کو دونوں ملکوں کی تعمیر و ترقی کے لئے ضروری خیال فرماتے،

سائنس کی کھوج اور تحقیق اور معلوماتی خبروں سے خاص شغف تھا، مصنوعی سیاروں کی زمین کے مدار پر گردش اور چاند تک پہونچنے کی کوششوں کے متعلق ہر خبر کو وہ غور سے سنتے، ایٹمی آلات، میزائل، راکٹ اور نئی نئی سائنسی ایجادات وغیرہ کے بارے میں معلوماتی خبروں کی طرف پورا دھیان فرماتے، مختلف ایجادات اور ایٹمی سرگرمیوں کو عالمی بھلائی کے کام میں لانے کی کسی خبر سے وہ

مسرور و مطمئن ہوتے، چاند کے متعلق سائنسدانوں نے جو انکشافات کئے ہیں اور کھوج اور تحقیق کی جو سعی جاری ہے اس کے تازہ کوائف کے بارے میں اکثر دریافت فرماتے رہتے، چاند کے علاوہ اجرام فلکی سے متعلقہ سائنس دانوں کی تحقیق اور کاوش کی دوسری خبروں سے بھی دلچسپی کا اظہار فرماتے اور اس قسم کی معلوماتی چیزوں کو بڑے غور سے سنتے، چاند تک انسان کی رسائی کے بارے میں سائنس دانوں کی تگ و دو اور حیرت انگیز حالات کی کارکردگی، نئے نئے راکٹوں کی تیاری اور اس ضمن میں آئندہ کی کوششوں کے بارے میں کسی شک و شبہ کا اظہار نہ فرماتے تھے، بلکہ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: یہ مغربی لوگ اولوالعزمی اور ہمت کے لحاظ سے جن ہیں جو دن رات نت نئے تجربات سے کھوج اور تحقیق میں لگے رہتے ہیں اور عجیب و غریب کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے لئے مشکل اور جان جوکھوں کی مہمات سے ذرا نہیں گھبراتے، سائنس کی موجودہ تحقیق و ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے وہ انسان کی چاند تک رسائی کو بعید از قیاس تصور نہیں فرماتے تھے بلکہ ایک روز اپنے ایک خادم سے ہنس کر فرمانے لگے:۔

"جب لوگ بالائے زمین چاند پر پہنچیں گے تب ہم کہیں زیر زمیں پہنچ چکے ہوں گے" اجرام فلکی کی گردشیں، فاصلے، ان کے نظامات اور اس بارے میں سائنسدانوں کے حیرت انگیز انکشافات کی خبروں سے اکتاتے نہیں تھے بلکہ حضرت کی دلچسپی کے مدنظر راقم نے اس سلسلہ میں کئی بار مفصل بہت کچھ عرض کیا، اس ضمن میں کبھی کبھی وہ خود بھی کوئی بہت پتہ کی بات پوچھ لیا

کرتے تھے۔

ایک روز حضرت کو بتایا گیا کہ مسجد اقصیٰ کے گنبد کی تعمیر کے لئے عرب ممالک میں چندہ کی تحریک ہو رہی ہے اور سعودی حکومت نے اپنی جانب سے اتنے ریال دینے کا اعلان کیا ہے۔"

حضرت کو اس خبر سے کوئی خوشی نہ ہوئی بلکہ افسوس کا اظہار فرمایا اور کہا یہ سب بے کار ہے، گنبد کی مرمت سے کہیں ضروری یہ ہے کہ اس رقم سے سعودی حکومت ملک میں کوئی مدرسہ تعلیمی مرکز یا صنعتی ادارہ قائم کرتی حضرتؒ کو مسلم ممالک کی تعلیمی پسماندگی اور صنعتی کم مائگی اور سائنسی اور دیگر فنی شعبوں میں ترقی نہ کر سکنے کا بہت قلق رہتا، اگر ان ممالک سے صنعتی یا تعلیمی ترقی کی کوئی خبر موصول ہوتی تو حضرت سن کر بہت مسرور ہوتے، پچھلے دنوں مصر سے راکٹ اور جٹ ہوائی جہازوں کے تیار ہونے کی خبریں آئیں تو حضرتؒ نے خاص شوق سے انھیں سنا، اگر کبھی عالم اسلامی کے باہمی انتشار و آویزش کی کوئی خبر سنتے تو کچھ مغموم سے ہو جاتے، الجزائر کی تحریک آزادی کی خبروں کو پوری توجہ سے سنا کرتے اور حصول آزادی کے بعد ان کی آپس کی چپقلش کی خبروں سے افسردہ خاطر ہوتے۔

حضرت مختلف اور فنی امور میں مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کو زمانہ کی ضرورت و تقاضا کے مطابق لازمی خیال فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس میدان میں مسلمان کسی سے پیچھے نہ رہیں، اگر کوئی حضرت کی خدمت میں آکر یہ عرض کرتا کہ بچوں کو سائنس کی تعلیم کیلئے کسی فنی ادارہ میں داخل کرنا ہے یا مزید تعلیم کیلئے کہیں باہر

بھیجے کا خیال ہے تو بہت مسرور ہوتے اور اسکی حوصلہ افزائی فرماتے حضرت کچھ شعبوں میں عورتوں کی اعلیٰ فنی تعلیم کو بھی ایک ضابطہ کے اندر ضروری خیال فرماتے تھے، خاص کر ڈاکٹری کے پیشہ کے لئے عورتوں کے علاج کی خاطر اس تعلیم کو عورتوں کے لئے مفید خیال فرماتے تھے۔

حضرت خبریں سننے کو کبھی کبھی "اپنا وظیفہ" کہا کرتے تھے، ایک روز جب میں حاضر ہوا تو دیکھا مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری مرحوم حضرتؒ کی چارپائی کے ساتھ لگے حضرتؒ سے باتیں کر رہے ہیں، مجھے کسی نے دور سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، مطلب تھا کہ شاہ صاحب کی حضرتؒ سے مخاطبت میں کوئی خلل نہ ڈالا جائے، میں نے سکوت کیا اور حضرت کے سرہانے کی جانب چارپائی کے قریب دبک کر بیٹھ گیا، ابھی کچھ دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرتؒ نے دوسری جانب منھ پھیر کر فرمایا "یہاں کون کون بیٹھا ہے"؟ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی میرا نام بھی لیا گیا، حضرت نے فوراً کہا "ارے تم کہاں چھپ کر بیٹھ گئے، ادھر آؤ" پھر شاہ صاحب کی طرف مسکرا کر دیکھا اور فرمایا "حضرت اب ہم اپنا وظیفہ کرنے لگے ہیں" اور پھر ارشاد ہوا "اچھا کوئی خبر سناؤ"(۱)

اسلام کی فکرمندی اور مسلمانوں کیلئے دل سوزی

اسلام کی فکرمندی اور مسلمانوں کے حالات سے درمندی طبیعت ثانیہ اور پورے نظام زندگی کی روح رواں بن گئی تھی، اس کے لئے نہ زندگی کا کوئی شعبہ مخصوص تھا، نہ عمر کا کوئی وقت، یہ درد جسم اور قوائے فکریہ میں اس طرح جذب ہو گیا تھا

(۱) روزنامہ "نوائے وقت" لاہور - ۲۶ راگست ۱۹۶۲ء

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

جس گروہ(۱) سے آپ کا تعلق تھا اس کا ذکر و شغل، اس کا انقطاع الی اللہ، اسکی یکسوئی و بے نیازی اس کو مسلمانوں سے جدا اور بے فکر نہیں بناتی، بلکہ اور زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے درد میں مضطرب و بے قرار بناتی ہے اور اس گروہ کا ہر فرد زبانِ حال سے کہتا ہے:۔

مرا دردیست اندر دل چو گویم زباں سوزد
اگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

یہی درد کبھی زباں پر آ کر آہ و فغاں میں تبدیل ہو جاتا، کبھی مسلمانوں کی کوتاہیوں، اور ناسمجھیوں پر درد و قلق کے اظہار اور ملامت و تنبیہ پر آمادہ کرتا، کبھی تنہائی میں آنسوؤں میں تبدیل و تحلیل ہو جاتا، لیکن وہ دم کے ساتھ تھا اور اس سے کسی وقت قرار نہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ تقسیم اور زمانہ فسادات میں جب بہت سے مسلمان بے ہمتی کے ساتھ اسلاف کے خون اور پسینہ سے سینچے ہوئے اس باغ کو چھوڑ کر اپنے لئے پناہ کی جگہ تلاش کر رہے تھے اور اس ملک میں بظاہر اسلام کا زوال نظر آ رہا تھا، اس درد نے طوفان کی شکل اختیار کر لی، اس زمانہ کی بے قراری کی تفصیل ایک گزشتہ باب میں گزر چکی ہے۔

ایک مرتبہ ایک ایسے اہم اور نازک موقع پر جس میں دعا کی سخت ضرورت تھی، یہ خادم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کی ہمرکابی میں رائے پور حاضر ہوا اور اس موقع کی نزاکت و اہمیت کی طرف متوجہ کر کے خصوصی دعا کی درخواست کی، حضرت نے اپنے تعلق

(۱) محقق و متبع سنت صوفیہ کا وہ گروہ جس کی نسبت حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی طرف ہے اور جس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہند جیسی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔

خاطر اور فکرمندی کا اظہار فرمایا اور تنہائی میں مجھ سے فرمایا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تخلیہ میں معلوم نہیں کن عبادات میں مصروف ہوتا ہوں بعض مرتبہ پورا وقت مسلمانوں کی فکر اور رنج وقلق میں گزر جاتا ہے۔

تیرھواں باب (۱۳)

خاموش دینی خدمات، تحریکوں کی سرپرستی و رہنمائی اور کارکنوں کی ہمت افزائی

تاتو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

(اقبالؒ)

پس پردہ رہنمائی و سلسلہ جلبانی

ہندستان کے متعدد شیوخ کبار جن میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نام بطور مثال کے لیا جاسکتا ہے، اپنے گوشۂ عزلت یا مرکز ارشاد و تربیت میں بیٹھ کر بڑی بڑی انقلاب انگیز اور عہد آفریں تحریکوں کی رہنمائی و سرپرستی فرمائی ہے وقت کے فتنوں کا مقابلہ کیا ہے اور اپنے خلفاء و منتسبین کے ذریعہ اشاعت یا حفاظت اسلام کا نہایت وسیع اور مؤثر کام انجام دیا، ان کی تحریک و ترغیب، تحریض و تشویق اور حکم و ہدایت سے اور ان کی نگرانی اور سرپرستی میں ان کے خدام و منتسبین نے وقت کے اہم تقاضے پورے کئے اور ان خطرات کا سدباب کیا جو اس وقت مسلمانوں کو درپیش تھے دور سے دیکھنے والوں کی نظر میدان کے انھیں سپاہیوں پر تھی جو سرگرم اور متحرک تھے لیکن جو لوگ

حقیقت حال سے واقف تھے، وہ جانتے تھے کہ اس کام کی اور ان کام کرنے والوں کی ڈوری کسی اور کے ہاتھ میں ہے جس کا اخلاص، سوزدروں اور حکمت و فراست ان سے کام لے رہی ہے اور ان کے اندر قوت عمل، جذبہ وایثار اور نظم و اتحاد قائم کئے ہوئے ہے اور وہی اس کام کی قوت و اثر کا اصل سرچشمہ، ان کے قلوب کے لئے حرارت و توانائی کا اصل مرکز ہے۔

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ اپنے شیخ کی نیابت و وراثت میں اور ان شیوخ متقدمین کی (جن کا اوپر تذکرہ ہوا) تقلید واتباع میں اپنے لئے ایک گوشۂ عزلت کا انتخاب کیا تھا اور بظاہر صرف سلوک و تربیت سے تعلق رکھا تھا لیکن انھوں نے اس گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر اپنے اسلاف کرام کی طرح متعدد دینی تحریکوں اور خدمت دین اور حفاظت اسلام کے مختلف اہم کاموں کی سرپرستی اور رہنمائی فرمائی تھی، جن کی تاریخ و روداد کا بڑا حصہ آپ کے جذبۂ اخفا راور کارکنوں کی بے توجہی سے اس وقت تک پردۂ خفا میں ہے اور بہت جستجو اور تلاش و تحقیق سے اسکی کچھ کڑیاں دستیاب ہو سکتی ہیں، یہاں صرف دو تحریکوں کا ذکر بہت اختصار اور اجمال کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

تحریک احرار

احرار کی تحریک اگرچہ مولانا حبیب الرحمٰنؒ لدھیانوی اور چودھری افضل حق مرحوم کی سیاسی ذہانت اور مولانا شاہ عطاء اللہ شاہ بخاری کے اخلاص، جوش اور سحر بیانی کا نتیجہ تھی، لیکن اس کے قالب میں جو دینی روح تھی وہ حضرت ہی کے تعلق اور اخلاص و درد کا پرتو تھی، مولانا حبیب الرحمٰن و مولانا سید شاہ عطاء اللہ مرحوم نہ صرف حضرتؒ سے بیعت وانتساب کا تعلق رکھتے تھے بلکہ ان کو حضرتؒ سے اور حضرتؒ کو ان دونوں سے بہت گہرا تعلق تھا، ان دونوں کے علاوہ احرار کے بیشتر علماء و رہنما حضرتؒ سے بیعت و

تربیت کا تعلق رکھتے تھے، حضرتؒ کو احرار کی تحریک و جماعت سے بڑی توقعات تھیں، اس تحریک میں دین و سیاست کا امتزاج، عوام سے تعلق اور اس کے رہنماؤں کا جذبۂ حریت و جہاد اور انگریز دشمنی اور ان کی جرأت و ہمت، حضرتؒ کے مزاج سے بہت مناسبت رکھتی تھی اور حضرت کو یہ امید تھی کہ اس جماعت کی کامیابی سے دین کا دائرۂ اثر وسیع ہوگا، اور عوام لادینی سیاسی تحریکات کے خراب اثرات سے محفوظ رہیں گے، جاننے والوں میں سے کوئی بھی اس بات کا انکار نہیں کرسکتا کہ حضرتؒ کو تحریک احرار سے گہری دلچسپی اور اس کے رہنماؤں اور کارکنوں سے عزیزانہ اور سرپرستانہ محبت و شفقت تھی اور وہ بھی حضرتؒ کو اپنا روحانی سرپرست اور پشت پناہ سمجھتے تھے۔

حضرت اپنی خداداد سیاسی بصیرت سے احرار کے لئے یہی مناسب سمجھتے تھے کہ وہ وقتی اور مقامی تحریکوں اور اندھے جوش سے اپنے کو بچا کر اپنی جد و جہد جاری رکھیں اور نافہم عوام کے جذبات و مطالبوں سے بے پروا ہو کر خلوص اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا کام کرتے رہیں اور صرف ملک کی آزادی، مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی بہتری اور دشمن اسلام تحریکوں اور سازشوں (جن میں قادیانیت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے) کا مقابلہ کرنا پیش نظر رکھیں، اسی مقصد کے پیش نظر حضرتؒ جماعت احرار کی مسجد شہید گنج ایجی ٹیشن میں شرکت (جو حضرتؒ کے نزدیک احرار کو الجھانے کے لئے شروع کیا گیا تھا) مناسب اور قرین عقل نہیں سمجھتے تھے، حضرتؒ کے اس رجحان اور جماعت احرار سے تعلق کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا جو مولانا محمد علی صاحب جالندھری نے بیان کیا ہے، مولانا لکھتے ہیں:۔

"پنجاب میں مجلس احرار مقبول ترین جماعت تھی، جنگ کے بادل امنڈ رہے

تھے، ۱۹۳۶ء کے انتخاب سر پر آ رہے تھے، اولاً حکومت پنجاب نے احرار لیڈروں سے سودا کرنا چاہا کہ انتخاب میں تم آگے آؤ، ہم تعاون کریں گے، آنے والی جنگ میں مجلس احرار نے برطانیہ کی امداد کرنے سے اس وقت تک انکار کر دیا جب تک مکمل آزادی کا اعلان نہ کیا جائے گورنر پنجاب نے شہید گنج کی مسجد گروا کر حالات تبدیل کر دیئے، مجلس احرار پر انتہائی امتحان کا وقت آیا، مسلمان انتہائی مشتعل تھے اور ایجی ٹیشن کرنا چاہتے تھے، مگر یہ راستہ غلط تھا، حکومت کے خریدکردہ لیڈروں نے مسلمانوں کو پاگل بنا دیا تھا، احرار بزرگوں نے مسلمان قوم کو راستہ سے روک کر اپنی بے پناہ مقبولیت قربان کرنی گوارا کی لیکن غلط رہنمائی کر کے اپنا وقار باقی رکھنا منظور نہ کیا، پوری مسلمان قوم ناراض ہوگئی، گورنر کا منشا پورا ہوا، یہ سب کچھ ہونے کے بعد احرار کے بزرگ اتفاقاً حضرت والا سے کسی جگہ مشرف بزیارت ہوئے، بار بار ہنس کر فرمایا کہ میں تو سمجھا تھا کہ کو دے میرے شیر، کو دے میرے شیر (یعنی ایجی ٹیشن کریں گے) مگر اللہ تعالٰے نے رہنمائی فرما دی۔(۱)

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی سے جو قلبی تعلق تھا وہ کسی سے مخفی نہیں، ان حضرات کے جیل جانے کے بعد ان کے خاندان اور پسماندہ افراد کی فکر رکھتے اور ان سب کی ذمہ داری محسوس فرماتے۔

مولانا محمد علی صاحب جالندھری لکھتے ہیں:۔

"مولانا حبیب الرحمٰن منٹگمری جیل میں جب نظر بند تھے ملاقات کی کسی کو اجازت

(۱) مکتوب مولانا محمد علی صاحب جالندھری بنام مؤلف۔

نہ تھی، میں رائے پور حاضر ہوا، فرمایا کہ مولانا حبیب الرحمٰن سے ملاقات اگر کسی طرح ہو جائے تو بہت اچھا ہے، دل ملاقات کو چاہتا ہے، میں نے عرض کیا، حضرت میں انتظام کروں گا، اس پر بہت ہی خوشی کا اظہار فرمایا، فرمایا" ضرور کوئی انتظام کریں" سخت سردی کا زمانہ تھا، میں نے ایک ایم۔ ایل۔ اے کے ذریعہ جو میرا ملاقاتی تھا وزیر جیل منوہر لال سے اجازت لی، بذریعہ تار ملتان اجازت کی اطلاع ملی، میں نے رائے پور اطلاع دی، حضرت والا سخت سردی میں منٹگمری تشریف لائے، میں اسٹیشن پر پہلے سے موجود تھا، رات منٹگمری میں ایک دوست کے ہاں قیام کرایا، صبح مولانا حبیب الرحمٰن سے ملاقات ہوئی۔"(۱)

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق بڑے بلند کلمات فرماتے تھے اور ان سے اور ان کی وجہ سے ان کے خاندان سے بڑی محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا کہ "تم بخاری صاحب کو یوں ہی نہ سمجھو کہ صرف لیڈر ہی ہیں انھوں نے ابتدا میں بہت ذکر کیا ہے" اور فرمایا کہ یقین تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا نصیب فرمایا ہے کہ باید و شاید، میاں حالات و کیفیات کیا چیز ہے اصل تو یقین ہی ہے، اللہ تعالیٰ جس کو عطا فرمادے"(۲) مولانا محمد علی صاحب جالندھری فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرتؒ کے سامنے بخاری صاحب کے لڑکوں کا تذکرہ آیا فرمایا کہ شاہ صاحب کے لڑکے ہیں میں تو ان کا نوکر ہوں، یہ محبت اور خصوصیت انکے اخلاص، خود فراموشی، دینی خدمت میں انہماک اور اس نفع کی بنا پر تھا، جو ان کی ذات اور انکی ایمان افروز تقریروں سے عظیم مجموعہ میں پہنچا تھا اور خصوصیت کے ساتھ پنجاب اور بالخصوص ملتان اور اسکے نواح میں جو عقائد کی اصلاح ہوئی تھی خود شاہ صاحب اپنی تقریروں اور کوششوں کی روح اور اپنی زبان کے اثر

(۱) مکتوب مولانا محمد علی صاحب جالندھری بنام مؤلف۔ (۲) روایت مولانا عبدالجلیل صاحب

اور اس محنت وجفاکشی کے تحمل کا راز ایک مخلص اور مقبول بندہ کے ساتھ تعلق اور اسکی دعاؤں اور محبت کو سمجھتے تھے اور اس پر ان کو بڑا ناز اور بہت اعتماد تھا، احرار سے محبت کی وجہ ان کی شان قلندرانہ اور جرأت رندانہ تھی، ہر نئے فتنہ اور جدید فرقہ کے مقابلہ میں یہ سینہ سپر اور سر بکف ہوتے، قادیانیت، رفض وتفضیل اور متعدد ایسی گمراہ کن تحریکیں تھیں جن کے مقابلہ میں یہی سر پھرے میدان میں آتے، ؎

کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

اس لئے حضرتؒ اس جماعت کے کارکنوں کی بہت سی کوتاہیوں اور غلطیوں سے بھی چشم پوشی فرماتے اور ان کے جذبہ اور ہمت کی قدر کرتے۔

تحریک قادیانیت کی تردید اور اس کا مقابلہ

حضرتؒ نے قادیانیت کا آغاز اور اسکے سب دور اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، خود مرزا صاحب اور حکیم نورالدین صاحب اور اس تحریک کے بڑے بڑے ذمہ داروں سے قریبی واقفیت تھی، آپ اس تحریک کے حقیقی مقاصد اور اسکے اندرونی حالات سے بخوبی آگاہ تھے اور اسکو اسلام کی بیخ کنی اور تخریب کا ذریعہ سمجھتے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے عشق ومحبت کا جو تعلق اور آپکے ختم رسل اور امام رسل ہونے پر جو اعتماد ویقین تھا، اسکی بنا پر آپ نبوت کے ہر مدعی کو نبوت محمدی کا رقیب وحریف سمجھتے تھے اور اس سے آپ کو ایسی ہی نفرت اور غیرت آتی تھی جیسے ایک غیرت مند عاشق اور ایک وفادار غلام کو آنی چاہئے تھی یہی جذبہ تھا جس نے آپ سے پہلے مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا سید انور شاہ کشمیری کو مضطرب وبیقرار بنا رکھا تھا اور انھوں نے قادیانیت کی مخالفت کو اپنے لئے افضل عبادات اور افضل جہاد سمجھا تھا، حضرت بھی اس بارے میں طبعی اور وجدانی طریقہ پر صاحب یقین اور صاحب حال تھے

تحریک احرار ختم نبوت اور احراری رہنماؤں اور علماء میں درحقیقت آپ ہی کا جذبہ اور آپ ہی کی روح کام کر رہی تھی، آپ اس سلسلہ کی ہر کوشش کو وقت کا اہم فریضہ اور دین کی اہم خدمت سمجھتے تھے اور ہر طرح اسکی ہمت افزائی اور سرپرستی فرماتے تھے اور دل وجان سے اسکی خدمت وتقویت کو ضروری سمجھتے تھے، ان کوششوں کے تذکرہ سے آپکے اندر شگفتگی اور تازگی پیدا ہوتی تھی اور وہ آپ کی روح کی غذا بن گئی تھی، مولانا محمد علی صاحب فرماتے ہیں،

"مرزائیت کی نسبت جس قدر متفکر رہتے آپ کو معلوم ہی ہے، جب میں حاضر ہوتا فرماتے "مرزائیوں کا کیا حال ہے" اگر کوئی خوشی کی بات بتائی جاتی اکثر فرماتے الحمد للہ، اگر ہنسی والی بات ہوتی تو ایسا ہنستے کہ تمام بدن مبارک متحرک ہو جاتا۔"

"ایک دفعہ حاضر ہوا تو ایک نوٹ نکال کر عطا فرمایا کہ ختم نبوت کے کام کی امداد میری طرف سے، پھر مجلس میں حاضرین کو توجہ دلائی، سب نے امداد کی حضرت مولانا فضل احمد صاحب نے دس روپیہ کا نوٹ نکال کر دیا، فرمایا پانچ روپیہ رکھ لو میں پانچ کا نوٹ واپس کرنے لگا، حضرت نے فرمایا" واپس کیوں لیتے ہو، یہ بھی دے دو" انھوں نے وہ بھی دے دیا۔"

اس سلسلہ میں جو لوگ نمایاں حصہ لیتے تھے اور جنھوں نے رات دن ایک کر رکھا تھا، ان سے حضرتؒ کو نہایت محبت تھی اور ان کی نہایت قدر فرماتے تھے اور اپنی محبت وپیار کا اظہار فرماتے، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے بعد مولانا محمد علی جالندھری اس میں پیش پیش تھے حضرتؒ ان سے بڑی محبت وشفقت فرماتے تھے اور ان کا بڑا اکرام کرتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

"ایک دفعہ صبح آٹھ بجے کے قریب لائل پور حاضر ہوا، زمین کے فرش پر دھوپ میں تشریف فرما تھے، آگے ہو کر فرش پر بیٹھنے کا حکم دیا، میں تھوڑا آگے ہوا، بالکل برابر بٹھا کر کمر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا "میرا چاند آیا"۔

"میری موجودگی میں جب حضرت والا کی خدمت میں دودھ پیش کیا جاتا تب فرماتے مولوی صاحب کو پلاؤ، میں پی کر کیا کروں گا، یہ تو کام کرتے ہیں، خدام اصرار کر کے پلاتے اور کہتے اور دودھ مولوی صاحب کو پلا دیں گے، پھر بھی پورا نہ پیتے بلکہ چھوڑ کر فرماتے "مولوی صاحب کو پلا دو" اس طرح بارہا حضرت کا تبرک ملا۔"[1]

مولانا محمد صاحب انوری لکھتے ہیں:۔

"آخر عمر میں حضرت اقدس کو ردِّ مرزائیت کی طرف بڑی توجہ ہو گئی تھی، مولوی محمد حیات صاحب کو (جنھیں قادیانیوں اور لاہوریوں کی کتابیں ازبر ہیں) بلا کر مباحث سنتے تھے اور مولوی لال حسین اختر کو بلا بھیجتے تھے مولانا محمد ابراہیم میر صاحب سیالکوٹی کی شہادت القرآن کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے دوبارہ اس کو طبع کرانے کے بڑے متمنی تھے، آخر کار حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کی توجہ مبارک سے اسکی دوبارہ اشاعت ہو گئی اور ایک علمی خزانہ ہاتھ آگیا، علماء جو ادھر اُدھر کے مسائل میں الجھے رہتے ہیں، حضرتؒ کو بڑا اصرار رہتا تھا ان ابحاث میں حضرتؒ نہیں پڑتے تھے بلکہ اہم کام ردِّ مرزائیت کو قرار دیتے تھے۔"[2]

(۱) مکتوب مولانا محمد علی جالندھری بنام مؤلف (۲) تحریر مولانا محمد صاحب انوری

حضرتؒ ہی کے حکم اور ایما پر تحریک ختم نبوت میں مولانا محمد صاحب جیل گئے، مولانا لال حسین صاحب اختر کے لئے اسی سلسلہ کی سعی و جہد کو وظیفہ اور سلوک قرار دیتے تھے اور اس کو انکی ترقی کا ذریعہ بتاتے تھے، جنوری ۱۹۵۳ئ میں ختم نبوت کی تحریک شروع ہوئی، حضرتؒ ہمہ تن اس کی طرف متوجہ رہے اور اسکی فکر اور اس کا اثر پورے طور پر آپ کی طبیعت قوی فکریہ اور اعضاء و جوارح پر مستولی ہو گیا، محمد افضل صاحب (سلطان فاونڈری والے) کہتے ہیں کہ تحریک کے زمانہ میں آپ ایک مرتبہ اپنے وطن ڈھڈیاں تشریف لائے ہوئے تھے پنجاب کے ایک مشہور عالم کہیں قریب و جوار میں تشریف لائے تھے، حضرت کی موجودگی کی اطلاع پاکر زیارت کے لئے ڈھڈیاں آئے، آپ کی نگاہ جب ان پر پڑی تو آپ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ انکے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے، اس وقت لاہور اس تحریک کا مرکز تھا، اور یہاں گاؤں ہونے کی وجہ سے دیر میں خبریں پہنچتی تھیں، آپ کو خیال تھا کہ یہ دورہ کرتے ہوئے آرہے ہیں، ان کو تازہ حالات کا علم ہوگا، آپ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ ان سے تحریک کی رفتار اور لاہور کے حالات کے متعلق دریافت کیا، انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا (جس سے بے توجہی اور عدم دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا) حضرت بہت مایوس اور پژمردہ ہوئے کہ یہ شہر سے آرہے ہیں کچھ تازہ حال سنائیں گے مگر یہ تو بالکل ناواقف اور بے تعلق نکلے محمد افضل صاحب یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں تحریک ختم نبوت کے رہنماؤں پر مقدمہ چل رہا تھا اور مولوی مظہر علی اظہر احرار کے پیرو کار اور وکیل تھے، حضرتؒ نے ایک روز مجھ سے فرمایا کہ کل ذرا سویرے موٹر لے آنا کہیں چلیں گے، میں موٹر لیکر حاضر ہوا، حضرتؒ، مولوی مظہر علی کی کوٹھی پر تشریف لائے اور تنہا ان کے پاس تشریف لے گئے، بہت دیر تک تنہائی میں ان سے باتیں کیں، خاصی دیر کے بعد باہر تشریف لائے۔

اس موضوع اور مقصد سے حضرتؒ کی شیفتگی اور شغف کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حکومت پنجاب کے ماتحت جنوری ۱۹۵۸ء میں لاہور میں اسلامک کلوکیم (مذاکرہ اسلامی) منعقد ہوا، اس میں مشرق وسطیٰ کے بڑے ممتاز اور نامور عالم شریک ہوئے، انھوں نے بعض شرکاء جلسہ اور پاکستانی علماء سے قادیانیت کے متعلق سوالات کئے اور اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ اگر عربی زبان میں اس مذہب اور تحریک کے متعلق کوئی کتاب یا مضمون ہو تو ان کو پڑھنے کیلئے دیا جائے ان کا خیال تھا کہ اسی سرزمین میں مذہب و تحریک پیدا ہوئی، اس کو سمجھنے کا یہاں سے بہتر موقعہ نہیں مل سکتا، لیکن عربی میں کسی موزوں کتاب کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے جس میں اس تحریک اور اس کے بانی کے تعارف اور اس مذہب کی حقیقت اور اسکی تاریخ بیان کی گئی ہو، ان کو کوئی چیز پیش نہ کی جا سکی، جو لوگ کلوکیم میں شریک ہوتے تھے اور وہاں کی کارروائی سے واقفیت رکھتے تھے، وہ اکثر شام کی مجلس میں حضرتؒ سے وہاں کی روداد بیان کرتے تھے، حضرتؒ کو یہ سن کر بڑا صدمہ ہوا کہ ان اہم علماء کی فرمائش پوری نہیں کی جا سکی اور قادیانیت کے بارے میں عربی زبان میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس سے اسکی حقیقت معلوم ہو سکے، راقم سطور بعض مجبوریوں کی بنا پر کلوکیم میں نہیں پہونچ سکا تھا، اور چند دن کی تاخیر سے حضرتؒ کی خدمت میں لاہور حاضر ہونے والا تھا، حضرت نے اس موقع پر فرمایا کہ وہ آئیں گے تو ہم ان سے چمٹ جائیں گے کہ یہ کام کر کے جاؤ۔

میں جب لاہور پہنچا تو حضرت نے یہ سب واقعہ سنایا اور فرمایا کہ تم عربی میں ایک کتاب لکھ دو، مولانا محمد حیات صاحب کو اور دوسرے احباب اور خدام کو حکم ہوا کہ وہ اس کے لئے ضروری مواد اور سامان مہیا کر دیں، حضرت کا یہ قلبی تقاضا دیکھ کر اور حکم سن کر اپنی بے بضاعتی اور نااہلی کے باوجود میں نے حکم کی تعمیل کا وعدہ کر لیا، صوفی عبدالحمید صاحب کی

کوٹھی پر قیام تھا، انھوں نے اپنا کمرہ عنایت فرما دیا، دو ایک دن کے اندر قادیانیت کا کتب خانہ اور مرزا صاحب کی تقریباً تمام تصنیفات جمع ہوگئیں اور کام شروع ہوگیا۔

میرے لئے بڑی دقت اور آزمائش یہ تھی کہ مجھے اس موضوع سے کبھی ذوق اور واسطہ نہیں رہا تھا، اپنے پیدائشی ادبی ذوق اور اپنے مخصوص علمی و تعلیمی ماحول کے اثر سے مجھے مناظرانہ مباحث سے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی، بالخصوص مرزا صاحب کی کسی کتاب کے چند صفحے پڑھنا بھی میرے لئے مجاہدۂ عظیم تھا، اور میں کبھی اس پر قادر نہ ہو سکا، صرف تحریک ختم نبوت کے زمانہ میں چونکہ ممالک عربیہ کے اخبارات میں یک طرفہ اطلاعات شائع ہو رہی تھیں اور تصویر کا صرف ایک ہی رخ پیش کیا جا رہا تھا، قادیانی جماعت کو محض ایک ایسے ستم رسیدہ فرقہ کی حیثیت سے دیکھا جا رہا تھا جو اکثریت اور جاہل و متعصب مسلمانوں کی ہر طرح کی دست درازیوں کا نشانہ بنا ہوا تھا، میں نے اپنے عرب دوستوں کو حقیقت حال سے مطلع کرنے کے لئے ابتداءً ایک خط کی شکل میں (جو بعد میں ایک رسالہ کی صورت میں شائع ہوگیا[1]) قادیانیت اور پاکستان کی تحریک ختم نبوت کے متعلق کچھ لکھا تھا، جس کا سرمایۂ علم صرف پروفیسر الیاس برنی صاحب مرحوم کا ایک رسالہ "قادیانیت کا محاسبہ" اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا "قادیانی مسئلہ" تھا، یہی میرے علم و مطالعہ کی کل کائنات تھی، اب مجھے ایک ناقدانہ مستقل علمی تصنیف مرتب کرکے حضرتؒ کی خدمت میں پیش کرنی تھی، اس کے لئے مرزا صاحب کی ساری تصنیفات اور ممکن الحصول قادیانی لٹریچر کا مطالعہ کرنا ضروری تھا، پھر اسکی تنقید اور تردید، افتادِ طبع، قدیم تعلیم و تربیت

---

(۱) یہ رسالہ "القادیانیۃ ثورۃ علی النبوۃ المحمدیۃ والاسلام" کے نام سے پہلے ہندستان میں شائع ہوا اسکے بعد مفتی امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین اور بعض شامی دوستوں نے اسکو اپنے طور پر بھی شائع کیا۔

طبعی ذوق ورجحان، ہر ایک کا ناطق فیصلہ یہ تھا کہ یہ کام میری دسترس سے باہر اور میرے مزاج کے بالکل خلاف ہے لیکن انکار اور معذرت کی نہ گنجائش تھی نہ جراءت، اللہ تعالیٰ کے اعتماد و توکل پر اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ایک علمی و تصنیفی اعتکاف کی نیت کرلی اور اپنے کام میں لگ گیا۔

حضرت اس کام کی تکمیل کی طرف پوری طرح متوجہ تھے ان کو کسی طرح گوارا نہ تھا کہ میں اس عرصہ میں اپنا وقت کسی اور کام میں صرف کروں، کسی ضروری سے ضروری تقریب میں شرکت کیلئے کوٹھی سے باہر جانا بھی حضرت کو گراں گزرتا تھا، کبھی اس کا علم ہوجاتا کہ کوئی دوست اصرار کرکے لے گئے تو فرماتے کہ پھر یہ کام کیسے ہوسکے گا، یہ کام اس وقت سب سے زیادہ ضروری ہے، دن بھر لکھنے میں مصروفیت رہتی، شام کو عصر کی مجلس میں اور کبھی اس سے پیشتر دن بھر کے کام کا جائزہ لیتے، جو کچھ کیا ہوتا اس کو سنتے، اس وقت کسی اور موضوع کا چھیڑنا گوارہ نہ تھا، کوئی بڑے سے بڑے شخص اس طرح بیٹھ جاتے کہ میں آڑ میں ہوجاتا تو ان کو متوجہ فرمادیتے، اس موضوع سے خاص تعلق رکھنے والے جو علماء تشریف لاتے اور جن کی اس موضوع پر گہری اور وسیع نظر ہوتی ان سے ارشاد ہوتا کہ وہ میرے کام کو ملاحظہ فرمائیں اور اپنی معلومات سے مستفیض کریں، غرض اس عرصہ میں یہی موضوع اور یہی ذوق در و دیوار پہ چھایا ہوا تھا،

کتاب بحمد اللہ ایک مہینہ کے اندر اندر مرتب ہوگئی اور ۲۷؍ فروری ۱۹۵۸ء کو میں اس سے فارغ ہوگیا، مجھے اس کتاب کی تصنیف کے سلسلہ میں خوب اندازہ ہوا کہ حضرتؒ کی فراست اور وجدان اس فرقہ کے بارے میں بالکل صحیح اور حق بجانب ہے، تخریب اسلام اور اسلام کو اپنے مرکز سے ہٹانے میں کوئی سازش اتنی خطرناک اور کامیاب نہیں ثابت ہوئی

جتنی یہ سازش اور کوشش

میرے لئے اور ان سب دوستوں کے لئے جو میری افتاد طبع اور ثقافت سے واقف ہیں اور انھوں نے یہ کتاب بھی پڑھی ہے یہ بات سخت تعجب خیز ہے کہ یہ کتاب اس قلیل عرصہ میں ایک ایسے شخص کے قلم سے کیسے تیار ہوگئی جو اس موضوع کے ابجد سے بھی ناواقف اور اس کوچہ سے یکسر نابلد تھا، تقریباً ایک مہینہ کی قلیل مدت میں اس پورے کتابی ذخیرہ کا جائزہ بھی لیا گیا، نوٹس بھی تیار کئے گئے اور عربی میں منتقل بھی کر لیا گیا، اگر اس کو حضرتؒ کی کرامت سمجھا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا، میں اب بھی جب کبھی اس کو دیکھتا ہوں مجھے خود حیرت ہوتی ہے اور اس کو محض تائید غیبی اور ایک مخلص کی دعا اور فکر کا نتیجہ سمجھتا ہوں،

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں

مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

یہ کتاب کچھ عرصہ کے بعد "القادیانی والقادیانیۃ" کے نام سے خوبصورت عربی ٹائپ میں طبع ہوگئی اور مصر و شام نیز افریقہ کے ان حصوں میں جہاں قادیانیت نے فروغ حاصل کرنا شروع کیا تھا اس نے بڑی مفید خدمت انجام دی اور کہیں کہیں اس نے ایک لشتہ کا کام دیا(۱) والحمد للہ وحدہٗ،

اس کے ٹھیک ایک سال بعد جب ۱۹۵۹ء میں دوبارہ لاہور حاضر ہوا تو ارشاد ہوا کہ اب اس کو اردو میں منتقل کردو، کتابی ذخیرہ پھر جمع کیا گیا تاکہ اصل عبارتیں نقل کی جائیں، اس نقش ثانی میں کچھ اضافہ بھی کیا گیا اور مہینہ کے اندر اندر یہ ترجمہ بھی تیار ہوگیا(۲) جو قادیانیت

(۱) ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۲ء) میں اس کا دوسرا ایڈیشن ندوۃ العلماء پریس سے شائع ہوا۔

(۲) اسوقت حضرت کا قیام حاجی متین احمد صاحب کی کوٹھی واقع ایمپرس روڈ پر تھا، وہیں اس ترجمہ کی تکمیل ہوئی

کے نام سے لاہور سے شائع ہوا[1]، اور اس نے سنجیدہ حلقہ میں بہت جلد اپنی جگہ پیدا کرلی، اخبارات ورسائل نے بالعموم اس پر بڑے اچھے تبصرے کئے اور خاص طور پر اس کی متانت اور زبان کی ثقاہت، مستند معلومات اور محکم استدلال کی داد دی، حضرت نے اپنے علو مرتبت کے باوجود اس کے خریدنے کی ترغیب دی، کئی بار مجلس میں پڑھی گئی، قادیانی حلقے نے اس کتاب کا خاصہ وزن محسوس کیا، "الفضل" اور "پیغام صلح" نے مسلسل اس پر تنقید شائع کی، لیکن بقول مولانا نصر اللہ خاں عزیز مدیر "ایشیا" "یہ مضامین اس کے اثر کو کم نہیں کرسکے"۔

اس طویل داستان سے مقصود حضرتؒ کے اس شغف اور فکر واہتمام کا اظہار ہے جو آپ کو اس مسئلہ کے ساتھ تھا، اور جو بقدر تعلق آپ کے اہل تعلق میں کارفرما ہے۔

(۱) یہ ایڈیشن ختم ہوگیا، دوسرا ایڈیشن لکھنؤ سے شائع ہوا ہے اور لاہور میں بھی زیر طبع ہے کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ظفر اسحٰق صاحب انصاری ایم۔ اے کے قلم سے ہوگیا ہے جو اکتوبر ۱۹۶۵ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا انڈونیشیا کی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے لیکن ابھی اسکی اشاعت کا انتظام نہیں ہوسکا ہے۔

چودھواں باب (۱۴)

حضرت رائے پوری اور ان کے معاصرین

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس (خواجہ حافظ)

معاصرت کی نزاکت حضرت مولانا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے حصہ میں ارشاد و تربیت کا جو زمانہ اور خدمت و افادۂ خلق کیلئے جو علاقہ آیا وہ ان نامور و ممتاز مشائخ و علماء سے معمور تھا جو خود مرجع طالبین اور مرکز ارشاد و اصلاح تھے، ایسی حالت میں سب سے نیازمندانہ و مخلصانہ تعلقات کا قائم رکھنا اور سب کی نظر میں وقیع و مقبول اور معتمد علیہ ہونا بڑا مشکل کام ہے، یہ بلند درجے کے اخلاص، للّٰہیت و بے نفسی، نیز منجانب اللہ مقبولیت، کمال ذاتی، استقامت اور جامعیت کے بغیر ممکن نہیں، بزرگان دین و مشائخ کے تذکرے میں اکثر یہ روایت دہرائی گئی ہے کہ ایک بزرگ اپنے شیخ کے حکم سے یا اشارہ غیبی سے کسی علاقہ میں تشریف لے گئے، اور وہاں قیام کرنے کا فیصلہ فرمایا، وہاں ایک بزرگ پہلے سے مقیم اور ارشاد و تربیت میں مشغول تھے، انھوں نے پانی کا ایک بھرا ہوا پیالہ ان نو وارد بزرگ کی خدمت میں بھیجا، اشارہ تھا کہ پیالہ لبالب ہے، اس میں اب کسی اضافہ کی گنجائش نہیں، ان نو وارد بزرگ نے اس میں ایک گلاب کا پھول ڈال دیا،

اشارہ تھا کہ میں اس طرح سے رہوں گا جیسے پھول پانی پر تیرتا ہے اور اس کا کوئی وزن محسوس نہیں ہوتا، اس واقعہ کی تاریخی حیثیت کچھ بھی ہو لیکن یہ ایک بڑی حقیقت کی بڑی لطیف تعبیر ہے کہ ہر چند کہ عارف شیرازی نے فرمایا ہے:-

"دہ درویشے در گلیمے بگنجند" (دس فقیر و مرد خدا ایک کملی میں سما سکتے ہیں)

پھر بھی اہل قلب کے درمیان (جن کی ذکاوت حس اور لطافت روح کے سامنے بادشاہوں کی نازک دماغی کوئی حقیقت نہیں رکھتی) رہنے کے لئے ایسی بے نفسی، ایسی سبک روحی، بڑی جامعیت اور ایسی روشن ضمیری کی ضرورت ہے کہ کوئی بد اندیش یا کوئی غالی معتقد بھی انکے آپس کے تعلقات میں رخنہ نہ ڈال سکے اور ان کے قلب صافی پر کبھی میل نہ آسکے، ....

.... حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ نے اس نازک مرحلہ کو بڑی کامیابی کے ساتھ طے کیا، اگرچہ بعض حضرات سے طرز تربیت کا اختلاف تھا، بعض حضرات سے ذوق کا، بعض حضرات سے سیاسی مسلک و خیالات کا، اور یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ:-

"ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"

مشترک احترام و اعتماد

لیکن اس کے باوجود نہ کسی بزرگ کے ساتھ نیازمندی و عقیدت میں فرق آیا، نہ ان معاصر بزرگوں کے ہاں آپ کا جو احترام و اعتماد تھا اس میں تغیر ہوا، تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اگر ان معاصر شخصیتوں میں سے آپ کے یہاں کسی شخصیت کا تذکرہ ہوتا تو ناواقف یا نووارد سمجھتا کہ ایک مرید اپنے شیخ کا تذکرہ کر رہا ہے اور اگر ان بزرگوں میں سے کسی کے یہاں آپ کا ذکر خیر ہوتا تو معلوم ہوتا کہ کسی شیخ وقت کا تذکرہ ہو رہا ہے، ہر جگہ دیکھنے والوں کو "ویؤثرون علی انفسھم" کا منظر نظر آتا اور حقیقت یہ ہے کہ یہی اہل دین و مخلصین کا شیوہ ہے اور یہی ان کا اور اہل دنیا کا امتیاز

معلوم ہوتا ہے۔ ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون،

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

معاصر مشائخ اور اہل ارشاد میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سب سے معمر اور نامور تھے، حضرت مولانا عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے بلند الفاظ میں آپ کا تذکرہ کرتے تھے، ایک مرتبہ میرے سامنے فرمایا کہ "حضرت تھانویؒ تصوف کے مجدد تھے"۔ ایک مرتبہ ایک صاحب تھانہ بھون سے آئے وہ وہاں کسی واقعہ پر ناراض ہو کر آئے تھے اور حضرت کے سامنے بے ادبی کے ساتھ وہاں کا تذکرہ کرتے تھے، آپ نے فرمایا کہ "حضرت تھانویؒ میرے بھی شیخ ہیں"۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔(۱) خود دو ایک بار تھانہ بھون حاضری بھی دی؛

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ کا بڑا اکرام فرماتے تھے اور آپ کا ذکر اعتراف و احترام کے ساتھ کرتے تھے حکیم الامت نے ایک مرتبہ کسی صاحب کی فرمائش پر معاصر مستند مشائخ کے ناموں کی فہرست تحریر فرمائی جن میں سے کسی سے بلا تکلف بیعت کا تعلق قائم کیا جا سکتا تھا۔ اس میں سر فہرست حضرت ہی کا نام تھا۔(۲) ایک بار حضرت تھانہ بھون تشریف لے گئے، واپس ہونے لگے تو حضرت تھانویؒ اسٹیشن تک پہنچانے گئے اور آپ کے پیچھے آپ کا ذکر خیر بار بار کرتے رہے۔(۳)

مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ محبت و عقیدت، احترام و اعتماد کا جو غیر معمولی معاملہ تھا، اس کا تذکرہ سیاسی مسلک کے باب میں گزر چکا ہے، تقسیم سے پیشتر اور اس کے بعد بھی مولانا

---

(۱) روایت مولانا عبد الجلیل صاحب (۲) ملاحظہ ہو حکیم الامت از مولانا عبد الماجد دریابادی

(۳) حکیم الامت، از مولانا عبد الماجد دریابادی

کی تائید و حمایت اور ان کی ذات کے ساتھ اپنے تعلق و عقیدت کے اظہار کا آپ پر ایسا جوش تھا کہ آپ اس میں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کرتے تھے، بلکہ جس مجلس میں مولانا کا کوئی ناقد یا مخالف ہوتا وہاں اور زیادہ جوش کے ساتھ ان کے فضائل و مناقب بیان کرتے اور ان کے خلوص و مقبولیت کا اعلان فرماتے ایک مرتبہ کسی ایسے ہی موقع پر جب یہ ناچیز بھی حاضر تھا اور شاید کچھ مخالفین بھی تھے بڑے جوش کے ساتھ فرمایا۔ ان کے مخالفین ذرا ان کے چہرہ کو بھی دیکھیں اور اپنے چہرہ کو بھی" ایک مرتبہ بعض آنے والوں نے مولانا کے سیاسی مسلک اور ان کے سیاسی انہماک پر کچھ اعتراض کیا یا اپنے تعجب کا اظہار کیا تو فرمایا کہ "اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں ان کے سفروں میں خادم کی طرح ان کے ساتھ رہتا اور ان کی ادنیٰ ادنیٰ خدمتیں انجام دیتا

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ان کے ساتھ جو معاملہ تھا اور آپ کے دل میں حضرت کی جو محبت و عزت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے جو حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کے ایک خادم مولوی مقبول احمد صاحب (ساکن ملیان، حال مدرس جامعہ رشیدیہ منٹگمری) نے سنایا، وہ فرماتے ہیں:۔

"احقر ۱۹۴۶ء-۴۷ء میں دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا، مارچ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں اچانک حضرت رائے پوری کا والا نامہ جو مولانا حبیب الرحمن صاحب (نو مسلم) کے قلم سے تھا موصول ہوا، جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے احقر سے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا پروگرام معلوم کیا تھا کہ آیا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس جمعہ کو دیوبند مقیم ہوں گے یا سفر کا ارادہ ہے؟ حضرت رائے پوریؒ نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ اپنے طور پر تحقیق کر کے جواب لکھیں، احقر عصر کے بعد حسب معمول حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ پر حاضر

ہوا، قبیل مغرب جب مجلس برخاست ہوئی تو احقر نے حضرت سے دریافت کیا کہ حضرت اس جمعہ کو قیام ہوگا یا سفر کا نظام ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا کیوں پوچھتے ہو؟ میں نے عرض کیا "حضرت بس ویسے ہی پوچھ رہا ہوں" ہنس کر فرمانے لگے کہ "سی، آئی، ڈی تو نہیں ہو؟" میں بہت گھبرایا، میں نے اپنی جان بچانے کے لئے حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب گرامی پیش کردیا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھا اور بوسہ دیکر پیشانی پر لگایا اور فرمایا کہ اس کا جواب میں خود تحریر کردوں گا، اب مجھے اور تشویش ہوئی کہ حضرت رائے پوری خیال فرمائیں گے کہ مقبول رازداری سے کام نہ لے سکا اور اس خدشہ کو حضرت مدنی کے سامنے پیش بھی کردیا، حضرت نے ازراہِ شفقت فرمایا کہ اچھا تحریر کردو کہ اس جمعہ کو انشاء اللہ قیام ہی ہوگا اور مجھ سے فرمانے لگے کہ جانا بھی ہوگا تو نہیں جاؤں گا، جواب تحریر کردیا گیا اور حضرت جمعہ کی صبح کو دیوبند تشریف فرما ہوئے اور اسی دن شام کی گاڑی پر سہارنپور واپسی ہوگئی۔(۱)

بارہا اسکی نوبت آئی ہے کہ حضرت مدنیؒ کا کہیں سفر طے ہوا، پھر کسی وجہ سے اس کا التوا ہوگیا آپ سہارنپور تشریف لائے اور حضرت شیخ الحدیث سے فرمایا کہ اتفاق سے یہ دن خالی ہوگیا ہے، چلو رائے پور ہو آئیں، شیخ فرماتے ہیں کہ دسیوں مرتبہ ایسا ہوا۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ

حضرت رائے پوریؒ، مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص قوت نسبت اور مقبولیت کے بڑے قائل و معتقد تھے، کبھی حضرت دہلویؒ کے سوا اور طرح سے

(۱) مکتوب مولوی مقبول احمد صاحب جامعہ رشیدیہ منٹگمری۔

نام نہیں لیا، اپنے خدام کو بڑی تاکید و اہتمام کے ساتھ حضرت کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے، اور خود بھی بڑے اہتمام کے ساتھ نظام الدین تشریف لے جاتے اور کئی کئی روز قیام فرماتے، مرض وفات میں کئی ہفتے پہلے سے مقیم تھے، وفات کے بعد ہی تشریف لائے مولانا منظور صاحب نعمانی نے جب حضرت کی طرف رجوع ہونے کا ارادہ کیا اور بیعت واصلاح کا تعلق قائم کرنا چاہا تو حضرتؒ نے نظام الدین جانے کا مشورہ دیا، اور وہاں حضرت کی خدمت میں پڑجانے کی ہدایت فرمائی مولانا راوی ہیں کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرض وفات میں ان کے متعلق حضرت نے ایک بار فرمایا کہ آج کل روزانہ ہزاروں میل کی رفتار سے جا رہے ہیں"(۱) مولانا نے نظام الدین میں چند دن قیام کرنے کے بعد ایک مکتوب میں اپنے تأثرات کا اظہار کیا تو حضرت نے اسکے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں نے آپ کو وہاں ٹھہرنے کا مشورہ اسی لئے دیا تھا کہ آپ دیکھ لیں کہ اللہ والے ایسے ہوتے ہیں اور ان کی سطح اتنی بلند ہوتی ہے"(۲)

حضرت ہمیشہ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ابتدائی مجاہدات کا بڑے اہتمام سے ذکر فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ بعد کی یہ مقبولیت و محبیت اور یہ تاثیر و ہدایت اسی کا نتیجہ ہے۔

مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی حضرت کے ساتھ غیر معمولی تعلق اور ارتباط رکھتے تھے اور بڑے بلند کلمات ارشاد فرماتے تھے، ایک بار فرمایا کہ جب میوات کا سفر پیش آتا ہے اور اس میں سخت اختلاط و مشغولیت رہتی ہے تو میں اسکے بعد یا تو اعتکاف کرتا ہوں یا رائے پور چلا جاتا ہوں، رائے پور بڑے اہتمام کے ساتھ حاضر ہوتے، عرصہ

(۱) اشارہ ترقی باطنی اور سفر روحانی کی طرف ہے، (۲) روایت مولانا منظور صاحب نعمانی۔

تک معمول رہا ہے کہ کچھ دور سے پیادہ پا تشریف لاتے، اپنے اہل تعلق و خدام کو کچھ دن یکسوئی کے ساتھ ذکر کرنے کے لئے اور حضرت کی صحبت سے مستفیض ہونے کے لئے بڑے اہتمام سے بھیجتے تھے، تبلیغی جماعتوں کو بھی اہتمام کے ساتھ روانہ کرتے اور بالعموم انھیں لوگوں کو امیر بناتے جو ذکر سے مانوس اور بزرگوں کی خدمت میں رہنے کے آداب سے واقف ہوتے، حضرتؒ کے خادم مولانا عبدالمنان راوی ہیں کہ حضرت مولانا الیاسؒ نے ایک بار ان سے دہرادون میں فرمایا کہ اپنے شیخ (حضرت رائے پوریؒ) کی خدمت میں باوضو رہا کرو کہ ان کی نسبت حضرت فضیل بن عیاض کی نسبت ہے۔

حضرت مولانا الیاس صاحب کی نگاہ میں آپ کا جو مرتبہ اور جو عزت و منزلت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو مجھ سے حاجی میر آل علی صاحب سہارنپوری نے بیان کیا، میر صاحب فرماتے ہیں[1]۔

○ سہارنپور میں مولانا حافظ عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر علوم کی پیٹھ پر کاربنکل ہو گیا تھا سخت تکلیف تھی، مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلی سے اور حضرت رائے پوری رائے پور سے عیادت کے لئے آئے، یہ دونوں حضرات اور حضرت شیخ الحدیث مزاج پرسی کے لئے گئے، جب رخصت ہونے لگے اور رائے پور جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو حافظ صاحب پر بڑا اثر ہوا اور زندگی سے مایوسی کا اظہار کرنے لگے۔ نظام بن چکا تھا، یہ حضرات روانہ ہو گئے لیکن دل ڈر رہا تھا، سہارنپور سے چل کر بہٹ میں قیام ہوا، مغرب کی نماز کے لئے وضو کرتے ہوئے ان حضرات میں سے ایک صاحب نے حافظ صاحب کی نازک

(۱) افسوس ہے ...... کہ آپ کا انتقال ہو گیا غفر اللہ

علالت اور ان کے اظہار مایوسی پر کچھ تشویش کا اظہار کیا اور اس بات پر افسوس کیا کہ ہم لوگ ایسی حالت میں چلے آئے، حضرت رائے پوریؒ نے وضو کرتے ہوئے فرمایا کہ "نہیں حضرت کوئی بات نہیں"۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نوافل اوابین میں مشغول ہو گئے، مولانا کا معمول طویل قرأت کا تھا اور دیر میں فارغ ہوتے تھے، حضرت رائے پوری حسب معمول[1] مغرب کی سنتوں سے فارغ ہو کر چارپائی پر تشریف لے آئے، مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی دو یا دوسری دو رکعتوں کے بعد خلاف معمول جلد سلام پھیر لیا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے تیزی کے ساتھ حضرت کی طرف آئے اور فرمایا کہ حضرت میری نفلوں سے تو آپ کے پاس بیٹھنا زیادہ افضل ہے"۔

مرض وفات میں جب حضرت رائے پوری کا قیام مولانا کے پاس نظام الدین میں تھا تو ایک روز بعد مغرب مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے راقم سطور کو دریافت فرمایا کہ کہاں ہے؟ میں مسجد سے باہر تقریباً قدیم پولیس چوکی کی طرف چلا گیا تھا، ہر طرف آدمی دوڑے ایک صاحب وہاں بھی پہونچے اور مجھے خبر دی کہ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے منتظر ہیں، میں گھبرایا ہوا پہنچا، اس وقت حضرت کے ضعف کی حالت یہ تھی کہ لبوں کے قریب کان لا کر بات سننے میں آسکتی تھی، میں سوچ رہا تھا کہ کون سی اہم بات ہے جس کے لئے مجھے اس طرح طلب فرمایا گیا ہے، میں نے جب اپنے کان ہونٹوں کے قریب کئے تو فرمایا کہ "لوگوں کو تاکید کرو کہ حضرت رائے پوریؒ کی مجلس میں بیٹھا کریں"۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ

---

(۱) حضرت کو غلبہ ریاح کی قدیم شکایت تھی جس کی وجہ سے طویل نوافل نہیں پڑھ سکتے تھے۔

حضرت کو اس بات کا کتنا اہتمام ہے اور آپ حضرت رائے پوری کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اگرچہ عمر میں حضرت سے بہت چھوٹے ہیں اور ان کی طالب علمی اور ترقی باطنی کے سب مراحل حضرت کے سامنے ہی گزرے لیکن ان کی خداداد صلاحیتوں، فطری جوہر اور علو استعداد کی بنا پر حضرت کا تعلق ان سے نہ صرف انس ومحبت کا بلکہ احترام وعقیدت کا تھا، جن لوگوں نے حضرت کا برتاؤ ان کے ساتھ دیکھا ہے ان کے لئے سمجھنا مشکل تھا کہ یہ برتاؤ محض ایک عالم اور محدث کے ساتھ ہے جو عمر میں بہت چھوٹا ہے یا کسی شیخ معمر بزرگ کے ساتھ، حضرت ان کے متعلق ہمیشہ بڑے بلند کلمات فرماتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا کہ "حضرت گنگوہی کی نسبت حضرت شیخ الحدیث کی طرف منتقل ہو گئی" اکثر فرماتے تھے، ان چچا[1] بھتیجے[2] کے حالات بھی عجیب ہیں، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب مدینہ طیبہ کے آخری قیام میں حضرت شیخ الحدیث کو اجازت دی تو انھوں نے اپنی عادت اور ذوق کے مطابق اسکا کسی پر اظہار نہیں ہونے دیا، حضرت ہی نے اس کا چرچا کیا اور حضرت ہی کی وجہ سے لوگوں کو اس کا علم ہوا، اخیر اخیر تک اکثر رجوع ہونے والوں کو بالخصوص اہل علم کو شیخ الحدیث سے بیعت ہونے کا مشورہ دیتے تھے، جب کوئی لطیف یا نفیس چیز یا نیا ملبوس، رضائی وغیرہ پیش کرتا تو اکثر حضرت شیخ کی خدمت میں پیش فرما دیتے اسی طرح اگر سہارنپور کوئی کھانے کا تحفہ لاتا یا مرغ وغیرہ کہیں سے آتا تو حضرت شیخ کی آمد کا انتظار فرماتے اور سمجھتے کہ انھیں کے تشریف لانے پر وہ سوارت ہوگا ۱۳۶۹ھ کے آخری سفر حج کا انتظام ہوائی جہاز سے اس شوق سے فرمایا تھا کہ شیخ بھی ساتھ ہوں گے، فرماتے تھے کہ

(۱) مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ (۲) مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ

پاکستان جاتے ہوئے جب ہوائی جہاز پر بیٹھنا ہوا تو جی چاہا کہ شیخ بھی ایک مرتبہ ہوائی جہاز سے سفر کریں، خیال آیا کہ شیخ صرف حجاز کے لئے اس کو منظور فرمائیں گے، اس لئے ہوائی جہاز سے جانے کا انتظام کیا، لیکن اس سال ہندوستان میں کالرا پھیلنے کی شہرت کی وجہ سے دوسرے ملکوں سے قرنطینہ کے سخت احکام نافذ کردئے تھے اس کی وجہ سے ہوائی جہاز سے سفر حجاز کا سلسلہ ہی بند ہو گیا تھا، ۱۳۷۳ھ کے سفر حج کا ایک لطیفہ حضرت شیخ نے سنایا کہ مکہ معظمہ سے جدہ واپس آتے ہوئے حضرتؒ اپنے خدام کے ساتھ تھے اور میں اپنے قافلہ کے ساتھ، ایک جگہ پڑاؤ تھا، میں حاضر ہوا تو کچھ کھانے کا تذکرہ ہوا! میں نے عرض کیا کہ ہمارے قافلہ میں کھچڑی پکی تھی، حضرتؒ نے فرمایا ہم نے تو مرغ کھایا تھا، میں نے اس کا گلہ کیا تو فرمایا ہم اس کا کفارہ ادا کرینگے میں نے عرض کیا کہ حرم کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، یہاں کے مرغ کا کفارہ ایک مرغ سے نہیں ہو سکتا، فرمایا اچھا، ہم کفارہ ادا کریں گے، چنانچہ واپسی کے سفر میں راستہ بھر ان خدام سے جو ملنے آتے تھے مزاحاً فرماتے رہے کہ شیخ کے ایک لاکھ مرغ میرے ذمہ ہیں مجھے کفارہ ادا کرنا ہے، چنانچہ ہر جگہ کثرت سے مرغ پک کر آتے تھے، رائے پور میں شیخ کی آمد سے جو مسرت اور شگفتگی پیدا ہوتی اور تشریف لے جانے سے جو افسردگی اور اداسی نظر آتی اور حضرتؒ کے قلب مبارک پر اس کا جو اثر ہوتا اس کو دیکھنے والی آنکھیں بھی نہیں بھولیں، کبھی کبھی شیخ کے بعض مریدین و خدام سے فرمایا کہ "شیخ الحدیث میرے بھی شیخ ہیں"۔ پاکستان کا سفر ذرا طویل ہوتا تو شیخ سے ملنے کا تقاضہ شدت سے پیدا ہوتا اور یہی گویا واپسی کی دلیل ہوتی، فرماتے کہ "اب ہمیں نہ روکو شیخ بہت یاد آتے ہیں"، مرض وفات میں ایک موقع پر جب کہ شیخ کا خط آیا ہوا تھا بار بار حضرتؒ شیخ کے اخلاص محبت وضعداری اور یکساں تعلق پر آفریں کہتے رہے۔"

شیخ نے بھی حضرت کے ساتھ احترام و عقیدت، ادب و بزرگ داشت اور نیازمندی و خوردی کا ایسا تعلق رکھا جس سے بزرگان سلف کی یاد تازہ ہو گئی اور منتسبین و مدعیان تعلق کو معلوم ہو گیا کہ ادب اسے کہتے ہیں اور قدر دانی اور جوہر شناسی اس کا نام ہے اپنے شیخ و مرشد مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد شیخ نے مولانا مدنی ؒ اور حضرت رائے پوری ؒ کے ساتھ شیوخ و اکابر کا سا تعلق قائم کر رکھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نظر میں اس اخیر زمانہ میں ان دونوں سے بڑھ کر کوئی نہیں، مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد یہ ساری عقیدت و تعلق سمٹ کر حضرت ؒ کی ذات میں آگیا تھا جب بہٹ ہاؤس میں حضرت ؒ کا طویل قیام رہا، بلا تخلف روزانہ کا معمول تھا کہ عصر کی نماز پڑھ کر فوراً بہٹ ہاؤس تشریف لے جاتے، اس اندیشہ سے کہ کچھ تاخیر نہ ہو جائے، شام کی چائے جو عمر بھر کے معمولات میں شامل تھی مستقلاً چھوڑ دی تھی، حضرت ؒ کو جب اس کا علم ہوا تو بہٹ ہاؤس میں اس کا انتظام فرمانے کی تاکید کی، لیکن شیخ نے اصرار سے منع فرمادیا اخیر زمانہ قیام رائے پور میں باوجود اس کے کہ سفر خاص حالات و کیفیات کی بنا پر شیخ کے لئے مجاہدۂ عظیم تھا، ہر ہفتہ کا معمول تھا کہ جمعہ کی شام کو تشریف لے جاتے اور پیر کی صبح تشریف لاتے، حضرت کی راحت، ضعف اور طبیعت کی نزاکت کا بڑا اہتمام فرماتے مصافحہ کرنے والوں پر بھی پابندی عائد فرمادیتے اور اکثر فرماتے کہ مصافحہ سنت ہے اور اذیت حرام۔ پاکستان کا سفر پیش آتا تو شائقین و معتقدین کو قابو میں رکھنا انھیں کا کام تھا اکثر اسٹیشن پر مجمع کے سامنے عصا لے کر کھڑے ہو جاتے اور ہجوم کرنے والوں کو سختی کے ساتھ ڈانٹتے، بہت سے لوگ بالخصوص علمی اشتغال رکھنے والے حضرات شیخ ہی کے بار بار فرمانے سے حضرت کی طرف متوجہ ہوئے، بعض لوگوں کو جو حضرت ؒ کے علو شان

سے زیادہ واقف نہ تھے اور وقت کی قیمت نہیں پہچانتے تھے بار بار تحریر فرمایا کہ حضرت کی زندگی کو غنیمت سمجھو، چراغ سحری ہے"۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ حضرت شیخ کی خدمت میں جب پہلی بار حاضر ہوا اور شیخ کے بالاخانہ اور دارالمطالعہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہوا تو اس زمانہ میں وہاں ایک منظوم قطعہ وصلی کی شکل میں آویزاں تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر نفس کی اصلاح چاہتے ہو تو فلاں فلاں رذائل اخلاق نکال دو، اور فلاں فلاں صفات اپنے اندر پیدا کرو، نو عمری کا زمانہ تھا اور طبیعت میں شوخی تھی عرض کیا کہ "حضرت ان مفرد اجزاء کا تلاش کرنا اور مختلف پنساریوں کے ہاں سے دواؤں کا اکٹھا کرنا تو بڑا مشکل ہے کہیں بنا بنایا نسخہ ملتا ہو تو بتائیے" برجستہ فرمایا کہ "رائے پور کی نہر کے کنارے"۔

حضرتؒ کے حالات و واقعات کا جاننے والا بھی شیخ سے زیادہ مشکل سے کوئی ملے گا، کثرت سے جزئیات یاد ہیں اور یادداشت میں مندرج ہیں خطوط کا بھی ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہے، چنانچہ اس کتاب کی ترتیب میں سب سے بڑی مدد و رہنمائی شیخ ہی سے حاصل ہوئی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کا ڈھانچہ شیخ ہی کی عنایت فرمائی ہوئی معلومات اور مہیا کی ہوئی تحریرات سے بنا ہے، یہی معاملہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی سوانح کے ساتھ رہا، اگر حضرت شیخ کی رہنمائی و سرپرستی نہ ہوتی تو ان دونوں چیزوں کا مناسب طریقہ پر مرتب ہونا اگر محال نہیں تو دشوار ضرور تھا اطال اللہ بقاءہ ونفع بہ،

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری جو اپنے شہرۂ آفاق درس قرآن، اصلاح عقائد کے عظیم الشان کام، مؤثر و مقبول مواعظ اور

مخلصانہ دینی خدمتوں کی بناپر پاکستان میں مقبول عام وخاص تھے، اپنے زمانہ کے بہت بڑے شیوخ طریقت میں سے بھی تھے، قوت نسبت باطنی ادراک اور روشن ضمیری میں اس زمانہ میں ان کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے، حضرت بھی ان کے اخلاص وعلوّ مرتبہ کے قائل تھے، بہت احترام فرماتے تھے، لاہور کے دوران قیام میں کبھی کبھی خود ملنے تشریف لے جاتے، اپنے مرض وفات میں بعض اوقات ان کے کسی مرید کو دیکھ کر یا ان کا نام سن کر آپ پر رقت طاری ہوجاتی، ایک بار یہ بھی فرمایا کہ "بہت اچھے گئے"۔

مولانا احمد علی صاحبؒ کا خود یہ حال تھا کہ حضرتؒ کے ساتھ بالکل اپنے شیخ و مرشد کا سلوک فرماتے، لاہور کے قیام کے زمانہ میں بڑے اہتمام سے حاضر خدمت ہوتے راقم سطور نے کئی بار صوفی عبدالحمید صاحب کی کوٹھی پر دیکھا، مولانا احمد علی صاحب تشریف لائے، آتے ہی سلام ومصافحہ کے بعد نہایت ادب سے دوزانو مراقب ہوکر بیٹھ گئے اور جب تک بیٹھے رہے، اسی طرح ادب وسکوت کے ساتھ مراقب بیٹھے رہے، جیسا کوئی مرید استفادۂ باطنی کیلئے بیٹھتا ہے، اگر حضرت نے کوئی بات پوچھی تو جواب دیا ورنہ اول سے آخر تک خاموش بیٹھے رہے، ان کے اس ادب واحترام کو دیکھ کر ہم خدام کو بڑی شرم آتی اور احساس ہوتا کہ ادب واحترام اس کو کہتے ہیں۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

مجھے یاد نہیں کہ کبھی اس کے خلاف ہوا ہو اور مجلس میں زیادہ گفتگو فرمائی ہو،

مولانا احمد علی صاحبؒ، مولانا مدنیؒ اور حضرت رائے پوریؒ کی عظمت اور علوّ شان کے بہت بڑے معتقد تھے اور برسر عام اپنی تقریروں میں بڑے جوش کے ساتھ ان دونوں حضرات کی مقبولیت عنداللہ، علوّ نسبت اور کمال باطنی کا اعلان فرماتے تھے اور اکثر موقعوں

پر اسی ترتیب سے ان دونوں حضرات کا نام لیتے تھے، مولانا مدنیؒ کے ساتھ ان کو جو والہانہ تعلق اور خادمانہ عقیدت تھی اس کا ذکر بہت سے مضامین میں آچکا ہے اور اسکی مناسب جگہ مولانا مدنی کی سوانح حیات ہے، حضرت رائے پوریؒ سے ان کو جو عقیدت و محبت تھی اس کا کسی قدر اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو حضرت رائے پوریؒ کے ایک خادم قاری محمد اسحاق صاحب بیان کرتے ہیں، قاری صاحب کہتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ حضرت رائے پوریؒ کا خط میرے نام آیا، اس میں حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے نام سلام بھی تھا، میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو حسب معمول ملاقات کرنے والوں کا بڑا مجمع تھا، مجھے دیکھا تو فرمایا کہ آپ ٹھہریئے جایئے گا نہیں، میں انتظار کرتا رہا، جب فراغت ہوئی تو مجھے اس چھوٹی مسجد میں لے گئے جو بڑی مسجد سے جانب جنوب ہے اور ابتداء میں وہی مسجد تھی، اندر لے جاکر دروازے بند کر لئے، پھر مجھ سے فرمایا کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت کا خط آیا ہے اس میں آپ کو سلام لکھا ہے، حضرتؒ کا نام سنتے ہی بے اختیار رونے لگے پھر فرمایا کہ خط مجھے دے دیجئے میں رکھونگا چنانچہ میں نے خط پیش کر دیا:

دوسرے شیوخ و اکابر ان حضرات کے علاوہ جن سے سلسلے، ذوق یا قرب مکانی کی وجہ سے خصوصی تعلقات تھے اور ان سے زیادہ ربط و ضبط تھا، ہندستان کے دوسرے شیوخ و علماء کبار کا خواہ وہ کسی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہوں پورا احترام فرماتے تھے، ہر ایک سے نہایت تواضع اور کسر نفسی کے ساتھ ملتے تھے، اور وہ حضرات بھی آپ سے ایسے ہی احترام و محبت اور ادب و عقیدت کا برتاؤ کرتے تھے

ان میں حضرت خلیفہ غلام محمد صاحب دین پوری جو حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے شیوخ میں ہیں اور سلسلۂ قادریہ کے نہایت عالی نسبت شیخ تھے، نیز مولانا احمد خاں صاحبؒ کے خلیفہ مولانا عبداللہ صاحب گندیاں والے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کا حضرت بلند الفاظ میں تذکرہ فرماتے تھے، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ سے بھی خاص محبت ومناسبت تھی کہ حضرتؒ کو صحابۂ کرام سے عشق تھا اور رفض سے بڑی نفرت وعدم مناسبت اور اللہ تعالیٰ نے مولانا عبدالشکور صاحبؒ سے اس سلسلہ میں بڑا کام لیا حضرت نے ان کے بہت سے رسائل اہتمام سے پڑھوا کر سنے تھے، لکھنؤ کے قیام میں ایک بار مولاناؒ حضرتؒ سے ملنے کے لئے ندوہ بھی تشریف لائے جہاں حضرت کا قیام تھا، لاہور میں بھی اکتوبر ۱۹۶۰ء میں جب حضرتؒ کا قیام صوفی صاحب کی کوٹھی پر تھا تشریف لائے تھے

"ایک حاضر مجلس[1] کا بیان ہے کہ جب مولانا عبدالشکور صاحبؒ کی وفات ہوئی، تو اس کے دو ہی تین دن بعد" راؤ فضل الرحمٰن خاں صاحب نے اخبار پڑھتے ہوئے، یہ خبر سنائی، کہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کا انتقال ہوگیا" اس خبر کے سنتے ہی، فرمایا! " اوہو" انا للہ وانا الیہ راجعون" حضرت پر اسقدر اثر ہوا کہ اٹھ کر بیٹھ گئے، حالانکہ بغیر دو آدمیوں کے سہارا دیئے ہوئے اٹھنا مشکل ہوتا تھا، مگر اس خبر سے اتنا اثر پڑا کہ بلا کسی کی مدد کے اٹھ کر بیٹھ گئے گو تکیہ کے سہارے تھوڑی دیر تک سکوت اختیار فرمانے کے بعد فرمایا" جب ان کے استقبال کے لئے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ (رضی اللہ عنہم) نہ آویں گے تو کیا دوسرے کے لئے (استقبال میں) آویں گے۔"

---

(۱) سید محمد سالم ہنسوی،

مدینہ طیبہ کے قیام میں مولانا عبدالغفور صاحب نقشبندی سے بھی اسی طرح سے محبت واحترام کا اظہار فرماتے تھے اور دونوں حضرات ایک دوسرے سے ملنے جاتے تھے دہلی میں مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے خلفاء میں حضرت حافظ فخرالدین صاحبؒ بڑے ذاکر شاغل اور صاحب باطن بزرگ تھے، ان کا تعلق بھی حضرتؒ کے ساتھ اور حضرتؒ کا ان کے ساتھ محبت واحترام کا تھا، حضرت کا جب تک دہلی میں قیام رہتا، حافظ صاحب بڑے اہتمام سے تشریف لاتے اور شریک مجلس رہتے، سہارنپور، رائے پور بھی کثرت سے ملنا ہوتا۔

غرض یہ کہ حضرت کا اپنے معاصرین کے ساتھ اور ان نامور معاصرین کا حضرتؒ کے ساتھ جو تعلق تھا، وہ اس معاصرت کی خصوصیت سے مبرا تھا جس کو حجاب اور سبب بُعد قرار دیا گیا ہے اور اس سے جہاں ان حضرات کی للّٰہیت، جوہر شناسی اور علو اخلاق کا اندازہ ہوتا ہے وہاں حضرتؒ کے بھی علو مرتبہ اور جامعیت کا پتہ چلتا ہے کہ ان سب مختلف الذوق حضرات کے ساتھ ایسا محبانہ ومخلصانہ تعلق رکھتے تھے اور سب کے قدرشناس اور مرتبہ داں تھے!

پندرہواں باب (۱۵)

سلوک و معرفت

ستر دیں مارا خبر او را نظر — او درون خانہ ما بیرون در
ما کلیسا دوست ما مسجد فروش — او ز دست مصطفےؐ پیمانہ نوش
اقبالؔ

سلسلۂ طریقت حضرت چاروں سلسلوں (قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ) میں بیعت فرماتے تھے اور چاروں سلسلوں کی نسبتیں "عطر مجموعہ" کی طرح اس سلسلہ میں بسی ہوئی تھیں جو آپ کو اپنے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب[1] رائے پوری قدس سرہٗ سے پہنچا تھا،

---

(۱) حضرت کے حالات طیبہ اور کمالات عالیہ کے تذکرہ کے لئے مستقل تصنیف درکار ہے ع:۔
سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے
جستہ جستہ واقعات جو حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ نے اپنی زبان مبارک سے کبھی ارشاد فرمائے وہ اس کتاب میں اپنے موقع پر آگئے ہیں، مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ نے تذکرۃ الخلیل میں نہایت اختصاً اور اجمال کے ساتھ کچھ حالات لکھے ہیں ان کو ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے، ناچیز مؤلف نے اس مختصر کتاب میں ضمناً بطور تذکرہ لکھنے کی جرأت نہیں کی، در حقیقت حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ کے حالات و کمالات اور انکی زندگی حضرت ہی کی کتاب زندگی اور تذکرہ کا ایک زریں ورق اور آپکے کمالات اور مقامات کا ایک نمونہ اور نتیجہ تھا۔
ع:۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہ کے پہلے شیخ آپ ہی کے ہم نام حضرت میاں صاحب شاہ عبدالرحیم صاحب سہارنپوری[1] تھے جو سلسلہ قادریہ نقشبندیہ میں اپنے وقت کے

(۱) حضرت میاں صاحب سرسادہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے، اگر یہ (خاندانی روایت صحیح ہے کہ ۹۰ سال کی عمر میں وفات ہوئی تو ولادت ۱۲۱۴ھ میں ہوئی ہوگی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں صاحب کے نہایت دل آویز اور بڑے رفیع حالات سناتے تھے، ان کی مدد سے ان کا ایک مختصر سا تذکرہ اور تعارف مرتب ہوسکتا ہے،

فرماتے تھے کہ میاں صاحب حضرت حاجی اخوند صاحب" صوات کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کی درخواست کی، حاجی صاحب نے بیعت فرمالیا اور شرط کی کہ انگریزوں کی نوکری نہیں کروگے ورنہ بیعت شکست ہوجائے گی، وہ بیعت کرکے چلے آئے، لیکن بعض حالات ایسے پیش آئے کہ انھوں نے نوکری کرلی، پھر جب سیدو شریف حاضر ہوئے آخوند صاحب نے آپ کو دیکھ کر فرمایا کہ جاؤ تو ہمارے کام کا نہیں رہا آپ پندرہ روز تک وہاں رہتے رہے، آخوند صاحب نے بلوا کر دوبارہ اسی شرط پر بیعت کی اور وہیں کے ہورہے، وہاں سیدو شریف میں ایک غار میں معمولات پورے فرماتے تھے، ایک روز اس غار کے اوپر اس چٹان پر شیر ببر آکر بولنے لگا، اسکی آواز سے پہاڑ کی چوٹی سے پتھر گرنے لگے، فرماتے تھے ذرا سکون میں فرق آیا، پھر اپنا ذکر اسی قوت سے شروع کردیا، بڑے قوی النسبت اور صاحب کشف و تصرف بزرگ تھے، اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا، اس کے باوجود روزانہ سو رکعتیں نفل پڑھا کرتے تھے، خادم کھڑا کردیتے تھے آپ نفل پڑھنے لگتے اور اٹھنے بیٹھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی، کشف کا یہ حال تھا کہ مرزا صاحب کی شہرت اور دعوے سے بہت دن پہلے حکیم نورالدین صاحب مہاراجہ جموں کی صحت کیلئے دعا کرانے کیلئے آئے، فرمایا تمہارا نام نورالدین ہے، حکیم صاحب نے کہا "ہاں" فرمایا علاقہ قادیان میں ایک غلام احمد پیدا ہوا ہے جو کچھ عرصہ کے بعد ایسے دعوے کریگا جو نہ اٹھائے جائیں گے نہ

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۲۱ پر)

نامور شیخ طریقت حضرت حاجی عبدالغفور صاحبؒ (جو اخوند صاحبؒ صوات کے نام سے مشہور ہیں) کے خلیفہ تھے، میاں صاحب نے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کو سلسلۂ قادریہ نقشبندیہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۰ کا) رکھے جائیں گے، تم اسکے مصداق لکھے ہوئے ہو، حکیم صاحب نے استعجاب کا اظہار کیا تو فرمایا تم میں الجھنے کی عادت ہے اور مناظرہ کا شوق ہے، یہی عادت تم کو وہاں لے جائیگی، باوجود کشف و کرامت وعلوئے مرتبت کے مزاج میں بہت تواضع اور مسکنت تھی، فرماتے تھے کہ جب میں بازار سے گزرتا ہوں اور لوگ سلام کرتے ہیں تو گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے، ندامت میں ڈوب جاتا ہوں، انتقال بھی عجیب طریقہ سے ہوا، ایک دن گھر سے خوشدامن صاحبہ نے آواز دی کہ میاں صاحب رقیہ (چھوٹی بچی) روٹھی ہوئی ہے اسکو مناؤ فرمایا کیسی رقیہ اور کس کی رقیہ، ہم نے اپنے روٹھے کو منالیا، یہ کہہ کر ایک مرتبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا، کروٹ لی اور سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ مظاہر العلوم میں تعلیم حاصل کرتے تھے، ابتدا سے بزرگوں سے عقیدت اور ان کی صحبت میں بیٹھنے کا شوق تھا، میاں صاحب کے پاس حاضر ہوا کرتے تھے میاں صاحب کو بھی بڑی نظر عنایت تھی، ایک روز فرمایا آ میرے چاند تجھے بیعت ہی کرلوں، کچھ عرصہ کے بعد اجازت بھی مرحمت فرمائی حضرتؒ کی انکے ساتھ اخیر تک عقیدت قائم رہی ذکر طریقہ قادریہ کا انھیں سے اخذ کیا تھا اور رائپور کے سلسلہ میں وہی رائج ہے

مولانا عبداللہ شاہ صاحب کرنالی "تعلیمات رحیمی" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت پیر و مرشد (حضرت میاں صاحب سہارنپوری) بدرجۂ غایت متبع سنت اور محترز از بدعت تھے، کسی عرس اور محفل رقص و سرود و شعر خوانی میں شریک نہیں ہوتے تھے اور اپنے خادمان کو اتباع شرع کا تقید فرماتے تھے، اور بدعات سے منع فرماتے تھے" (ص ۵۲-۵۳)

۲۱ ربیع الاول ۱۳۰۳ھ روز دوشنبہ وقت شب میاں صاحب کی وفات ہوئی، خلفاء میں مولوی محمد امیر باز خاں صاحب جانشین، مولانا عبداللہ شاہ صاحب کرنالی، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری ممتاز و مشہور ہیں

میں اجازت دی تھی[1]، اور وہ اس سلسلہ میں لوگوں کو بیعت فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس راہ کی ترقیات و کمالات، مرجعیت و مقبولیت جو نہایت عالی استعداد اور قوی النسبت بزرگوں کو حاصل ہوتی ہے عطا فرما رکھی تھی میاں صاحب کی وفات کے بعد جب قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا آفتاب رشد و ارشاد نصف النہار پر پہونچا اور ان کی ذات گرامی سے وہ تجدیدی شان اتباع سنت کا کمال اور عقائد و اعمال میں انکے تعلق اور نسبت کے اثرات ہویدا اور عشق و محبت کی وہ خصوصیات ظاہر ہوئیں جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کی خصوصیت ہیں تو آپ نے شیخ کامل و مکمل ہونے کے باوجود حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کی طرف اس طرح رجوع کیا جیسے ایک مرید رشید کرتا ہے، حضرت نے آپ کو اجازت و خلافت دی آپ کی بقیہ زندگی حضرت کے رنگ و مسلک اور حضرت کی محبت و عقیدت میں ڈوبی رہتی تھی اور اس طرح ان دونوں سلسلوں کے اثرات و برکات اور ان کی نسبتیں آپ میں جمع ہوگئیں،

مقام تحقیق و اجتہاد

حضرتؒ کے طریقہ سلوک و تربیت، تصوف، طریقت، ذکر و صحبت معرفت و محبت کے بارے میں بجائے اسکے کہ خود کوئی چیز پیش کیجائے اور اس پر علمی اور فنی طریقہ پر روشنی ڈالی جائے، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں کے بارے میں حضرتؒ کے خود اپنے خیالات و تحقیقات پیش کی جائیں، جن کا وقتاً فوقتاً اصلاح و تربیت کے لئے کسی

---

(۱) یہ سلسلہ حضرت سید آدم بنوریؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ سکندر کیتھلیؒ، حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ اور ان کے مشائخ کے توسط سے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچتا ہے، حضرت اخوند صاحبؒ کو حضرت شاہ شعیبؒ توڈھیرویؒ سے خلافت تھی، ان کو حضرت حافظ محمد صاحبؒ (عمرزئی) سے، ان کو حضرت صدیقؒ بشواڑی سے، ان کو حضرت شاہ مومنؒ لگڑوی سے، ان کو حضرت سید شاہ بازؒ سے، انکو حضرت حبیب سے ان کو حضرت سید آدم بنوریؒ سے الی آخرہ (تعلیمات رحیمی)

مجلس میں اظہار فرمایا اور جن کا بہت تھوڑا حصہ (نہ ہونے کے برابر) قید تحریر میں آسکا ہے انھیں منتشر، متفرق ملفوظات پر نظر ڈالنے سے حضرت کے اصلی خیالات کا اندازہ ہوسکتا ہے اور اس کا بھی کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت کو اس فن میں کیسی مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی اور آپ کی نظر رسوم و آداب، جزئیات و تفصیلات کے بجائے اصل مقاصد اور لب لباب پر کس قدر تھی، ان مقاصد کے حصول کے لئے آپ طبائع، اختلاف مزاج اور زمانہ کی تبدیلیوں کی کس قدر رعایت فرماتے تھے اور آپ کی نظر کس قدر عمیق، دقیقہ رس اور حقیقت بیں تھی،

مقصود کار فرماتے تھے کہ:-

"اصل کیفیت یقین کا پیدا ہو جانا ہے، جب کبھی کوئی سالک اپنی کیفیات کا ذکر کرتا تو یہی فرماتے کہ اصل کیفیت یقین ہے، ایک دفعہ فرمایا، کمرے میں اندھیرے میں شیر ہے نظر نہیں آتا، ایک آدمی وہاں ہے وہ بے خبری میں بے فکر بیٹھا ہے، اچانک روشنی ہوئی، شیر اس کو نظر آگیا اس پر خوف طاری ہو جائے گا، اسی طرح یقین نصیب ہونے کے بعد خوف خدا آجاتا ہے اور یہ خوف خدا بنیاد ہے تمام اعمال حسنہ کے کرنے کی اور تمام اعمال بد سے بچنے کی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ اجرائے لطائف، سلطان الاذکار، انوار حتی کہ فنائیت کی کیفیت کو بھی کچھ اتنا بڑا مرتبہ نہیں دیتے تھے، حضرت کے نزدیک استدلالی یقین کا وجدانی اور ذوقی یقین میں تبدیل ہو جانا اصل چیز تھی، اس کا نتیجہ پھر یہ ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا بھی خدا کی ہستی کا انکار کرے تو یہ وجدانی یقین والا شخص کبھی بھی انکار نہیں کرتا۔"[1]

(۱) مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب ایم۔اے،

"حضرتؒ راستہ کی کیفیات مثلاً وجد، انوار، اجرائے لطائف سلطان الاذکار حتٰی کہ فنائیت کی اہمیت کو بھی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے، حضرتؒ کے یہاں کیفیت قابل حصول صرف ایک تھی یقین، کامل یقین اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی کیفیات، مثلاً خوف، خشیت، محبت الٰہی، تعلق مع اللہ کا دوام، کامل اخلاص، اتباع شریعت، اخلاق عالیہ، مثلاً توکل، رضا و تسلیم، صبر و شکر وغیرہ لوگ بڑے بڑے اونچے حالات حضرتؒ کو سناتے تھے، لیکن حضرت یہی فرماتے تھے کہ اصل مقصود یقین کا پیدا ہو جانا ہے، حضرت کے ہاں تصوف کا مقصود صرف یہی تھا کہ استدلالی یقین، وجدانی، ذوقی اور کشفی یقین میں تبدیل ہو جائے، اللہ تعالٰی کی محبت نصیب ہو، تعلق مع اللہ کو دوام و استقلال حاصل ہو۔"(۱)

"کسی نے کسی لطیفہ کے جاری نہ ہونے کی شکایت کی، آپ نے اس سے یقین کے بارے میں پوچھا، اس نے کہا کہ وہ تو ہے فرمایا کہ پھر لطیفہ کے پیچھے نہ پڑو مقصود حاصل ہے۔"(۲)

ذکر و سلوک کی ضرورت سلوک و تصوف کی ضرورت اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا۔

"اللہ تعالٰی کی محبت اور ہر وقت اس کا اور اس کی رضا کا دھیان فکر رہنا اور اس کی طرف سے کسی وقت غافل نہ ہونا یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں اور قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا۔"

---

(۱) مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب ایم۔اے (۲) تحریر مولوی عبدالجلیل صاحب

لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دین کی تعلیم و تربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فیضان صحبت سے صحابہ کرام ؓ کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی لیکن بعد میں احول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کے لئے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کے لئے صحبت کے ساتھ "ذکر و فکر کی کثرت" کا اضافہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کرکے ان کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں مناسبت پیدا کرنے کیلئے انکے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کئے۔

اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لئے اور طبیعت میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لئے ضرب کا طریقہ نکالا گیا تو ان میں سے کسی چیز کو بھی مقصود اور مامور بہ سمجھا نہیں جاتا بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے اور اسی لئے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑا دی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ طریق اپنے اپنے زمانہ کے حالات اور اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں رد و بدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہے ہیں، اور اب بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لئے ان کے خاص حالات اور ان کی استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال و اشغال تجویز کر دیتا ہے اور بعضے ایسی اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں جنھیں اس طرح کا کوئی ذکر و شغل کرانے کی ضرورت ہی نہیں

ہوتی اور اللہ تعالیٰ ان کو یوں ہی نصیب فرما دیتا ہے، اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کو صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ضرور تاکیا جاتا ہے[1]۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:۔

"کسی کونہ میں بیٹھ کر کسی کا نام لیا جائے تو مسمی سے محبت ہو جائے گی جب انسان کثرت سے اللہ کا نام لیتا ہے تو اللہ کی محبت ہو جاتی ہے جو کہ نیکیوں کی جڑ ہے، اصلاح کا انحصار کثرت ذکر اور صحبت پر ہے۔ فرمایا کہ صحبت ضروری ہے محبت کے ساتھ، اگر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خود عرب میں نہ آتے بلکہ قرآن شریف لکھا ہوا آجاتا تو اس طرح سے اصلاح نہ ہوتی فرمایا کہ بعد زمانہ کی وجہ سے صحبت کمزور ہو گئی ہے اسکی کمی کو پورا کرنے کے لئے اہل اللہ نے ذکر اور اذکار اور مراقبہ جاری کیا جو کہ بالہام الٰہی اولیاء پر منکشف ہوئے[2]۔

ایک موقع پر مولانا منظور صاحب نعمانی سے فرمایا:۔

"خدا معلوم لوگ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں، تصوف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور جو کام عشق کی طاقت اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہے وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا تو دراصل تصوف ضروری نہیں ہے بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی اور راستہ معلوم ہو جائے تو مبارک ہے وہ اسی راستہ سے حاصل کرلے، اور ہم کو بھی بتلادے، ہم تو اسی راستہ کو

(۱) منقول از "تصوف کیا ہے؟" از مولانا محمد منظور نعمانی (۲) تحریر مولوی عبدالجلیل صاحب

جانتے ہیں جس کا اللہ کے ہزاروں صادق بندوں نے سیکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے جس میں سیکڑوں وہ تھے جو دین کے اس شعبہ کے مجتہد بھی تھے اور صاحب الہام بھی تھے۔(۱)

صحبت و محبت کی تاثیر

فرمایا کہ صحبت کا اثر ایک مسلمہ چیز ہے، جس طرح ہر چیز میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک خصوصیت رکھی ہے اسی طرح صحبت اور محبت کا بھی ایک خاصہ ہے، صحبت کا اثر تو اتنی بدیہی چیز ہے کہ عام لوگ بھی جانتے ہیں حتیٰ کہ اپنے بچوں کو کہا کرتے ہیں کہ دیکھو بُرے لوگوں کے پاس نہ بیٹھنا اور ہمیشہ اچھے لوگوں کے پاس بیٹھنے کی تلقین کیا کرتے ہیں، یہ اس لئے کہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے اور محبت کا یہ خاصہ ہے کہ محبوب کے سینہ کی چیز محب کے سینہ میں آتی ہے، حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک نور معرفت و یقین کا گنجینہ تھا صحابہ نے آپ کی صحبت محبت کے ساتھ کی، اس محبت کی خاصیت ظاہر ہوئی اور جتنی جتنی کسی کی محبت تھی اسی قدر حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کے سینہ مبارک کی دولت اس محب کے سینہ میں آگئی، پھر صحابہؓ کی صحبت تابعین نے اٹھائی اور تابعین کی تبع تابعین نے، اسی طرح حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا وہی نور یقین و معرفت سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا، پھر اس سے آگے مشائخ کے سلسلے چلے، چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، ان سب کے ہاں سلوک کا دار و مدار صحبت شیخ پر ہے جتنی شیخ سے محبت ہوتی ہے اتنا ہی عرفان و عشق نصیب ہوتا ہے، اگر صحبت کی ضرورت نہ ہوتی تو انبیاء کو نہ بھیجا

---

(۱) منقول از "تصوف کیا ہے؟"

جانا اور کتابیں براہ راست آسمانوں سے نازل کردی جائیں۔[1]

فرمایا کہ محبت سے اخلاق رذیلہ کٹ جاتے ہیں اور محب محبوب کے آثار جذب کرتا ہے۔[2]

حضرت کے ایک مسترشد لکھتے ہیں:۔

"حضرت کے ہاں تمام امراض کا علاج اکٹھا ہوتا تھا اور دوا جو بالخاصہ نافع تھی وہ ذکر اللہ کی کثرت اور صحبت شیخ تھی صحبت شیخ تو اکیلی بھی نافع ہو سکتی ہے لیکن ذکر کا اکیلا بغیر صحبت شیخ کے نتائج پیدا کرنا شاذ و نادر ہی ہے قلب کی چیز قلب کھینچتا ہے، باطن کی چیز باطن کھینچتا ہے اور یہ بات بغیر صحبت کے ناممکن ہے۔"[3]

حقیقت ذکر

"فرمایا کہ ذکر لسانی صرف ایک ذریعہ ہے مقصود نہیں ہے مقصود محض یاد ہے، اگر یاد نصیب ہو جائے تو ذکر لسانی چھڑا دیا جاتا ہے، مگر بقا کے بعد بھی ترقی عبادات ہی سے ہے یعنی قرآن پاک کا پڑھنا، ذکر الٰہی کرنا اس سے ہی ترقی ہے، خاموش بیٹھنے اور محض تدبر سے نہیں، فرمایا، تصوف ایک مشق ہے، ایک طریقہ ہے جو الہام الٰہی سے اولیاء اللہ پر اپنے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق منکشف ہوتا ہے، اس طریق پر چلنے سے انسان کو یقین نصیب ہو جاتا ہے اور خداوند تعالیٰ کی دائمی یاد نصیب ہو جاتی ہے، راستہ میں بہت سی کیفیات اور بہت سے اسٹیشن آتے ہیں، لیکن اصل مقصد یہی یاد ہے یہی تعلق مع اللہ ہے جس کو آپ نسبت کہہ دیں یا کچھ اور نام دیدیں، در حقیقت

(۱) مسودہ صوفی محمد حسین صاحب (۲) تحریر مولوی عبد الجلیل صاحب (۳) مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب

یہی یاد ہے جو کہ مقصود ہے اور تمام تصوف کا خلاصہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ کرامات کو اتنا وقیع اور اہم نہیں سمجھتے جتنا کہ تعلق مع اللہ اور اہتمام شریعت کو، اصل چیز تعلق مع اللہ کا دوام ہے، اس کے ساتھ اتباع شریعت از خود آجاتی ہے، شریعت پر چلنے میں آسانی ہو جاتی ہے، کیونکہ شریعت پر چلنے کے محرکات پیدا ہو چکے ہوتے ہیں، تعلق مع اللہ کے بعد یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ انسان اللہ کی نافرمانی کرے، حضرتؒ کے ہاں حضرت تعلق مع اللہ کے دوام پر زور دیا جاتا تھا، کیونکہ جب یہ تعلق نصیب ہو جاتا ہے تو اتباع شریعت اور اخلاق عالیہ خود بخود آجاتے ہیں اور اسی کے حصول کے لئے ذکر و شغل اور مراقبہ کرایا جاتا ہے۔"[1]

ایک مرتبہ ذکر کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"نہ معلوم لوگ کیا سمجھتے ہیں، اثرات ذکر تو یہ ہیں کہ دنیا سے بے رغبتی ہو آخرت کا خیال ہو اور دنیا اتنی جاذب نظر نہ رہے۔"[2]

تربیت و تعلیم میں اجتہاد

حضرتؒ طالبین و سالکین کی تربیت میں انکی طبیعت، ذوق، مشغلہ، ضرورت، صحت و تحمل اور استعداد و ترقی کی صلاحیت کا لحاظ کر کے مناسب تغیر و اصلاح فرماتے اور ہر ایک کے حالات کے مطابق اس کو ذکر کی تلقین کرتے، ایک مسترشد لکھتے ہیں:۔

"حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا طریقۂ تربیت بھی بہت جداگانہ اور نرالا تھا بعض لوگوں کو تو صرف درود شریف اور تیسرا کلمہ ہی بتایا اور ان کو ذکر کی اجازت

(۱) مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب ایم۔اے (۲) تحریر مولوی عبدالجلیل صاحب

مانگنے پر بھی ذکر کی اجازت نہیں دی بلکہ اسی کو بڑھانے کو فرمایا، اور بعض حضرات کو ذکر اور مراقبہ۔ اور بعض کو کئی کئی چلے بھی کرائے اور بعض کو صرف تلاوت قرآن پاک ہی کے لئے فرمایا کہ یہی تمہارا وظیفہ ہے، اور بعض کو فرمایا کہ اب نوافل ہی پڑھنا تمہارا وظیفہ ہے، حضرتؒ کے ہاں یہ نہیں تھا کہ ہر ذاکر کو ایک ہی مراقبہ یا ایک ہی شغل بتایا جائے بلکہ کسی کو کچھ مراقبہ اور کسی کو کچھ مراقبہ تبلایا۔"(۱)

ایک دوسرے صاحب لکھتے ہیں:۔

"حضرت مختلف طبائع کی وجہ سے مختلف اوراد و اشغال بھی تعلیم فرماتے تھے، اس میں ہر ایک سائل کے حالات و کیفیات کو مد نظر رکھتے تھے، جیسے کہ مختلف سائلین کے حالات و ضروریات کے مطابق حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مختلف نصائح و وصایا فرمائے ہیں، اگر کوئی ملازمت پر تھا اور اس نے ذکر شروع کیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ضوابط کا پابند نہیں کیا بلکہ اس کو وہیں رہنے دیا ہے اور اسکی اصلاح فرمائی ہے کہ وہ اپنی منزل طے کر گیا ہے حتی کہ بعض اونچے عہدہ دار اور کثیر الاشغال لوگ بھی فائز المرام ہو گئے۔"(۲)

ماسٹر منظور محمد صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"پہلی مرتبہ خانقاہ میں چند روز رہنے کے بعد عرض کیا کہ حضرت اگر ذکر اس طریق سے کرتا ہوں جس طریق سے سکھایا گیا ہے تو اثر محسوس نہیں کرتا لیکن اگر ذکر جلدی جلدی ضربات کے ساتھ کرتا ہوں تو ایک قسم کی بے خودی سی محسوس ہوتی ہے اور بہت ذوق محسوس ہوتا ہے، حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ بیخودی ہی مقصود ہے

(۱) تحریر مولوی عبد الجلیل صاحب (۲) مکتوب محمد حسین صاحب بہاول نگری

جس طریق سے چاہو ذکر کرو، کوئی پابندی نہیں ہے، جس طرح مقصود حاصل ہو اسی
طرح ذکر کرو، چنانچہ یہی کرتا رہا، اس کے بعد گھر آ گیا، ذکر کا اثر جسم میں محسوس ہونے
لگا، وجد کی کیفیت عام ہوگئی، دنیا سے بھاگنے کو جی چاہنے لگا، عروج کے خواب
اور دیگر کیفیات ناقابل بیان ظاہر ہونا شروع ہوگئیں، اس دوران میں حضرت
رحمۃ اللہ علیہ بار بار مجھے تاکید کرتے رہے کہ اصل کیفیت یقین کا پیدا ہو جانا ہے
جب کبھی میں حاضر ہوتا اور اپنی کیفیات کا ذکر کرتا تو حضرت یہی فرماتے کہ اصل
کیفیت یقین ہے"(۱)

صحت و طاقت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، جو لوگ کمزور اور ضعیف الدماغ ہوتے تھے ان کو زیادہ
آواز کے ساتھ اور شدت و قوت کے ساتھ ذکر جہر کرنے سے منع فرما دیا کرتے تھے اور جس کیلئے
جس طرح کا سلوک مناسب ہوتا تھا اس کیلئے وہی تجویز فرماتے تھے، ایک موقع پر فرمایا:۔

"اگر قوت ہو تو پھر ذکر بالجہر کرنا چاہیئے اثر جلدی ہوتا ہے لیکن اگر طبیعت
کمزور ہو تو ہرگز زیادہ جہر سے نہیں کرنا چاہیئے ورنہ طبیعت مختل ہو جائے گی
اور دماغ خراب ہو جائیگا۔

پوچھا گیا کہ سیر اجمالی اور سیر تفصیلی سب سے کرایا جاتا ہے یا بعض سے اجمالی اور
بعض سے تفصیلی؟ فرمایا طبائع مختلف ہوتے ہیں، بعض طبائع کے مناسب
سیر اجمالی ہوتا ہے ان کو اجمالی کرایا جاتا ہے بعض کے مناسب تفصیلی ان سے
سیر تفصیلی کرایا جاتا ہے، لیکن مرید کو چاہیئے کہ ان چیزوں میں نہ پڑے اور خود
اپنے لئے کوئی حالت تجویز نہ کرے، سیدھا سادہ اللہ اللہ کرتا رہے، اللہ تعالیٰ جس

---

(۱) مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب۔

کے لئے جو حالت اختیار فرمائیں وہی اس کے لئے بہتر ہے"۔[1]

اہل ذکر کیلئے نیند آنے کا اہتمام رکھتے اور مقوی دماغ چیزیں استعمال کرنے کی ہدایت فرماتے تھے، مولوی محمد یحییٰ صاحب لکھتے ہیں کہ "میں نے ایک اسم جو حضرت نے کچھ پیشتر فرمایا تھا اخلاق کی درستی کیلئے پڑھنا شروع کر دیا، اس کے نتیجہ میں بے نیازی کا غلبہ، رقت و وجد اور انکساری میں بہت شدت پیدا ہو گئی اور لوگوں کو جنون کا شبہ ہونے لگا، میں نے یہ ساری کیفیت حضرت کی خدمت میں لکھی، حضرت نے اس کا حسب ذیل جواب دیا۔

"برخوردار مولوی محمد یحییٰ صاحب سلمہ، از احقر عبدالقادر بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ تمہارا خط ملا، کیفیت معلوم ہوئی، برخوردار تم ذکر اذکار اتنا کرو جس سے دماغ میں خشکی نہ پیدا ہو جائے اور "یا قہار" کا چلہ تم نے کیوں شروع کر دیا، اپنے اخلاق کو ویسے ہی درست کرنے کی سعی کرو، اللہ تبارک و تعالےٰ سے امید عنایت ہی رکھنی چاہیئے کچھ مقوی دماغ اور مرطب دماغ ضرور استعمال کرتے رہو، ایسا نہ ہو کہ خدا نخواستہ دماغ میں ضعف آجائے اور سارا کام ہی خراب ہو جائے، باقی احقر عبدالقادر"[2]

ماسٹر منظور محمد صاحب حضرت کی شان اجتہاد اور طریق تربیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میں نے اپنے فن میں ماہر ایسا پیر طریقت کہیں نہیں دیکھا، کوئی کیفیت کوئی شخص بیان کرے، حضرت رہنمائی فرماتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ حضرت سب مقامات تفصیلی طور پر طے کئے ہوئے ہیں"۔[3]

جو حضرات کسی دوسرے سلسلہ میں پہلے بیعت ہوتے تھے اور اسی طریق کا ذکر ان کا واں

---

(۱) مکتوب مولانا سعید احمد صاحب ڈونگوی (۲) تحریر مولوی محمد یحییٰ صاحب (۳) مکتوب ماسٹر منظور محمد صاحب

ہوچکا ہوتا تھا جب حضرت کے ہاتھ پر تجدید کرتے اور تلقین ذکر اور تربیت کی درخواست کرتے تو حضرت ان کا ذکر تبدیل نہیں فرماتے تھے، ارشاد ہوتا تھا کہ تمہارا یہ ذکر رواں ہوچکا ہے، اب نئے ذکر میں رکاوٹ اور الجھن ہوگی، تم وہی ذکر کرتے رہو، خود راقم کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا، جس کے اندر کسی خاص دینی مشغلہ کا رجحان اور ذوق غالب دیکھتے اور اس سے دین کا مفاد اور لوگوں کا نفع بھی وابستہ ہوتا، اس کو بجائے اس سے روکنے کے اس کے جاری رکھنے کی ہدایت فرماتے اور اپنی نسبت قوی اور سرپرستی سے اسی کو اس کا ذکر وسلوک بتا دیتے، راقم نے ایک دوبار اپنی بے استعدادی اور باطنی کیفیات کا تذکرہ کیا سب سن کر فرمایا ٹھیک ہے، آپ تاریخ دعوت وعزیمت کا سلسلہ مکمل کر دیجئے، جو لوگ تعلیم وتعلم یا تبلیغ ودعوت، یا تصنیف وتالیف میں مشغول ہوتے اور ہمہ تن ذکر وشغل میں مشغول نہ ہونے کی وجہ سے اپنے اندر ذکر کے انوار وآثار اور باطنی ترقیات محسوس نہ کرتے اور حضرتؒ سے اس کا شکوہ کرتے تو حضرت فرماتے تمہارا کام سویا ہوا شیر ہے جب (آخرت میں) وہ بیدار ہوگا (یعنی اس کا اجر ملنے لگے گا اور اس کا مقام معلوم ہوگا) تو تم کو اسکی قدر آئے گی، البتہ اہل استعداد اور جن کے پاس وقت ہو ان کے لئے بہتر سمجھتے تھے کہ کچھ عرصہ ہمہ تن ذکر میں مشغول رہ کر اپنے اندر استقامت اور نورانیت پیدا کرلیں۔

انوار وکیفیات کی عدم اہمیت سلوک وطریقت کی ایک بڑی گھاٹی انوار وکیفیات کا شوق، انکے حصول کی کوشش اور انکی اہمیت اور عظمت کا احساس ہے بزرگان دین کے سوانح حیات لکھنے والوں نے انکے حالات اس طرح سے لکھے ہیں کہ خواہ مخواہ ان چیزوں کو ان کے حالات وکمالات میں نمایاں

مقام حاصل ہوگیا ہے اور ذہن ان کی عظمت اور ان کے حالات کے (جو غیر اختیاری بھی ہیں) مطلوب اور مہتم بالشان ہونے کے خیال اور عقیدہ سے کسی طرح آزاد نہیں ہونے پاتا۔

حضرت کے ہاں ان انوار و مشاہدات و مکشوفات کی بڑی نفی تھی، ان کو بجائے سالک کے علوئے استعداد و کمال پر محمول کرنے کے اس کے ضعف پر محمول فرماتے تھے، کئی بار فرمایا کہ سب سے ابتدائی درجہ یہ ہے کہ آدمی آوازیں سنے اس سے اونچا درجہ ہے کہ انوار نظر آئیں، اس سے اونچا درجہ یہ ہے کہ خواب کثرت سے نظر آئیں اور ان کو بیان کرتے وہ نہ تھکے سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ان میں سے کچھ بھی نہ ہو، فرماتے تھے طبیعتیں دو طرح کی ہیں، ملکوتی، جبروتی، ملکوتی طبیعت والے کو اس طرح کی چیزیں بہت نظر آتی ہیں، جبروتی طبیعت والے کو کچھ نظر نہیں آتا اور وہ افضل ہے

انوار و مشاہدات محنت و ریاضت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں اسلام و ایمان کی بھی شرط نہیں ہے ان میں لغزش اور غلط فہمی کے بھی بڑے خطرے ہیں، مولوی علی احمد صاحب مرحوم نے اپنی بیاض میں حضرت کا ایک ملفوظ نقل کیا ہے جس میں اس بات کی صراحت ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"خان محمد یوسف خاں صاحب نے دریافت کیا کہ سلطان الاذکار کسے کہتے ہیں؟ فرمایا دو قسم کا ہوتا ہے، ایک حقیقی، دوسرا غیر حقیقی، حقیقی یہ کہ قلب مشاہدۂ حق میں مستغرق رہے اور غیر حقیقی یہ کہ اللہ اللہ کرے اور قلب میں کچھ گرمی پیدا ہو جائے۔"

فرمایا! "انوار کا نظر آنا کوئی ضروری نہیں، یہ تو محنت و ریاضت سے غیر مسلموں

کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں، وہ چیز کس طرح معیار فضیلت ہو سکتی ہے، جو غیر مسلموں میں بھی پائی جاتی ہو، پھر ہمارا ان سے امتیاز کیا ہو گا، بہت خوش قسمت ہیں وہ طبائع جن کو کچھ نظر نہیں آتا اور مقصود تک رسائی ہو جاتی ہے کیونکہ بچلنے کا اندیشہ نہیں بخلاف ان کے جن کو انوار نظر آتے ہیں، کیونکہ ان کے بچل جانے اور گمراہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔"[1]

ایک مرتبہ فرمایا:۔

"طبائع چار قسم کے ہیں، اول وہ جنہیں اللہ سے محبت اور اسکے غیر و خلاف سے بعد دائم رہتا ہے، دوسری وہ جنھیں یہ جذبات جب کوئی ایسا موقع آئے جو ان جذبات کو ابھارنے والا ہو تب زیادہ نمایاں معلوم ہوتے ہیں، تیسری وہ جنہیں اکثر خوابوں میں حالات دکھائی دیتے ہیں، چوتھی وہ جنہیں بیداری میں کشف ہوتا ہے، ان طبائع کا مرتبہ بھی اسی ترتیب سے ہے، آخری ناقص شمار ہوتی ہے اور زیادہ ترقی نہیں کر سکتی۔"[2]

سالک کی ترقی اور محمود و اطمینان بخش کیفیت

حضرت کے نزدیک ان آثار و کیفیات و مقامات کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی جن کو عام طور پر سالک کی ترقی باطن علو مرتبت اور وصول کی علامت سمجھا جاتا ہے اور بظاہر وہ نہایت محمود اور قابل ستائش و مبارک باد سمجھے جاتے ہیں، حضرت کے نزدیک اپنی نااہلی کا احساس اور اپنے کو سب سے ادنیٰ اور کسی قابل نہ سمجھنا اس راہ کی سب سے اونچی

(۱) بیاض مولوی علی احمد صاحب مرحوم مجلس ۷ جمادی الثانی ۱۳۶۰ھ لاہور کوٹھی صوفی عبدالحمید صاحب

(۲) مسودہ صوفی محمد حسین صاحب،

بات ہے اور اسی میں سالک کی حفاظت اور اسکی ترقی کا راز ہے۔

ایک بلند استعداد خادم اپنے آثار و کیفیات کی برابر اطلاع دیتے رہتے تھے انکو ایسے حالات پیش آتے جو سالکین متقدمین کو پیش آتے تھے، حضرتؒ ان کے جواب میں اکثر یہی مضمون لکھواتے تھے، ایک خط کے جواب میں جس میں بڑے رفیع حالات لکھے تھے ارشاد ہوتا ہے "باقی اپنے آپ کو جب تک کسی قابل نہ سمجھتے رہیں گے انشاء اللہ ترقی ہوتی رہے گی"[1] ایک ایسے ہی دوسرے خط کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

"جناب والا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ جب تک اپنے آپ کو لاشئے اور سب سے کم اور حقیر اور اپنی تمام مساعی کو عدم کمال سمجھتے رہیں گے تب ہی تک معاملہ ٹھیک رہے گا اور انشاء اللہ ترقی ہوتی رہے گی اور جب انسان یہ سمجھنے لگ جائے گا کہ بس اب میں بہت کچھ ہو چکا تو سمجھئے کہ کھویا گیا ترقی سے رک گیا اور تکبر میں پھنس گیا۔"[2]

ایک اور مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"یہ بات ضرور یاد رکھئے کہ جب تک انسان اپنے کو بالکل نا اہل اور نکما سمجھتا رہتا ہے تب تک ہی اسکی طرف رحمت آلٰہیہ متوجہ رہتی ہے ورنہ پھر وہ ترقی کرنے سے رک جاتا ہے۔"[3]

دوام ذکر و سعی مسلسل حضرت کے نزدیک سلوک کی کوئی انتہا نہیں تھی، اس سلسلہ میں کوشش کرتے رہنے اور ذکر کی مداومت کی تاکید فرماتے، ایک دفعہ فرمایا "میں بھی ابھی چل رہا ہوں تم کو ایسی جلدی ہے، مولوی عبداللہ فاروقی کو دیکھو کہ

---

(۱) مکتوب مؤرخہ ۳ر دسمبر ۱۹۵۱ء (۲) مکتوب مؤرخہ ۲۰ر اگست ۱۹۵۲ء (۳) مکتوب مؤرخہ ۷ار نومبر ۱۹۵۱ء

کہاں حضرت شیخ الہندؒ سے محبت اور بیعت تھی، اب میرے پاس ہیں، ابھی چل ہی لے ہے ہیں" بعض دفعہ اس مضمون پر تقریر فرمائی اور یہ پڑھا۔

"تڑپیئے، پڑ مر رہیئے ہر دے دربار"

مولوی محمد یحییٰ صاحب لکھتے ہیں:۔

"مجھ سے ایک روز فرمایا کہ تمہارے دادا بزرگوار (مولانا اللہ بخش بھاولنگری) بھی آخر عمر تک ذکر و فکر میں مرمٹے تھے تم بھی اسی راہ میں جان دیدینا، فرمایا دیکھو ذکر اذکار مرتے دم تک نہ چھوڑنا، تمہارے دادا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہر وقت چلتے پھرتے بھی مراقب رہتے تھے اور بڑی ہمت کے ساتھ ذکر اذکار کرتے رہنا، یہ نعمت اور نسبت اللہ کے نام کی برکت سے حاصل ہوئی، اس لئے اللہ کے نام کو نہ چھوڑنا۔"

مولانا عبدالوحید صاحب راوی ہیں کہ:۔

"گھوڑا گلی کے زمانہ قیام میں ایک مرتبہ مرض کا شدید حملہ ہوا، نہ کھڑے ہو سکتے تھے، نہ بیٹھنے کی طاقت تھی، سانس پھولتی تھی اور نیم بیہوشی کا عالم تھا اسی حالت میں میں نے عرض کیا کہ عشا کی نماز کا وقت ہے وضو کروا دیں، اشارہ فرمایا کہ ہاں، ہم[1] دونوں بھائیوں نے اٹھانے کی کوشش کی مشکل سے تھام کر غسلخانہ تک لے گئے، وضو کرانے جب بیٹھے تو فرمایا کون ہو میں نے اپنا نام اور مولانا عبدالجلیل صاحب کا نام بتایا۔ یہ سن کر فرمایا، بیٹا میرا کچھ ٹھیک نہیں کس وقت چل پڑوں تمہیں صرف ایک ہی نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کے ذکر کو

(۱) مولوی عبدالوحید صاحب۔ مولوی عبدالجلیل صاحب۔

دانتوں سے مضبوط پکڑ لینا چاہیے کچھ نظر آئے یا نہ آئے، نہ نظر آئے تو بہت اچھا ہے، اور اس میں کسی کی نہ ماننا، چاہے کوئی کتنے ہی دلائل دے مجھے تم اس میں تجربہ کار سمجھو، ارے ابھی تمہیں تجربہ نہیں ہوا، تم نے اپنے ماموں اور چچا کو دیکھا نہیں؟ کتنا غبی، کتنا کندذہن، چند روز اللہ کا نام لیا کتنی برکتیں ہوئیں"۔

اپنی سعی و محنت کی ضرورت

تصوف کے بعض حلقوں اور عوام میں بزرگانِ دین کے بعض خصوصی واقعات و کیفیات کی بناء پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ اہل قلوب جس وقت جس کو دولت باطنی عطا فرمانا چاہیں بلا استعداد و ذاتی سعی و محنت عطا فرما سکتے ہیں، ایسے واقعات کی صحت اور امکان میں شبہ نہیں جب کسی صاحب باطن نے اپنی یا طالب کی کسی خاص کیفیت پر جو بعض اوقات سعی و محنت کی قائم مقام بن جاتی ہے باذن خداوندی اس نسبت باطنی، یا کسی خاص حال کا اضافہ فرمایا لیکن یہ کوئی عمومی ضابطہ اور اختیاری چیز نہیں ہے عمومی طور پر اپنی ذاتی سعی و محنت ہی کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی میں دوام و استقلال ہے۔ حضرت اسی پر بہت زور دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا کہ ہم نے حضرت مخدوم شیخ علی صابر پیران کلیریؒ کے مزار پر مراقبہ کیا، ہمارے دل میں تو یہی آواز آئی کہ "اپنا کرنا، اپنا بھرنا"[1]

مولانا عبداللہ صاحب دھرم کوٹی مشرقی پنجاب کے ایک دورہ کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"چلتے چلتے فیضیاب ہونے والوں کے سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ رمضان شریف کا غالباً آخری ہفتہ رائے پور میں ہوا اسی موقع پر ایک صاحب

---

(۱) تحریر مولوی عبدالجلیل صاحب

تونسہ شریف کے رہنے والے جو پھری میں اہل مد یا سیاہانویس تھے حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، پہلے وہ کسی اور بزرگ کی خدمت میں گئے ہوئے تھے ان بزرگ نے فرمایا کہ تمہارا حصہ رائے پور ہے وہاں جاؤ، رائے پور کا نقشہ آپ کے سامنے ہی ہے، خاص طور پر رمضان شریف میں سب حضرات مہمان اکثر اوقات ذکر، نماز، تلاوت، مراقبہ بالخصوص ذکر بالجہر میں مشغول رہتے تھے یہ منظر دیکھ کر وہ صاحب کہنے لگے کہ ہم سے تو یہ چکی نہ پیسی جاسکے گی، غالباً کسی نے حضرت سے ذکر کر دیا ہوگا، شام کے کھانے کے بعد حضرت نے فرمایا کہ دوست آتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے حصہ کی پڑیا بنی بنائی رکھی ہے مل جائے گی جیب میں ڈال کر لے آئیں گے مگر یہاں بغیر محنت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اس راستہ میں محنت لازمی ہے، غالباً اس کے بعد آیت وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا پڑھ کر مزید روشنی ڈالی، مگر چند دنوں بعد حضرت کے کانوں میں پھر یہی الفاظ ڈالے گئے کہ فلاں بزرگ دوستوں کی یہاں شب و روز محنت دیکھ کر گھبراتے اور کہتے ہیں کہ اتنی محنت یہاں کون کرے، دوبارہ بڑے جوش سے فرمایا کہ اگر کوئی گھر آپ لوگوں کو ایسا معلوم ہو جہاں دو روٹیاں پکی پکائی مل جاتی ہوں تو میں بھی ٹوکری پکڑ کر تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں تاکہ کچھ حاصل کرسکوں مگر دوست صرف چکی ہی پیسنے کی شکایت کرتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ چکی پیسنے کا ہنر تو بہت روز میں آتا ہے پہلے تو زمین کو جوتنا ہے، اچھا بھلا بیج گھر سے نکال کر کھیت میں بکھیرنا ہے پھر سینچنا ہے۔ تاکہ کھیتی بڑھ کر پکنے کی حد تک پہنچے اور پک جائے تو پھر کاٹنا اور گاہنا اور غلہ کو بھوسے سے علیحدہ کرنا ہے پھر چکی پینا

ہے، آٹا بن جانے کے بعد پھر اسے مشقت سے گوندھنا بھی ہے اور آگ جلانا، پکانے کا سامان مہیا کرنا ہے، پھر جلیٹھ کی گرمی کو برداشت کرنا ہے، ایک کر تیار ہو جانے کے بعد مشقت سے توڑ کر منھ کے زور سے نگلنا ہے، ان ساری کوششوں کے بعد اگر ہضم ہو جائے تو محض میرے مولیٰ کا فضل سمجھنا چاہیئے۔ وگرنہ وہ قے ہو کر باہر بھی نکل سکتا ہے۔

کسی دوست نے عرض کر دیا کہ حضرت ماں اپنے بچے پر کتنی شفیق ہوتی ہے کہ سوئے ہوئے بچے کو اٹھا کر دودھ پلاتی ہے، اگر بچہ بھوکا ہو تو اسکی چھاتیوں میں ایک قسم کی تحریک سی پیدا ہو کر اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ بچہ بھوکا ہے، مگر بزرگ لوگ ماؤں سے زیادہ شفیق ہوتے ہیں، اس لئے ان سے ایسی امیدیں باندھی جاسکتی ہیں، اس پر حضرتؒ نے فرمایا کہ بھئی ماں کا کام تو اتنا ہی ہوتا ہے کہ چھاتی بچے کے منھ میں دے دے، مگر اگر بچہ ہی مردہ ہو اور ہونٹ ہلا کر دودھ کو نہ چوس سکے اور اپنے پیٹ میں نہ پہنچا سکے تو اس میں ماں کا کیا قصور ہے اور اسکی شفقت میں کیا فرق آسکتا ہے۔[1]

سالک کی ترقی اور احساس نسبت کا فقدان

حضرت ان آثار و کیفیات پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے جو سالک کو پیش آتی ہیں، اس راہ میں جو گھاٹیاں آتی ہیں اور جو تغیرات اور ترقیات ہوتی ہیں حضرت ان پر گہری نظر رکھتے تھے، بعض مرتبہ سالک کو ایک عرصہ تک ذکر کرنے اور کیفیات کے حصول کے بعد یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ ان کیفیات سے بالکل خالی ہو گیا، وہ اس کو

(۱) مکتوب مولانا عبداللہ صاحب دھرم کوٹ بنام مؤلف۔

اکثر تنزل اور حرمان اور کسی گناہ کی سزا سمجھنے لگتا ہے، حضرتؒ اس کی حقیقت سمجھتے تھے اور اکثر ان مشکلات کے موقع پر تسلی و تشفی فرماتے تھے اور حقیقت حال کی وضاحت فرماتے مولانا محمد صاحب انوری لکھتے ہیں:۔

"ایک بار عرض کیا کہ شروع شروع میں تو آثارِ ذکر سے سینہ میں گرمی محسوس ہوتی تھی بلکہ دل سے ذکر کی آواز سنائی دیتی تھی، پھر یہ حالت نہیں رہی اور رقت بہت ہوتی تھی اور بعد میں یہ کیفیت بالکل زائل ہو گئی، فرمایا کہ زائل نہیں ہو گئی جزو بدن بن گئی، احساس ختم ہو گیا یہ مبارک ہے، جب تک کہ اناج ہضم نہیں ہوتا پیٹ میں گرانی سی رہتی ہے، جب ہضم ہو جاتا ہے اور بدن کا جزو بن جاتا ہے تو گرانی بھی محسوس نہیں ہوتی۔"(۱)

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:۔

"نسبت ایک دُکھن جیسی حرارت کا نام ہے جو کہ سالک کے قلب میں ذکر و شغل کے بعد پیدا ہوتی ہے، اس سے یاد میں دوام پیدا ہوتا ہے، فرمایا کہ آخر میں آکر یہ کیفیت بھی بدن سے نکل جاتی ہے اور آدمی ویسے ہی رہ جاتا ہے جیسا کہ پہلے تھا۔"(۲)

تصوف دینی کاموں کی حیات و قوت کا ذریعہ

عرصۂ دراز سے کچھ تو تصوف کی غلط نمائندگی و ترجمانی کی وجہ سے اور کچھ تصوف کے بعض علَم برداروں کی بے عملی، تعطل اور جمود کی وجہ سے تصوف کو بطالت، بیکاری کا مشغلہ اور دعوت فرار کا مرادف سمجھا جانے لگا، حضرت کو اس بات کا بڑا یقین اور اصرار تھا کہ تصوف بجائے تعطل و

(۱) تحریر مولانا محمد صاحب انوری لائل پوری (۲) تحریر مولوی عبدالجلیل صاحب۔

بے عملی کے دینی کاموں کی زندگی اور طاقت کا سرچشمہ ہے، آپ کا خود جس سلسلہ سے تعلق تھا اس کے متعدد شیوخ و اکابر سرفروش مجاہد اور جلیل القدر مصلح اور داعی الی اللہ گزرے ہیں ایک دن مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے اور جان پڑتی ہے لیکن کیا عرض کیا جائے اللہ کی مشیت ہے، جن کو اللہ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے وہ اب ادھر توجہ ہی نہیں کرتے، حالانکہ اگر تھوڑی سی توجہ وہ ادھر دیدیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے، حضرت خواجہ صاحبؒ، باوا صاحبؒ نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ، حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت سید صاحبؒ نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمات انجام دیں اور جو کچھ کر دکھایا (جن کا سواں اور ہزارواں حصہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہیں کر پا رہی ہیں، نعمانی) اس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصوف کے راستہ سے پیدا کی گئی تھی لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف وہی بیچارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں ناقص استعداد کا آدمی اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا۔"(۱)

صحبت کی تاثیر اور قوت نسبت اور اشراف علی الخواطر | مقبولین بارگاہ الٰہی اور شیوخ

(۱) منقول از تصوف کیا ہے؟

کاملین کی زندگی میں اگر اللہ کو منظور ہوتا ہے تو خوارق عادات اور کشوف وکرامات کا بکثرت ظہور ہوتا ہے، واقفین اور اہل علم کو اس کے ثبوت کے لئے کسی علمی دلیل اور بحث واستدلال کی ضرورت نہیں کشوف وکرامات نصوص صحیحہ سے ثابت اور تاریخ میں تواتر کے ساتھ منقول ہیں اہلسنت کے عقائد کی کتابوں میں تصریح ہے کہ کرامات الاولیاء حق، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ جیسے محقق اور نقاد نے بھی لکھا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے کرامات کے واقعات حد تواتر کو پہونچ گئے ہیں لیکن چونکہ زمانہ کا ذوق بہت بدل چکا ہے تذکرہ نگاروں نے بزرگوں کی سوانح حیات میں اس بارے میں اتنی فیاضی اور افراط سے کام لیا ہے کہ اہل علم کا مذاق اب اُن سے اکتا چکا ہے اس لئے قصداً اس کتاب میں ان واقعات کے تذکرہ سے احتراز کیا گیا ہے اور ان کمالات کا ذکر کیا گیا ہے جو ناچیز مصنف کتاب کے نزدیک کرامات سے بھی زیادہ بلند مقام رکھتے ہیں لیکن حضرت کے حالات کے اس ذخیرہ میں جو مصنف کے سامنے دوستوں کے خطوط اور تحریری مواد کی شکل میں موجود ہے بہت سے ایسے واقعات درج ہیں جن سے حضرت کے علوئے مقام مقبولیت عند اللہ، قوت نسبت، صحبت کی برقی تاثیر، اور قلب کی اس کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جو خاصان خدا اور واصلین بارگاہ کو حاصل ہوتی ہے، یہاں پر صرف چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں جو بعض صاحب علم اور پختہ کار ثقہ راویوں نے بیان کئے ہیں اور خود ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات ہیں، مولانا سعید احمد صاحب ڈونگوی بیان فرماتے ہیں:۔

لائل پور خالصہ کالج۔ مدرسہ والی مسجد میں حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں عصر کے بعد حضرت پیران پیر کے وعظ پڑھے جاتے تھے، دو تین دن متواتر بیان آیا کہ مرشد کے سامنے جب مرید جاتا ہے، اس کے حالات مرشد پر کھل جاتے ہیں منکشف ہو جاتے ہیں، اس وقت مجھے بڑا خطرہ ہوا کہ پیر

حالات تو بہت گندے ہیں، ان حالات کا ملاحظہ فرما کر حضرت مجھے ضرور اپنے دربار سے نکال دیں گے، بس یہ کیف ایسا غالب ہوا کہ گندم جو اس وقت کٹنے کے قریب تھی اس میں جا کر چھپ کر رونے لگا، تمام داڑھی اور قمیص بھی بھیگ گئی، روتا روتا بے ہوش ہو گیا، جب سورج غروب ہونے لگا، فوراً ایک نہر سے جو پانی سے بھری تھی وضو کر کے مسجد میں آ گیا، جماعت سے فراغت کے بعد متصل ہی مولانا عبدالمنان صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ مولوی صاحب سنت پڑھ کر فوراً اندر آ جانا، حضرتؒ اقدس نے آپ کو بلوایا ہے، بس پھر تو میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور یقین آ گیا کہ اب کے تو حضرت مجھ کو ضرور نکالیں گے، کانپتا ہوا جب حاضر ہوا تو حضرت نے ہنس کر فرمایا آئیے مولانا تشریف لائیے، بندہ سامنے بیٹھ گیا، فرمایا آگے آؤ، بندہ ذرا آگے کھسکا پھر فرمایا آگے قریب ہو جاؤ، بندہ پھر قریب ہوا، اسی طرح کئی دفعہ آگے بڑھا اور کئی دفعہ حضرت اقدسؒ نے فرمایا، حتّٰی کہ حضرت اقدس نے بالکل اپنی جھولی میں لے لیا، اس وقت جو میرا کیف تھا احاطۂ تحریر سے باہر ہے اور جو حضرت اقدس کے الطاف و پیار تھے بس وہ بھی احاطۂ تحریر سے باہر ہیں، اپنی چھاتی سے لگا کر محبت بھرے انداز میں فرمایا، مولوی صاحب آپ فکر نہ کریں اور استقامت رہے، مجھے کچھ معلوم نہیں ہوتا، میں نے بے تکلفی سے عرض کیا کہ پھر حضرت کو کیسے معلوم ہو گیا کہ میں روتا ہوں، فرمایا یہ تو آپ سے تعلق کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے، پھر فرمایا آپ تو ماشاءاللہ فائز المرام ہیں، اس کے بعد عشاء تک برابر راز و نیاز کی باتیں تنہائی میں ہوتی رہیں

مولانا عبد المنان اور مخدوم زادے دونوں دروازوں پر نگراں تھے"

مولانا ایک دوسرا واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

"ایک دفعہ ڈھڈیاں کے قیام میں جب صبح حضرت سیر کو تشریف لے گئے تو مسجد میں بیٹھ کر اوپر کپڑا لے کر میں بہت رویا کہ اٹھارہ سال ذکر کرتے ہو گئے مگر تا ہنوز کچھ بھی نہیں ہوا، حضرت کے تمام متوسلین کے پیچھے رہا اور نالائق کسی کام کا آدمی نہیں،

مرا اے کاشکے مادر نزادے

ایک گھنٹہ سے زیادہ بس روتا ہی رہا کہ حضرت تشریف لائے اور مجلس لگی، میں نے اپنا منھ دھویا اور وضو کر کے حضرت کی مجلس میں جا بیٹھا، حضرت نے فرمایا کہ بعض ذاکرین سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں ہوئے اور بہت روتے ہیں، بھلا اللہ کے بندو اور کیا آسمان پر چڑھو گے، اللہ نے اپنے نام لینے کی توفیق بخشی اور ٹوٹا ہوا دل مرحمت فرمایا، اس پر حضرتؒ نے ایک گھنٹہ تقریر فرمائی اور پھر مجھے فرمایا کہ مولوی صاحب کچھ گئے ہو، مجھے اس وقت اتنا بسط ہوا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت مل گئی"

اسی طرح کا ایک واقعہ مولوی عبد الجلیل صاحب بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں۔

"مولوی احمد علی صاحب ہوشیار پوری کے بھائی حافظ محمد دین رائپور حاضر ہوئے جب کہ پنجابی مجمع حضرت سے مصافحہ کر چکا تھا مگر حضرت نے فرمایا کہ کھانا کھا کر جانا، حضرت لیٹ چکے تھے، حافظ محمد دین اس وقت پہونچے اور حضرتؒ سے بات کر کے اسی وقت واپس ہونا تھا، ہر ایک سے خوشامد کی کہ مجھے ملا دو، سب نے انکار کر دیا کہ حضرت چادر اوڑھے لیٹ چکے ہیں، بالآخر انھوں نے وضو کیا اور

حضرت کے کمرہ کے سامنے کمرہ میں دعا مانگنی شروع کی کہ یا اللہ تیرے حبیب محمد مصطفےٰؐ کا واسطہ ہے کہ میری ملاقات اسی وقت کرادے یہ دعا دل میں مانگ ہی رہے تھے کہ حضرت نے کروٹ لی اور فرمایا باہر کون ہے؟ وہ خاموش رہے، پھر دوبارہ پوچھا تو یہ چلے گئے، فرمایا کہ بھلے مانس! میں آدمی ہی تو ہوں، کوئی ہوّا نہیں ہوں، ایسی ہی ضرورت تھی تو خود آکر اٹھا لیتے، توبہ توبہ، اتنی بڑی ذات کا واسطہ دیا، پھر شفقت فرما کر پاس بٹھایا اور سب بات سنی اور فرمایا کہ خوب کرلو جب کر چکے تو مصافحہ کرکے ان کو رخصت کر دیا۔"

مولانا سعید احمد صاحب ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔

"ایک دفعہ لاہور میں کھانسی، نزلہ، زکام بخار سے میں بہت بیمار ہو گیا تھا، تمام رات نیند نہیں آتی تھی، دن بھی بے چینی سے گزرتا، ڈاکٹروں نے کہا کہ سخت ترین انفلوئنزا ہے اور بہت خطرناک ہے، میں نے اس مرض کی حضرت اقدس کو شکایت بھجوائی کہ دعا فرما دیں، رات کو عشاء کے بعد ایک آدمی میری چارپائی پر معلوم ہوا اور آواز آئی کہ میں سکینہ ہوں، ڈر کے مارے میں پہلو نہیں بدلتا تھا کہ کھانسی آوے گی اور تکلیف ہوگی مگر وہ آدمی میرے پہلو بدلتا تھا اور کہتا تھا کہ بے فکر رہو، تم تندرست ہو، جب رات کے تین بجے تو مجھ سے کہا گیا کہ اٹھو اور شکر کے نفل پڑھو جب میں اٹھا تو ایسا تندرست تھا کہ گویا بیمار ہوا ہی نہیں تھا، یہ حضرت کی دعا یا توجہ تھی،

"ایک دفعہ مجھے خارش کا مرض شدید ہو گیا، ڈاکٹروں اور حکیموں سے بڑے بڑے علاج کروائے مگر افاقہ نہیں ہوا، حضرت نے مجھے علاج کرانے کیلئے

رائے پور بلوالیا، وہاں بہت علاج ہوا اور حکیم صاحب نے بڑی کڑوی دوائیں پلائیں مگر کچھ بھی افاقہ نہ ہوا، رات کو نیند نہیں آتی تھی اور کھجلا رہا تھا حضرت پیشاب کرنے کو جارہے تھے، مولوی عبدالمنان صاحب سے دریافت فرمایا کہ یہ کون جاگ رہا ہے؟ بتایا گیا کہ سعید احمد کھجلا رہا ہے، اس کو نیند نہیں آتی، تمام رات جاگتا ہی رہتا ہے۔ حضرت اقدسؒ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کے اسی طرح درجات بلند فرماتے ہیں، ہمارے مولوی صاحب کے درجات بلند ہو رہے ہیں، مولوی عبدالمنان صاحب سے میں نے پوچھا کہ حضرت کیسے فرمارہے تھے انھوں نے جب مجھے بتایا تو حضرت کے کلمات میں مجھے بجلی کی کرنٹ کی طرح اثر معلوم ہوا۔"(۱)

نسبت کی قوت، برقی تاثیر اور انقلاب حال کے واقعات متعدد اہل تعلق نے سنائے ہیں ان سب کا نقل کرنا مشکل ہے، یہاں پر صرف ایک دو واقعے نقل کئے جاتے ہیں جن کے راوی حضرتؒ کے خادم خاص مولانا عبدالمنان صاحب ہیں۔

مولانا موصوف بیان فرماتے ہیں:۔

"غالباً ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے شبیر صاحب نومسلم بھاولپوری مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں پڑھتے تھے، میرے ہم سبق تھے، ہندو خاندان کے تھے اب جہاں دار الطلبہ جدید ہے وہاں پہلے خام کمرے تھے وہیں ہم لوگ رہتے تھے، وہاں سے حاجی شاہ کمال کے قبرستان کو جو سڑک جاتی ہے اس پر ایک مندر بھی ہے، اسی طرف سیر کرتے ہوئے مولوی صاحب ایک مرتبہ نکلے، وہاں ایک ہندو فقیر کی ان پر نظر پڑ گئی جس سے ان کے دل میں اسلام کے خلاف انحراف کے جذبات پیدا

(۱) مکتوب مولانا سعید احمد ڈونگوی

ہونے لگے، یہ بات آ کر انھوں نے مجھ سے کہی، میں نے ان کو حضرت شیخ[1] کے پاس جانے کا مشورہ دیا بلکہ ان کو ساتھ لے کر گیا، حضرت شیخ اس وقت اوپر اپنے کمرے میں تھے، فرمایا کیسے آئے ہو؟ حالات عرض کئے، حضرت شیخ نے حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت اقدس میں لیجانے اور حالات عرض کرنے کی ہدایت فرمائی احقر ان کو لے کر رائے پور حاضر ہوا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے حالات عرض کئے، فرمایا کہ اب آرام کرو، صبح جب حضرت اقدس سیر کو تشریف لے گئے تو احقر اس وقت سو رہا تھا، سیر سے واپسی پر خانقاہ کے باہر لوہے کے پھاٹک سے کچھ اوپر کھڑے ہو کر احقر کو یاد فرمایا کہ مولوی عبدالمنان کہاں ہیں؟ کسی نے عرض کیا کہ حضرت سو رہے ہیں، بلائے گئے، فرمایا کہ تم بھی عجیب آدمی ہو جس کام کے واسطے آئے تھے، وہ تمہیں یاد نہیں، میں نے عرض کیا کہ حضرت اب کرتے ہیں ــــ مولوی شبیر صاحب سیر میں ساتھ ہی تھے، حضرت نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ احقر کچھ بھی نہیں، بعضے اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ یوں اشارہ کریں (ان کے دل کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) تو اس کا قلب جاری ہو جاتا ہے ــــ بس اتنا فرمایا کہ تم ایسی جگہوں میں نہ جایا کرو ان ہندو فقیروں کے پاس۔

مولوی صاحب کا بیان ہے کہ اس اشارے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قلب میں ایمان پھر عود کر آیا ہے اور بحمد اللہ سارے شبہات و خدشات وساوس زائل ہو گئے اور اس کے بعد اس کیفیت نے پھر کبھی عود نہیں کیا ــــ مولانا موصوف بھاول پور میں بیکانیر گیٹ میں مقیم ہیں۔

---

(۱) یعنی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہٗ

مولانا عبدالمنان صاحب خود اپنا حال بیان کرتے ہیں:۔

"مجھ پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوگئی تھی کہ ہندو ہونے کو جی چاہتا تھا، سبق پڑھتے پڑھتے بیچ میں اٹھ کر چلا جاتا تھا، میں نے یہ کیفیت اپنے مشفق استاد حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحب (ناظم مدرسہ مظاہر علوم) سے عرض کی، حضرت مولانا نے حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کی خدمت میں بھیجا، شیخ نے فرمایا کہ تم حضرت کی خدمت میں جاؤ، حضرت تم پر بہت مہربان ہیں، میں نے عرض کیا کہ میں تو نہیں جاتا، مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے، آپ خط لکھ دیں، حضرت نے ازراہ کرم والا نامہ تحریر فرما دیا، احقر اس کو لے کر رائے پور کے ارادے سے چلا، معلوم ہوا کہ حضرت کا قیام بہٹ میں ہے، یہ میری بہٹ کی پہلی حاضری تھی، حضرت کا قیام شاہ زاہد حسن صاحب مرحوم کے مکان پر تھا، گرمی کا موسم تھا، گیارہ بجے کے قریب دن میں پہنچا، حضرت آرام فرمارہے تھے، ظہر سے کچھ پہلے دروازہ کھلا تو حاضر ہوا، فرمایا مولوی صاحب کیسے آئے، میں خاموش رہا، فرمایا کچھ بولو تو سہی! میں نے وہ پرچہ سامنے کر دیا، فرمایا اس میں کیا لکھا ہے، میں نے کہا آپ پڑھ لیجئے، آپ ہی کے نام پرچہ ہے، فرمایا کچھ تو بتاؤ، عرض کیا حضرت کسی کی چیز بھی پکڑ دینے کو جی نہیں چاہتا، اس پر بہت ہنسے، پرچہ لے کر رکھ لیا، ظہر عصر کی نماز حضرت کے ساتھ پڑھی، عصر میں اتفاق سے حضرتؒ کے بائیں جانب تھا، حضرت نے دعا کے بعد میری طرف دیکھا، یہ مجرد اس کے مجھ پر رقت طاری ہوگئی، حضرت یہ دیکھ کر تشریف لے گئے، میں وہیں بیٹھا روتا رہا، تھوڑی دیر کے بعد جب سکون ہوا تو حاضر خدمت ہوا تو فرمایا صوفی صاحب کیا حال ہے؟ عرض کیا

حضرت اب بالکل ٹھیک ہے کوئی بات نہیں ——— اس کے بعد یہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔

ایک مرتبہ حضرت سہارنپور میں حاجی یعقوب علی خاں صاحب کے ہاں مقیم تھے عصر کے وقت حاضر ہوا، حضرت نے فرمایا مولوی صاحب کیا حال ہے؟ میں نے کہا حضرت رونا نہیں آتا، حضرت نے وضو کرتے ہوئے مجھ پر نظر ڈالی پتہ نہیں اس نظر میں کیا چیز تھی فوراً بے اختیار گریہ طاری ہوگیا، پاس بیٹھنے والوں نے کہا یہ تو کہتا تھا مجھے رونا نہیں آتا یہ اس قدر رو کیوں رہا ہے؟

ان خاص اور اہم واقعات کے علاوہ بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ جو لوگ قلب میں سختی اور قساوت محسوس کرتے حضرت کی مجلس میں بیٹھ کر ان پر رقت کا ایک دم سے غلبہ ہوا، طبیعت دعا اور انابت کی طرف متوجہ ہوگئی، آنکھیں بے اختیار اشکبار ہوگئیں، کبھی قبض تھا بسط ہوگیا اور کبھی بسط اور جوش تھا سکون پیدا ہوگیا، اہل تعلق اور حاضر باش افراد کو ایسے تجربے بکثرت اور عام طور پر ہوتے رہتے تھے۔

اہل دل کے ہاں اشراف علی الخواطر (خیالات اور قلبی کیفیات کا کشف) بکثرت ہوتا ہے اور کم و بیش اکثر خدام کو اس کا تجربہ ہے، حضرت کے ایک خادم لکھتے ہیں، میں نے بیسیوں مرتبہ تجربہ کیا کہ ادھر میرے دل میں کوئی خاص خیال ہوا اور اُدھر حضرت کو اس کا انکشاف ہوگیا انھوں نے اس سلسلہ میں متعدد واقعات بھی لکھے ہیں۔

خود راقم کو اس کا کئی بار تجربہ ہوا، جب کسی کیفیت یا احساس کا غلبہ ہوا، حضرتؒ نے بڑی شفقت و دلداری کے ساتھ اس کا ازالہ فرمایا، ایک مرتبہ بہٹ ہاؤس کے زمانۂ قیام میں (غالباً عید کے دن) عشار کی نماز میں نے شدید توحش اور انقباض کی حالت میں پڑھی،

اس خیال کا غلبہ تھا کہ حضرت کی اس رمضان کے اخیر عشرہ میں وہ شفقت اور توجہ نہیں رہی جو رہا کرتی تھی اپنے نفس کی حقارت اور زندگی کی لاحاصلی کا استیلاء تھا، سلام پھیرتے ہی میرا نام لے کر طلب فرمایا گیا، حاضر ہوا تو قریب بلایا اور فرمایا حضرت اس آیت کی کیا تفسیر ہے حَتّٰی اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا، مجھے اپنی کیفیت سے بالکل ذہول ہو گیا اور میں سمجھا کہ محض ایک علمی استفسار ہے چنانچہ اس سلسلہ میں مفسرین کے جو اقوال مستحضر تھے عرض کرنے شروع کئے لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت جواب کی طرف متوجہ نہیں اور اس سلسلہ میں کوئی علمی بات مطلوب نہیں ہے، وہاں سے نکل کر باہر آیا تو کیفیت متبدل ہو چکی تھی، قلب سکون اور بشاشت محسوس کرتا تھا، اس وقت احساس ہوا کہ یہ طلبی اور یہ استفسار محض اس کیفیت کے ازالہ کیلئے تھی جس کا غلبہ تھا، اور محض تعلق و شفقت کا اظہار تھا، اور اس آیت کے معنی کے ذریعہ یاس اور قلق کی اس کیفیت کا علاج بھی۔

اس طرح کے واقعات جو حضرت کی قوت روحانی و اشراقی پر دلالت کرتے ہیں اور اس طرح کے خواب و اشارات جو آپ کی مقبولیت عند اللہ کی دلیل ہیں اور جن میں طالبین صادق کی آپ کی طرف رہبری کی گئی بکثرت بیان کئے گئے، ان کا تذکرہ موجب تطویل ہے اور اس کتاب میں آپ کے اخلاص، تعلق مع اللہ، زہد و توکل، استقامت علی الشریعت، عشق و محبت الٰہی، علوم صحیحہ اور تحقیقات عالیہ اور آپ کی تاثیر صحبت اور اصلاح و ارشاد کے ایسے بلند نمونے اور واقعات سامنے آچکے ہیں جو ان کشوف و کرامات اور واقعات غریبہ سے اعلیٰ و ارفع ہیں۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

خاتمۂ کلام

قلم بشکن، سیاہی ریز، کاغذ سوز، دم درکش
حسنؔ ایں قصۂ عشقست در دفتر نمی گنجد،